مقالاتِ سلیمان

(حصہ سوم)

شاہ معین الدین احمد ندوی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

انہ من سلیمان و انہ بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلسلۂ دار المصنفین

(۱۰۶)

مقالاتِ سلیمان

جلد سوم

یعنی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہبی مضامین کا مجموعہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

در مطبع معارف اعظم گڈھ طبع گردید

۱۳۹۱ھ

۱۹۷۱ء

فہرست

مقالات سلیمان مذہبی

جلد سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

اس سے پہلے مقالات سلیمان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، پہلا مجموعہ تاریخ ہند سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے اور دوسرا غیر مذہبی علمی و تحقیقی مضامین پر۔ زیر نظر تیسرا حصہ اس حیثیت سے مذہبی ہے کہ اس کے مضامین مذہب سے متعلق ہیں لیکن ان سب کی شان علمی و تحقیقی ہے، اس میں خالص مذہبی مضامین بھی ہیں، کلام مجید کے بعض احکام کے حکم و مصالح کی وضاحت و تشریح بھی ہے، غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب بھی ہے، اور موجودہ دور کے خود ساختہ مجتہدین کے اجتہادات کی تصحیح بھی ہے، اور بعض جدید نظریات اور ان کے متعلق کلام مجید کے بیانات میں تطبیق بھی ہے، اس حیثیت سے یہ حصہ رنگا رنگ مذہبی مضامین کا گلدستہ ہے، اس کے بیشتر مضامین کسی نہ کسی پہلو سے کلام مجید سے متعلق ہیں، اس لیے ان کو مقالاتِ قرآنی بھی کہہ سکتے ہیں، دو مضمون "القرآن والفلسفۃ الجدیدۃ" اور "مسئلۂ ارتقا، اور قرآن مجید" مصنف کے ابتدائی دور کے ہیں، جو بعد کے ذوق سے مختلف ہیں، ان کو اسلیے شامل کر لیا گیا کہ اس سے مصنف کے ابتدائی ذوق اور بعد کی تبدیلی کا اندازہ ہو سکے۔

فقیر معین الدین احمد ندوی

۱۷ صفر ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۴ اپریل ۱۹۷۱ء۔ دار المصنفین اعظم گڈھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

علوم القرآن

مسلمانوں کے حریف اگر ان کے تمام ابواب فضائل و مناقب کی صحت روایت سے انکار کر دیں، تو ایک باب یقیناً ایسا رہ جائے گا، جس کے انکار کی وہ کبھی جرأت نہ کر سکیں گے، ہمارا اشارہ اس سے مسلمانوں کی اس شدید جد و جہد اور سعی و محنت کی طرف ہے جو انھوں نے اپنی کتاب الٰہی کی تشریح و توضیح، تحقیق و تدقیق اور فہم و تفہیم میں صرف کی، دنیا میں متعدد قومیں ہیں، جن کے پاس حسب ادعا و زعم کتب الٰہی محفوظ ہیں، لیکن مسلمانوں نے اپنی کتاب الٰہی کے لیے جو خدمتیں انجام دیں اور اس سے متعلق جو ذخیرۂ علوم و تصنیفات فراہم کر دیا، کیا اس کا ایک حصہ بھی دوسری قومیں پیش کر سکتی ہیں، بلا شبہ بحیثیت ترجمہ مسیحی قوم کا کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی، لیکن ان تراجم سے کیا فائدہ جنھوں نے خود اصل کو گم کر دیا ہو؟

مسلمانوں نے قرآن مجید کے ساتھ جو اعتنا کیا، اور اس کے متعلق جو خدمتیں انجام دیں، ان کی ہم حسب ذیل جلی تقسیم کر سکتے ہیں،

(۱) تشریح مسائل عامہ متعلقہ قرآن، مثلاً کیفیت نزول، کتابت قرآن،

قرأت وتجوید قرآن ۔

(۲) تدوین علوم متعلقہ قرآن، مثلاً علم الامثال، علم الاعراب، علم المجاز ۔

(۳) تفسیر معانی والفاظ قرآن، مثلاً کتب تفاسیر عامہ،

ان تینوں میں سے ہر ایک اس لائق ہے کہ اگر اس کی تفصیل کی جائے تو خود اس کے متعدد شعبے نکل سکتے ہیں لیکن بخوف تطویل ہم صرف ضروری اور ما یحتاج امور پر اکتفا کریں گے ۔

مسائل متعلقہ قرآن ان سے وہ مسائل مراد ہیں جو اختصار مباحث کی بنا پر مستقل فن نہیں بن سکتے، اور اس لیے ان کے متعلق مستقل کتابیں نہیں لکھی گئیں، اس عنوان کے تحت میں حسب ذیل مسائل علما نے بیان کیے ہیں: —

(۱) معرفت کیفیت نزول القرآن و بدء و انتہائے نزول (قرآن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح نازل ہوتا تھا۔ اور سب سے اول اور سب سے آخر کون سی آیت یا سورت نازل ہوئی؟)

(۲) معرفت آیات و سور مکیہ و مدنیہ (مکہ میں کون کون آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں، اور مدینہ میں کون؟)

(۳) معرفت اوقات و ازمنۂ نزول (یہ آیتیں اور سورتیں کس وقت نازل ہوئیں؟)

(۴) معرفت مقامات و اماکن نزول (کہاں اور کس مقام پر نازل ہوئیں؟)

(۵) معرفت جمع و ترتیب قرآن (قرآن کس طرح جمع و مرتب ہوا؟)

(۶) معرفت تعداد سور و آیات و کلمات قرآن (قرآن میں کتنی سورتیں، کتنی آیتیں، اور کتنے حروف ہیں؟)

(۷) معرفت مجمل و مبین و مقید و مطلق و عام و خاص و منطوق و مفہوم و محکم و متشابہ قرآن۔

(۸) معرفت اقسام دلائل قرآن

(۹) معرفت طرق مخاطبات قرآن

(۱۰) معرفت حصر و تخصیص و ایجاز و اطناب قرآن وقس علی ذلک

علوم متعلقۂ قرآن: علمائے اسلام نے قرآن مجید کے متعلق جو خدمات انجام دی ہیں، اس کی عملی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کے ہر پہلو کے متعلق اتنے علوم مدون اور اس قدر کتابیں تصنیف کی ہیں، کہ ان کا حصر بھی مشکل ہے، کشف الظنون اور فہرست ابن ندیم میں سیکڑوں علوم و تصنیفات متعلقہ، قرآن کا ذکر ہے، جو آج بالکل ناپید ہیں، تاہم تلاش و جستجو سے جن علوم و تصنیفات کا پتہ ملتا ہے، وہ حسب ذیل ہیں،

(۱) رسوم القرآن (۲) تجوید القرآن (۳) اعراب القرآن (مصادر القرآن (۵) افراد القرآن وجمعہ، (۶) مفردات القرآن (۷) غرائب القرآن (۸) معانی القرآن (۹) اعجاز القرآن (۱۰) مجاز القرآن (۱۱) تشبیہ القرآن (۱۲) امثال القرآن (۱۳) امثلۃ القران (۱۴) بدائع القرآن (۱۵) اسباب النزول (۱۶) مبہمات القرآن (۱۷) متشابہ القرآن (۱۸) اقسام القرآن (۱۹) مناسبۃ الآیات والسور، (۲۰) مطالع قرآن، (مقاطعہ و فواتح السور) (۲۱) اعلام القرآن (۲۲) ناسخ القرآن ومنسوخہ (۲۳) مشکلات القرآن (۲۴) حجج القرآن (۲۵) احکام القرآن (۲۶) جواہر القرآن (۲۷) نجوم القرآن،

ان تمام علوم کے متعلق دو قسم کی تصنیفات ہیں، ایک وہ جن میں ان تمام علوم و مسائل سے ایک ہی کتاب کے مختلف ابواب میں بحث کی گئی ہے اور باختصار

وہ ان تمام مباحث پر مشتمل ہیں، اس صنفِ تصنیفات کو ہم "جوامع القرآن" کہہ سکتے ہیں۔ دوسری قسم اُن تصنیفات کی ہے، جن میں ایک ایک علم اور ایک ایک بحث سے مستقلاً بحث ہے، اور وہ صرف ایک ہی علم یا بحث کے مختلف انواع مسائل، نکات اور فوائد کو جامع ہیں۔

جوامع علوم القرآن | دنیا میں ہر شے اپنی بسیط اور سادہ حالت سے شروع ہوتی ہے، اور پھر رفتہ رفتہ ایک شاندار ترکیبی حالت تک پہنچ جاتی ہے، علوم قرآن کے متعلق بھی ابتدائی کوششیں انفرادی علوم و مسائل سے شروع ہوئیں اور ایک مدت کے بعد وہ تکمیل کو پہونچیں، یہی سبب ہے کہ علوم قرآن کے متعلق منفرد تصانیف دوسری صدی میں موجود ہو گئی تھیں، لیکن تصنیفات کا سراغ ہم کو سب سے پہلے پانچویں صدی میں ملتا ہے، ہم جوامع علوم قرآن کا پہلا مصنف علی بن ابراہیم الحوفی المتوفی ۴۳۰ھ کو جانتے ہیں، جن کی تصنیف کا نام علوم القرآن ہے، اس کے بعد شیخ مکی بن ابی طالب المتوفی ۴۳۷ھ کی "البدایہ الی بلوغ النہایہ" کا نام لینا چاہیے، مصنف نے یہ کتاب ۷۰ جزء میں معانی و انواع علوم قرآن پر لکھی ہے، تیسری تصنیف موسس فن بلاغت امام عبدالقاہر جرجانی المتوفی ۴۷۵ھ کے تلمیذ رشید ابو عامر فضل بن اسماعیل جرجانی کی البیان فی علوم القرآن ہے، اس کے بعد ابو موسیٰ محمد بن ابی بکر اصفہانی المتوفی ۵۸۱ھ کی مجموع المغیث فی علم القرآن و الحدیث، یہ پہلا شخص ہے جس نے علوم قرآن و حدیث پر یکجا کتاب لکھی، علامہ ابن جوزی المتوفی ۵۹۷ھ کی "فنون الافنان فی علوم القرآن" بھی اس فن کی ایک مبسوط تصنیف ہے، بدیع الدین۔۔

بکر بن عبدالوہاب القزوینی الموجود ۶۲۵ھ کی الجامع لحر یزالحاوی اپنے عنوان کے لحاظ سے ایک قابل قدر کتاب معلوم ہوتی ہے، اسی موضوع پر جمال القرار وکمال الاقرار علم الدین ابوالحسن علی بن محمد سخاوی المتوفی ۶۴۳ھ کی بھی تصنیف ہے، جو قرأت وقف وابتدار ناسخ ومنسوخ وغیرہ مباحث قرآن پر مشتمل ہے۔ محمد بن عبدالرحمٰن بن شامہ المتوفی ۶۶۵ھ کی المرشد الوجیز فی علوم متعلق بالقرآن العزیز بھی اس فن میں ایک کتاب ہے، لیکن ان تمام تصنیفات سے بہتر بدرالدین محمد بن بہادر زرکشی المتوفی ۷۹۴ھ کی "البرہان فی علوم القرآن" ہے جس میں ۴۷ مختلف حیثیات سے قرآن مجید کے متعلق مباحث ہیں، اس کے بعد قاضی جلال الدین بلبقی المتوفی ۸۲۴ھ کی مواقع العلوم من مواقع النجوم ہے، اس کتاب میں چھ فصول کے تحت میں قرآن مجید کے مختلف پچاس مباحث وفنون ہیں، ۸۵۶ھ میں محی الدین محمد بن سلیمان کافنجی نے "التیسیر فی علوم التفسیر" کے نام سے ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا، سب سے آخر میں لیکن اس باب میں سب سے جامع اور بہتر جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی "الاتقان فی علوم القرآن" ہے جس میں ۸۰ ابواب کے تحت میں علوم قرآن کے متعلق ۳۰۰ سے زائد مباحث ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر حسب عادت سیوطی نے موضوع وضعیف احادیث وروایات کو اس میں جگہ نہ دی ہوتی، تو کتب خانۂ اسلام کی یہ ایک بے نظیر کتاب ہوتی،

یہ تصانیف جیسا ہم نے پہلے لکھا ہے، جوامع علوم قرآن پر مشتمل ہیں، آئندہ سطور میں ہم ایک ایک فن کا ذکر کرتے ہیں جس میں بہ ترتیب (۱) کتابت وقرأت

قرآن (۲) الفاظ قرآن (۳) معانی قرآن (۴) مقدمات مقاصد قرآن اور (۵) مقاصد قرآن پر گفتگو ہوگی ۔

رسوم القرآن | نزول قرآن کے بعد قرآن کے متعلق سب سے پہلا کام یہ تھا، کہ قلم سے اس کو لکھا جائے، اور زبان سے ادا کیا جائے۔ پہلی قسم کا نام "رسوم القرآن" ہے جس میں قرآن مجید کے اصول کتابت اور طریقۂ تحریر سے بحث ہوتی ہے، یہ ممکن تھا کہ جس طرح عربی زبان کی تمام کتابیں لکھی جاتی ہیں، اسی طرح قرآن بھی لکھا جاتا، اور عہد بہ عہد عربی خط میں جو تبدیلیاں ہوئیں، ان سے کتابت قرآن میں بھی کام لیا جاتا، لیکن مسلمانوں نے حفظ قرآن کے لیے ضروری سمجھا کہ جو لفظ عہدِ قدیم نبوی میں جس طرح لکھ دیا گیا ہے، اسی طرح باقی رکھا جائے، تاکہ مسلمان نہ صرف یہ دعویٰ کرسکیں کہ الفاظ قرآن محفوظ ہیں، بلکہ یہ بھی دعویٰ کرسکیں، کہ خط در سوم قرآن بھی محفوظ ہیں،

علماً مسلمانوں نے اس فن کو عہد نبوت سے اس وقت تک باقی رکھا ہے، اور خط نسخ میں تنوع کے باوجود قرآن مجید کو اسی رسم خط میں لکھا جس میں صحابہؓ نے اس کو عام مسلمانوں کے سپرد کیا تھا، تدوین فن کے لحاظ سے اس باب میں سب سے پہلی تصنیف معلومات موجودہ ...... کے مطابق ابو عمرو عثمان بن سعید الدانی المتوفی ۴۴۴ھ کی تصنیف "الاقتصاد فی رسم المصحف" اور "المقنع فی رسم المصحف" ہے، المقنع میں باختصار مصاحف بلاد اسلامیہ کے مختلف و متفق خطوط کا اور قرآن میں زیر و زبر اور نقطہ لگانے کی کیفیت کا بیان ہے، علمائے اسلام نے اس تصنیف کی بڑی قدر کی، ابو محمد قاسم بن فیرہ شاطبی المتوفی ۵۹۰ھ نے بنظر تسہیل حفظ اس کو

ایک قصیدۂ رائیہ میں نظم کر دیا، اس رسالہ کا نام "عقیلۃ اتراب القصائد" ہے، برہان الدین ابراہیم بن عمر جعبری المتوفی ۷۳۲ھ نے اس قصیدہ کی بنام "جمیلۃ ارباب المراصد" علم الدین علی بن محمد سخاوی المتوفی ۶۴۳ھ نے بنام "الوسیلہ الی کشف العقیلہ" شہاب الدین احمد بن محمد بن جبارہ المرادی المقدسی المتوفی ۷۲۸ھ محمد بن قفال شاطبی تلمیذ سخاوی اور احمد بن محمد بن شیرازی کازرونی نے ۹۵۰ھ میں اور ابوالبقا علی بن القاصح المقری المتوفی ۸۰۱ھ نے بنام "تلخیص الفوائد" اور نورالدین علی بن سلطان ہروی المتوفی ۱۰۱۴ھ نے بنام "الہبات السنیۃ العلیہ علی ابیات الشاطبیہ الرائیہ فی الرسم" اس کی مبسوط و مختصر شرحیں لکھیں،

متاخرین میں خطیب الروم ۹۵۹ھ کی "رسوخ اللسان فی حروف القرآن" اور ابوالعباس مراکشی کی عنوان الدلیل فی مرسوم خط التنزیل کارآمد رسائل ہیں، ہندوستان میں مولانا بحر العلوم المتوفی ۱۲۲۵ھ ہجری کا مختصر فارسی رسالہ "رسم مصحف" اکثر قرآن کے حاشیوں پر چھپا ہے،

تجوید القرآن یعنی قرآن مجید کا صحیح مخارج حروف و تلفظ سے حسن ترتیل کے ساتھ ادا کرنا، تجوید کو قرآن کے ساتھ وہی نسبت ہے جو نشید و غنا کو زبور کے ساتھ، تاہم یہود و مسیحی اس کو کوئی فن نہ بنا سکے، اور مسلمانوں نے اس کو بھی ایک فن بنا دیا ہے، سینکڑوں ماہر اور امام اس فن کے ازمنۂ مختلفہ میں ممالک اسلام میں پیدا ہوئے اور اب تک موجود ہیں، ممالک غربیہ میں عموماً اور ہندوستان میں کہیں کہیں باقاعدہ اس کی درسگاہیں ہیں، جہاں مدونہ قواعد اور اصول تجوید کے مطابق اساتذہ فن اب تک خلفاً عن سلف تعلیم دیتے چلے آئے ہیں۔

تدوین فن کی حیثیت سے اس فن کے سب سے پہلے مصنف موسیٰ بن عبیداللہ خاقانی بغدادی المتوفی ۳۲۵ھ ہیں، اس کے بعد مکی بن ابی طالب قیسی المتوفی ۴۳۷ھ کی کتاب رعایۃ لتجوید القرأۃ تصنیف ہوئی۔ اس فن کی مقبول ترین تصنیف محمد بن محمد جزری المتوفی ۸۳۳ھ کی مقدمہ جزریہ منظومہ ہے،

بڑے بڑے علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں، مثلاً زین الدین ازہری المتوفی ۸۹۰ھ، خالد بن عبداللہ ازہری المتوفی ۹۰۵ھ، ابوالعباس احمد بن محمد قسطلانی المتوفی ۹۲۳ھ، شیخ الاسلام زکریا انصاری المتوفی ۹۲۶ھ شمس الدین دلجی شارح شفا المتوفی ۹۴۷ھ، مولی عصام الدین طاشکبری زادہ المتوفی ۹۶۸ھ، رضی الدین ابن الحنبلی الحلبی المتوفی ۹۷۱ھ، برہان الدین جعبری ۷۳۲ھ کی عقود الجمان فی تجوید القرآن بھی اسی فن کی تصنیف ہے،[۱]

قرأت القرآن | الفاظ قرآن باوجود بقائے معنی مختلف وجوہ حرکات وادقاف وادغام وامالہ وفصل ووصل کے ساتھ پڑھے جاسکتے ہیں، اور یہ تمام طرق متواتر صحابہ سے مروی ہیں، ان وجوہ وحرکات وطرق مختلفہ سے یا ان میں سے کسی ایک سے بحیثیت روایت وسماعت بحث کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلّم) سے کس طرح سنایا گیا ہے، اور صحابہ نے کس طرح پڑھا ہے، علم قرأت القرآن ہے، صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں اس فن کے سات مشہور امام گذرے ہیں، تابعین میں عبداللہ بن عامر یحصبی قاری شام المتوفی ۱۱۸ھ، عبداللہ بن کثیر قاری مکہ المتوفی ۱۲۰ھ، عاصم بن بہدلہ قاری کوفہ المتوفی ۱۲۷ھ اور تبع تابعین

---

[۱] الہلال کلکتہ ۱۱ فروری ۱۹۱۴ء

میں حمزہ بن حبیب التیمی قاری کوفہ المتوفی ۱۵۶ھ، نافع بن عبدالرحمٰن لیثی قاری مدینہ المتوفی ۱۶۹ھ، علی بن حمزہ کسائی قاری کوفہ المتوفی ۱۸۹ھ اور ابو عمرو بن العلاء المازنی قاری بصرہ المتوفی ۱۵۴ھ: ان سب میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول قرأت نافع ہے، جس کی تمام بلاد اسلامیہ میں تقلید کی جاتی ہے۔

نافع نے ستر قراء تابعین سے قرأت حاصل کی تھی،

اس فن کے مصنف اول حسب تحقیق علامہ جزری، ابو عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ ہیں، ''شاطبیہ'' سے (جو اس فن کی مقبول ترین تصنیف ہے) پہلے ابو علی حسن بن احمد فارسی نحوی المتوفی ۳۷۷ھ کی ''الحجۃ فی القراآت'' عبیداللہ بن محمد اسدی المتوفی ۳۸۷ھ کی ''المفصح فی القراآت'' ابو عمر عثمان بن سعید الدانی المتوفی ۴۴۴ھ کی ''کتاب التیسیر'' ''جامع البیان فی القرأت السبع'' اور ''المحتوی فی القرأت الشواذ'' اور ابو طاہر اسماعیل بن خلف المتوفی ۴۵۵ھ کی ''عنوان فی القراءۃ'' اور ''الاکتفاء فی القراءۃ'' قابل ذکر تصنیفات ہیں، اواسط قرن سادس میں امام القراءۃ قاسم بن فیرہ شاطبی اندلسی المتوفی ۵۹۰ھ نے قصیدۂ لامیہ شاطبیہ تصنیف کیا جس کی شعاع شہرت کے سامنے اس سے پہلے کی تمام تصنیفات چھپ گئیں ''شاطبیہ'' کے بعد قراء کبار نے مستقل تصانیف کے بجائے اس کی شرح کافی سمجھی، جن میں مشہور اشخاص علم الدین علی بن محمد سخاوی المتوفی ۶۴۳ھ، برہان الدین ابو اسحاق ابراہیم بن عمر جعبری المتوفی ۶۴۳ھ، ابو الخیر محمد بن محمد جزری المتوفی ۸۳۳ھ اور ابن القاصح صاحب سراج القاری ہیں، علامہ جزری شارح شاطبیہ ہونے کے علاوہ ''النشر فی القرأت العشر'' اور ''تحبیر التیسیر فی القرأت العشر'' کے مصنف بھی ہیں، علی نوری سفاقسی کی تصنیف ''غیث النفع فی القرأت السبع'' بھی اس فن میں ایک متداول

کتاب ہے،

علل القراات | جس طرح علم القراۃ میں روایۃً وسماعاً الفاظ قرآن کے مختلف اوصاف واحوال سماعیہ کا بیان ہوتا ہے، علل القراات میں انہی چیزوں سے اصولاً اور عقلاً بحث ہوتی ہے، کہ از روئے اصول صرف ونحو وقواعد ومحاورات زبان عربی ان کو کیونکر ہونا چاہیے، ان مباحث پر گفتگو کا سب سے زیادہ حق اہلِ ادب اور علمائے نحو کو ہے، اسی لیے اس فن کا واضع ومدون یہی طبقہ ہے، مثلاً ابو العباس احمد بن محمد نحوی سلیمان بن عبد اللہ نحوی المتوفی ۴۹۳ھ، ابو الحسن علی بن حسین الباقولی الموجود ۵۳۵ھ،

معرفۃ الوقف والابتدار | انسان کسی حالت میں سانس کی آمد ورفت کو روک نہیں سکتا، اس لیے ضرور ہے کہ کسی طویل عبارت کو پڑھنے وقت سانس کئی کئی بار ٹوٹ جائے، ان سکنات تنفس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بے موقع نہ ہوں، ورنہ عبارت کا سلسلۂ اتصال ٹوٹ جائے گا، اور اکثر عبارتوں کا سمجھنا مشکل ہو جائے گا، علمائے اسلام نے اسی غرض کے لیے علم الوقف والابتدار وضع کیا، اور قرآن میں جا بجا علاماتِ وقف کے نشان لگائے، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ تلاوت قرآن میں کہاں وقف کرنا چاہیے یعنی ٹھہرنا چاہیے اور کہاں سانس توڑ کر دوسری آیت سے تلاوت کی ابتدا کرنی چاہیے، یہ فن گو علم التجوید اور علم القراۃ کا ایک جزو ہے، لیکن اس کی اہمیت کے لیے قرار نے اس کو مستقل فن قرار دیا اور اس میں منفرد ومخصوص تصنیفات کیں،

ابو بکر محمد عیسیٰ مغربی نے ان تمام اوقاف کو ایک رسالہ میں بنام "وقوف النبی صلعم فی القرآن" جمع کر دیا ہے، مکی بن ابی طالب المتوفی ۴۰۹ھ نے صرف اس موضوع پر ایک رسالہ "الوقف علی کلا وبلیٰ فی القرآن" لکھا کہ قرآن میں لفظ "کلا" اور "بلیٰ" پر

وقف کرنا چاہیے، یا نہیں، ان کے علاوہ "کتاب الوقف والابتدار" کے نام سے مشہور ائمۂ نحو وادب مثلاً قدمارمیں یحییٰ بن زیاد الفرار المتوفی ۲۰۷ھ، ابوالعباس احمد بن یحییٰ ثعلب نحوی المتوفی ۲۹۱ھ، مکی بن ابی طالب المتوفی ۳۰۹ھ، ابواسحاق ابراہیم الزجاج نحوی المتوفی ۳۱۰ھ، ابوبکر بن محمد بن قاسم ابن الانباری نحوی ۳۲۷ھ ابوجعفر النحاس بغدادی نحوی المتوفی ۳۲۸ھ اور متاخرین میں محسن عثمانی اور سجاوندی نے مستقل کتابیں تالیف کیں،

الفاظ قرآن مفردات القرآن | اسلام جب تک جزیرۂ عرب میں محدود تھا، قرآن کے حل لغات وتفسیر الفاظ کی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن غیر عربوں میں اشاعت قرآن کے لیے ضروری تھا، کہ الفاظ ولغات قرآن کی تشریح کی جائے اور اُن کی ڈکشنری ترتیب دی جائے، بعض علمائے ادب نے تمام الفاظ کا احاطہ کیا، اور ان کا نام مفردات القرآن رکھا، مثلاً مفردات القرآن امام راغب اصفہانی الموجود ۵۰۰ھ، مفردات القرآن محی الدین محمد بن علی وزان حنفی، لیکن اکثر علمائے ادب نے بجائے احاطۂ الفاظ صرف مشکل لغات پر اکتفا کی، اور اس کو غریب القرآن کے نام سے موسوم کیا۔

غریب القرآن | فن غریب القرآن پر نہایت کثرت سے علمائے نحو وادب نے تصنیفات کیں، اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب غریب القرآن ابوعبیدہ معمر بن مثنی نحوی المتوفی ۲۰۹ھ کی ہے۔ اس کے بعد حسب ذیل کتابیں لکھی گئیں، غریب القرآن احمد بن محمد بن یزداد طبری نحوی الموجود ۳۰۴ھ، غریب القرآن ابن درید لغوی المتوفی ۳۲۱ھ، غریب القرآن عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ المتوفی ۳۲۲ھ غریب القرآن ابوبکر محمد بن قاسم بن الانباری المتوفی ۳۲۷ھ، غریب القرآن ابوعمر محمد عمر الزاہد تلمیذ ثعلب

المتوفی ۳۴۳ھ، الاشارہ فی غریب القرآن ابوبکر محمد بن حسن نقاش نحوی بغدادی المتوفی ۳۵۰ھ، غریب القرآن قاضی احمد بن کامل المتوفی ۳۵۰ھ، غریب القرآن ابوبکر محمد بن عزیزی سجستانی تلمیذ ابن درید، غریب القرآن والحدیث ابوعبید احمد بن محمد ہروی المتوفی ۴۰۱ھ، مشکل غریب القرآن مکی بن ابی طالب قیسی المتوفی ۴۳۷ھ، کتاب اللغت المستدرک علی الہروی ابی موسیٰ محمد بن ابی بکر اصفہانی المتوفی ۵۸۱ھ، تحفۃ الاریب فیما فی القرآن من الغریب، ابوحیان محمد بن یوسف اندلسی المتوفی ۷۴۵ھ،

غریب القرآن کی تدوین میں سب سے زیادہ کاوش اور تلاش ابن درید اور عزیزی نے کی، ان دونوں استاد اور شاگرد نے تدوین و ترتیب غریب القرآن میں پورے پندرہ برس صرف کیے،

مصادر القرآن | بعض ائمۂ لغت نے قرآن کے اسماے جامدہ کو چھوڑ کر صرف مشتقات کی طرف توجہ، اور مصادر قرآن کی تحقیق و تشریح کی، اس قسم کی پہلی تصنیف یحییٰ بن زیاد الفراء المتوفی ۲۰۷ھ کی مصادر القرآن ہے، اس کے بعد ابراہیم بن الیزیدی المتوفی ۲۲۵ھ نے مصادر القرآن لکھی، ابوجعفر احمد بن علی جعفر المتوفی ۵۴۴ھ نے تاج المصادر کے نام سے قرآن و حدیث دونوں کے مصادر یکجا جمع کر دیئے،

الواحد والتثنیہ والجمع فی القرآن | ہم نے جیسا پہلے بیان کیا ہے کہ جس طرح تمدن اجتماعی میں نئے نئے تکلفات اور مختلف ضرورتوں کے سامان ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور وہ پھیلتے جاتے ہیں، بعینہٖ یہی حال تمدن علمی کا بھی ہے، کہ ہر شے میں ذرہ ذرہ سی مناسبت سے نئے نئے شعبے پیدا ہوتے رہتے ہیں، ہر تثنیہ اور جمع کی اصلی صورت

واحد ہے، اور واحد و مفرد اسماء کی تشریح مفردات و غریب قرآن میں گو ہوتی رہتی ہے، لیکن چونکہ تثنیہ اور جمع بنانے کے مختلف قواعد و اصول ہیں، بعض جمعیں بلاقاعدہ ہوتی ہیں، بعض جمعوں کے مفرد نہیں ہوتے، ان وجوہ سے علماء نے اس موضوع پر بھی مستقل رسائل لکھے، جن میں سے سب سے پہلی تصنیف یحییٰ ابن زیاد الفراء المتوفی ۲۰۷ھ کی کتاب الجمع والتثنیہ فی القرآن اور دوسری اخفش اوسط سعید بن سعدہ نحوی المتوفی ۲۱۵ھ کی الواحد والجمع یا الافراد والجمع فی القران ہے،

معربات القرآن ہر زبان میں دوسری زبانوں کے اختلاط و تعلقات سیاسی و تجارتی کی بنا پر کچھ الفاظ آجاتے اور تھوڑے سے تغیر کے بعد وہ اصل زبان کے الفاظ قرار پاجاتے ہیں، عربی زبان میں بھی اس قسم کے الفاظ ہیں، اور قرآن مجید نے ان کو استعمال کیا ہے، کلام پاک کے متعلق مباحث میں علمائے متقدمین میں سے تو متعدد علماء مثلاً ثعالبی، ابن فارس، ابن جزری، ابن جریر طبری (فی اول التفسیر) وغیرہ نے ان کا ایک باب علیحدہ قرار دے کر ان کی تحقیق کی ہے، لیکن متاخرین میں جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے "المذہب فیما وقع فی القرآن من المعرب" ایک مستقل رسالہ تالیف کیا ہے، تاج الدین سبکی المتوفی ۷۷۱ھ اور ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ نے ان الفاظِ معربہ کو نظم کر دیا ہے،

الوجوہ والنظائر فی القرآن قرآن مجید میں اکثر ایک لفظ متعدد مقامات میں مختلف معنی میں آیا ہے، اہل بلاغت ایسے لفظ کو "مشترک" کہتے ہیں، لیکن علوم قرآن میں ان کو "نظائر" کہتے ہیں، اور بعض الفاظ ایسے ہیں، جو متعدد مقامات پر بعینہ مستعمل ہوئے ہیں، اور ہر جگہ ان سے ایک ہی معنی مراد ہیں، علمائے قرآن ان کو وجوہ کہتے ہیں،

وجوہ ونظائر کی واقفیت فہم معانی قرآن کے لیے نہایت ضروری ہے، تاکہ معنی سمجھنے میں اشتباہ نہ ہو، اس بناپر علمائے اسلام نے مستقل تصنیفات میں وجوہ ونظائر کی توضیح وتحقیق ضروری سمجھی، اس فن کی بنا اس قدر قدیم ہے، کہ حضرت ابن عباسؓ سے ان کے دو شاگرد عکرمہ اور علی بن ابی طلحہ نے ان سے اس فن کی روایتیں کی ہیں، اور بلحاظ تصنیف سب سے پہلے مقاتل بن سلیمان مفسر المتوفی ۱۵۰ھ کی تالیف الوجوہ والنظائر کا نام منقول ہے،

ان کے علاوہ احمد بن فارس لغوی المتوفی ۳۷۵ھ، ابوالفرج بن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ، ابوالحسین محمد بن عبدالصمد مصری دامغانی، ابوالقاسم محمود نیساپوری الموجود ۵۵۳ھ کی الوجوہ والنظائر فی القرآن کے نام سے تصنیفات ہیں۔ جلال الدین سیوطی کا رسالہ "معرک القرآن فی مشترک القرآن" بھی اسی فن میں ہے،

اعراب القرآن: تمام سامی زبانوں میں سے صرف بابلی اور عربی دو زبانوں میں اجزائے کلام کے باہمی ارتباط وتعلق کے اظہار کے لیے اعراب (یعنی آخر حرف میں زیر زبر پیش) کا استعمال ہوتا ہے ان میں اعراب کے ذریعہ سے عربی زبان میں فاعل، مفعول، مضاف، مضاف الیہ، حال، تمیز، وغیرہ کا امتیاز ہوتا ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ فہم معنی کے لیے واقفیت اعراب کی کس قدر ضرورت ہے، علمائے اسلام نے یہ ضرورت بھی پوری کر دی اور قرآن مجید کے اعراب پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں، جن میں عموماً ایک ایک سورہ کو بہ ترتیب لے کر ان کے اعراب کی تحقیق کی گئی ہے،

اعراب القرآن ابوحاتم سہل بن محمد سجستانی المتوفی ۲۴۸ھ، اعراب القرآن

ابومروان عبدالملک بن حبیب قرطبی المتوفی ۲۳۹ھ، اعراب القرآن ابوالعباس مبرد المتوفی ۲۸۶ھ، اعراب القرآن ثعلب نحوی المتوفی ۲۹۱ھ، اعراب القرآن ابوجعفر احمد بن محمد النحاس المتوفی ۳۲۸ھ، اعراب القرآن حسین بن احمد خالویہ نحوی المتوفی ۳۷۰ھ (اس میں سورۂ طارق سے آخری تیس سورتوں کے اعراب بیان کیے گیے ہیں) غریب اعراب القرآن احمد بن فارس زکریا اللغوی المتوفی ۳۷۵ھ، اعراب القرآن علی بن ابراہیم حوفی المتوفی ۴۳۰ھ (یہ کتاب دس جلدوں میں ہے) مشکل اعراب القرآن مکی بن ابی طالب قیسی المتوفی ۴۳۷ھ (۳ جزء) ابوطاہر اسماعیل بن خلف صقلی نحوی المتوفی ۴۵۵ھ (نو جلدوں میں) اعراب القرآن ابوزکریا خطیب تبریزی المتوفی ۵۰۲ھ (چار جلدوں میں) اعراب القرآن قوام السنہ ابوالقاسم اسماعیل الطلیحی الاصفہانی المتوفی ۵۳۵ھ، اعراب القرآن ابوالبقاء عبداللہ المعکری المتوفی ۶۱۶ھ اس فن کی مقبول و مشہور کتابیں ہیں، ان کے علاوہ اس فن کی یہ کتابیں بھی قابل ذکر ہیں، اعراب القرآن موفق الدین عبداللطیف بغدادی المتوفی ۶۲۹ھ (صرف اعراب سورۂ فاتحہ) الکتاب الفرید فی اعراب القرآن المجید حسین بن ابی العز الہمدانی المتوفی ۶۴۳ھ، المجید فی اعراب الکتاب المجید برہان الدین ابراہیم بن محمد سفاقی المتوفی ۷۴۲ھ (مخلوط باعراب تفسیر)؛ اعراب القرآن احمد بن یوسف السمین المصری المتوفی ۷۵۶ھ، تحفۃ الاقران فیما قری بالتثلیث من حروف القرآن احمد ابن یوسف بن مالک الرعینی الاندلسی المتوفی ۷۷۷ھ (اس کتاب میں ان الفاظ کا بیان ہے جن کو مختلف معانی کے لحاظ سے جوزبر زیر پیش تینوں حرکات کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے)

علوم القرآن
معانی بیان بدیع قرآن
معانی القرآن

الفاظ کے بعد قرآن مجید کے محاسن معنوی کی بحث ہے، کہ قرآن مجید کن معانی پر مشتمل ہے؛ وہ معانی کن طرق سے ادا ہوئے ہیں، کن معانی کو کن مختلف صلات وحروف وابط معانی سے ادا اور ان میں کیا اثر پیدا کرتے ہیں، الفاظ کی تقدیم وتاخیر، تعریف وتنکیر، اطلاق وتقیید، وغیرہ سے معانی میں کیوں کر اثر پیدا ہوتا ہے، ان تمام امور کی واقفیت کے بغیر فہم مطالب قرآن غیر ممکن ہے، اسی لیے علماے ادب نے جن کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کا سب سے زیادہ حق تھا، ان مباحث پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں، جن میں سے حسب ذیل تصنیفات ومصنفین کے نام ہم کو معلوم ہیں،

معانی القرآن یونس بن حبیب النحوی المتوفی ۱۸۲ھ، معانی القرآن علی بن حمزہ کسائی المتوفی ۱۸۹ھ، معانی القرآن محمد بن مستنیر قطرب نحوی المتوفی ۲۰۶ھ، معانی القرآن ابوالحجی بن زیاد الفرار المتوفی ۲۰۷ھ، معانی القرآن ابوعبیدہ معمر نحوی المتوفی ۲۰۹ھ، معانی القرآن اسماعیل بن اسحاق ازدی المتوفی ۲۲۲ھ، تفسیر معانی القرآن سعید بن مسعدہ اخفش المتوفی ۲۲۱ھ، معانی القرآن تعلب نحوی المتوفی ۲۹۱ھ، معانی القرآن محمد بن احمد بن کیسان نحوی المتوفی ۲۹۹ھ، معانی القرآن ابومحمد سلمہ بن عاصم نحوی المتوفی ۳۱۰ھ، معانی القرآن ابواسحاق ابراہیم الزجاج المتوفی ۳۱۱ھ، معانی القرآن ابوعبداللہ محمد بن احمد نحوی المتوفی ۳۲۰ھ، معانی القرآن ابوالحسن عبداللہ ابن محمد نحوی المتوفی ۳۲۵ھ، معانی القرآن ابوجعفر نحاس نحوی المتوفی ۳۳۸ھ، معانی القرآن ابوعبید قاسم بن سلام المتوفی ۳۲۸ھ، الموضح فی معانی القرآن ابوبکر نقاش نحوی المتوفی ۳۵۱ھ، موجز التاویل عن معجز التنزیل احمد بن کامل بن شجرہ المتوفی ۳۵۰ھ

ایجاز البیان فی معانی القرآن نجم الدین ابوالقاسم محمود نیساپوری المتوفی ۵۵۳ھ۔

اعجاز القرآن | انبیاء پر خدا کی طرف سے جو کتابیں نازل ہوئیں، وہ اپنے معانی، مقاصد، ارشادات اور ہدایات کی بنا پر ہر زمانہ میں معجز رہی ہیں، لیکن یہ قرآن مجید کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے معانی وارشادات کے ساتھ اپنے الفاظ، ترکیب کلام، ادائے مقصود اور تعبیر مفہوم میں بھی اعجاز رکھتا ہے، یہی سبب ہے کہ صحف قدیمہ گو اپنے معانی کے لحاظ سے اب تک باقی ہوں، لیکن وہ اپنے الفاظ و ترکیب الہامی کے لحاظ سے مدت ہوئی کہ دنیا سے مفقود ہوچکی ہیں، مگر قرآن مجید جس طرح اپنے معانی، تعلیمات اور ہدایات کے لحاظ سے غیر فانی ہے، اسی طرح اپنے الفاظ وعبارات الہامیہ کے لحاظ سے بھی غیر فانی ہے قال اللہ تعالیٰ انا لہ لحفظون۔

حقیقت اعجاز بیان، اسباب اعجاز کی تشریح، انواع اعجاز کی تقسیم وتحلیل، محاسن عبارات قرآن کی تفصیل، نکات و وجوہ بلاغت و فصاحت قرآن کی توضیح، علمائے اسلام نے اس خوبی اور عمدگی سے کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے، اور اس کے متعلق اس کثرت سے لٹریچر انھوں نے فراہم کردیا ہے، کہ اس کا احاطہ بھی دشوار ہے، اس فن کی پہلی کتاب جہاں تک ہمیں معلوم ہوسکا، امام ابوالحسن علی بن حسین رمانی المتوفی ۳۸۲ھ کی "النکت فی الاعجاز" ہے، اور دوسری امام سلیمان احمد بن محمد خطابی المتوفی ۳۸۸ھ کی اعجاز القرآن اور تیسری شریف ابوعبداللہ محمد بن زید ابن علی الواسطی المتوفی ۳۰۶ھ کی اعجاز القرآن، چوتھی قاضی ابوبکر باقلانی المتوفی ۴۰۳ھ کی اعجاز القران ہے، شیخ عبدالقاہر جرجانی المتوفی ۴۷۴ھ نے "المعتضد" کے نام سے شریف، ابوعبداللہ کی کتاب کی شرح لکھی، شیخ کی اس کے علاوہ اعجاز القرآن

پر ایک دوسری تصنیف بھی ہے۔

متاخرین میں زین المشائخ محمد بن ابی القاسم البقالی الخوارزمی المتوفی ۵۶۲ھ کی التنبیہ علی اعجاز القرآن، ابو اسحاق ابراہیم بن احمد الجزری الخزرجی کی ایجاز البرہان فی اعجاز القرآن، امام فخر الدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ کی اعجاز القرآن، زکی الدین ابن ابی الاصبع تیروانی المتوفی ۶۵۴ھ کی البرہان فی اعجاز القرآن، ابوبکر محمد بن محمد ابن سراقہ المتوفی ۶۶۲ھ کی اعجاز القرآن، کمال الدین محمد بن علی زملکانی شافعی المتوفی ۷۲۷ھ کی البرہان فی اعجاز القرآن الکبیر اور المجید فی اعجاز القرآن المجید الصغیر، اس فن کی نادر تصنیفات ہیں،

یہ تصنیفات عموماً قرآن مجید کے ان طرق بلاغت و وجوہ فصاحت و انواع محاسن پر مشتمل ہیں، جو حد اعجاز تک پہنچ گئے ہیں، ضرورت تھی کہ قرآن مجید کے عام محاسن کلام پر بھی گفتگو کی جائے، چنانچہ مجاز قرآن، تشبیہ قرآن، امثال قرآن، امثلۂ قرآن اور بدائع قرآن پران کو مستقل فن قرار دے کر علٰحدہ علٰحدہ بیسیوں کتابیں لکھی گئیں۔

مجاز القرآن فطرت انسانی ہے کہ وہ پامال، عامیانہ اور کثیر الاستعمال چیزوں کو ناپسند اور مخصوص الاستعمال نو ایجاد اشیاء کو پسند کرتا ہے، اسی بنا پر عام اور مبتذل ترکیبیں اور الفاظ فصحاء کی زبان میں متروک ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر ہر متکلم معانی کے لیے خود الفاظ گڑھ کر اس کا استعمال شروع کر دے تو ہر شخص کی زبان کے لیے ایک نئی ڈکشنری کی حاجت ہوگی، اور دنیا میں باہمی فہم و تفہیم کا سدباب ہو جائے گا، کیونکہ الفاظ سے معانی تک انتقال ذہن فقط ملک یا قوم کے متفق علیہ وضع عام کا نتیجہ ہے، اس بنا پر ایک طرف یہ ضروری ہے کہ وضع عام سے بالکل کنارہ کشی نہ کی جائے،

دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے، کہ اس سے ابتذال نہ پیدا ہونے پائے، اُس کی صورت یہ ہے کہ تعبیر معنی کے لیے ان غیر مبتذل، غیر عامیانہ الفاظ کا استعمال کیا جائے، جن کا اُن معانی کے لیے وضع عام نہ ہو، لیکن ان الفاظ کے معانیِ موضوعہ اور اُن معانی میں جن کو ہم ادا کرنا چاہتے ہیں، ایک خاص قسم کی مناسبت و مشابہت ضروری ہے تاکہ جب ہم ان الفاظ کا استعمال کریں اور ہمارا مخاطب ان کے عام موضوع و معنی سمجھے، اور جب وہ ان کو کلام کے مقصود اور موقع و محل کے موافق نہ پائے، تو فوراً اس کا ذہن ان معانی کو چھوڑ کر ان کے مناسب و مشابہ معنی کی طرف منتقل ہو جائے، اور متکلم کا مقصود اس کے جدید، غیر مبتذل اور غیر عامی الفاظ و ترکیب کے ذریعہ سے سمجھ جائے۔

قرآن مجید میں جس کا حسن عبارت، خوبی کلام، اور جدتِ ترکیب حد اعجاز تک پہنچا ہوا ہے، بے انتہا مجازات ہیں، جو اکثر کتب سماویہ کی خصوصیت خاص ہے، فن معانی القرآن میں گو علماء نے ایک حد تک اس کے مباحث سے تعرض کیا تھا، لیکن ان کی اہمیت ایک مستقل فن کی طالب تھی، اس بنا پر مصنفینِ اسلام نے مجاز القرآن کے نام سے مستقل تصنیفات شروع کیں، اس سلسلہ کی پہلی کڑی ابوعبیدہ معمر بن مثنی نحوی المتوفی ۲۰۹ھ کی "مجاز القرآن" ہے، سلطان العلماء عزالدین بن عبدالسلام المتوفی ۶۶۰ھ کی الاشارہ الی الایجاز فی بعض انواع المجاز"، اس فن کی بہترین تصنیف ہے، جس میں نہایت استیعاب کے ساتھ قرآن کی آیات کا استقصا اور ان کے معنی کی تشریح کی گئی ہے، اس کے بعد علامہ ابن قیم بن جوزیہ کی تصنیف "الایجاز فی المجاز" ہے، جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے سلطان

العلماء کی الاشارہ کا بنام " مجاز الفرسان الی مجاز القرآن " اختصار کیا ہے۔

تشبیہ القرآن | سیکڑوں معانی اور مطالب ایسے ہیں، جو عام نظروں سے پوشیدہ ہیں، اور جن کی تشریح و توضیح کے لیے ایک دفتر درکار ہوتا ہے، لیکن سب سے آسان، مختصر اور بہتر صورت اس کی یہ ہے کہ ان کو بذریعہ تشبیہ ادا کیا جائے، یعنی ان کو ایسے معانی و مطالب کے مماثل و مشابہ قرار دیا جائے جو عام طور سے معلوم، اور نظروں کے سامنے ہیں، کہ مخاطب ان ظاہر اور واضح معانی سے بواسطۂ مماثلت و مشابہت ان مخفی، پیچیدہ اور دیر فہم معانی و مطالب تک پہنچ جائے۔

مذہب چونکہ ماورائے مادہ سے بحث کرتا ہے، اس لیے بیشتر مواقع پر اس کو تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے، قرآن مجید کے تشبیہات پر عام کتب بیان اور نیز فن معانی القرآن فی اعجاز القرآن اور فن مجاز القرآن میں ان پر کامل بحثیں موجود ہیں، اور الجمان فی تشابیہ القرآن لابی القاسم عبداللہ بن باقیا البغدادی المتوفی ۴۸۵ھ اس فن پر ایک مستقل کتاب بھی ہے۔

امثال القرآن | جو اغراض تشبیہ سے مطلوب ہیں، بعینہٖ وہی امثال سے مقصود ہیں۔ انبیائے مذاہب اور حکمائے اخلاق نے تمام طرق استدلال سے زیادہ ان امثال سے کام لیا ہے، کہ یہ استدلالات منطقی سے زیادہ موثر اور عام فہم ہیں، اس لیے قرآن مجید میں بھی نہایت کثرت سے امثال ہیں، تفسیر کے ضمن میں مفسرین نے ان امثال کی جو تشریح کی ہے، ان کے علاوہ ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی نیساپوری المتوفی ۴۰۲ھ، ابوالحسن علی بن محمد ماوردی المتوفی ۴۵۰ھ اور شمس الدین ابن القیم المتوفی ۷۵۱ھ نے "امثال القرآن" کے نام سے مستقل کتابیں لکھی ہیں،

امثلۃ القرآن حکما کے چھوٹے چھوٹے مقولے اور بلغا کے بلیغ فقرے لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں، اور وہی تقریباً انشا پردازی اور ادب کی جان ہوتے ہیں، اور پھر وہ لٹریچر میں اس طرح سرایت کر جاتے ہیں، کہ ان سے سیکڑوں محاورے اور تلمیحات پیدا ہو جاتے ہیں، قرآن مجید اس ایجاز اور اعجاز کا کامل ترین نمونہ ہے، اس کی سیکڑوں چھوٹی چھوٹی آیتیں اور حکیمانہ فقرے عربی علم ادب کے جزء بن گئے ہیں۔ جن کے بغیر عبارت میں بلندی اور کلام میں لطف و شیرینی نہیں پیدا ہو سکتی، علمائے ادب عربی نے قرآن مجید کی اس قسم کی تمام آیتیں الگ کر دی ہیں، ثعالبی المتوفی ۴۳۰ھ نے کتاب الایجاز والاعجاز میں، قاضی ماوردی المتوفی ۴۵۰ھ نے امثال القرآن میں، جعفر بن شمس الخلافہ نے کتاب الآداب میں، جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے الاتقان میں مستقل ابواب میں قرآن مجید کی ضرب الامثال کو جمع کر دیا ہے۔

بدائع القرآن کلام کے محاسن معنوی کے بعد اس کے محاسن لفظی کا درجہ ہے، جن کو عام طور سے "صنائع و بدائع" کہتے ہیں، زور بلاغت و فصاحت کے ساتھ اگر یہ چیز کلام میں پیدا ہو جائے، تو عجیب لطف دے جاتی ہے، یہ بھی عجیب بات ہے کہ تمام علوم و فنون اسلامیہ کے بانی و واضع ۔۔۔ اول عموماً ارباب خلوت و محراب اور بوریا نشینان کلبۂ فقر ہیں، لیکن علم بدیع کا مخترع اول ایک عباسی شہزادہ ابن المعتز المتوفی ۲۹۲ھ ہے، اس نے ۱۷ بدائع اپنی تصنیف کتاب البدیع میں جمع کئے ہیں، قدامہ بن جعفر نے جو ابن المعتز کا معاصر تھا، نقد الشعر میں اس کو نیس تک پہونچایا، ابو ہلال عسکری المتوفی ۳۹۵ھ نے کتاب الصناعتین میں سات کا اور اضافہ کیا، ابن رشیق قیروانی المتوفی ۴۵۶ھ نے کتاب العمدہ میں پینسٹھ بدائع شمار

کرائے، شرف الدین احمد بن یوسف تیفاشی نے ستر تک پہنچایا، عبدالعظیم بن ابی الاصبع المتوفی ۶۵۴ھ نے کتاب التحریر کے نام سے خاص قرآن مجید کے بدائع کی کتاب لکھی، جس میں بدائع کی تعداد ۱۲۰ تک پہنچا دی۔[۱]

علوم القرآن کے عنوان سے ایک سلسلۂ مقالات اس جلد کے ابتدائی نمبروں میں شروع ہوا تھا، جس کا آخری نمبر ۲۵ فروری ۱۹۱۴ء کی اشاعت میں نکلا تھا، ان نمبروں میں قرآن حکیم کے متعلق بیس[۲] علوم کا تذکرہ ہو چکا ہے، آخری عنوان الفاظ القرآن تھا، اس کا بقیہ حصہ آج سے پھر شروع کیا جاتا ہے:-

<u>۲۱- ہجاء القرآن</u> عجائب قدرت الٰہی کا ایک نمونہ ہے، کہ دنیا میں تقریباً پانچ ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں، جو باوجود اختلاف شدید حروف ہجا کی آوازیں (باستثنائے چند حروف) بالکل متحد و مشترک ہیں، لیکن یہ اتحاد و اشتراک، ان کے الفاظ کے اتحاد و اشتراک پر ذرہ بھی موثر نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ ۳۲ یا ۳۳ حروف ہیں جو کم و بیش دنیا کی پانچ ہزار زبانوں کے لیے ہمیشہ جدید اور غیر مشترک الفاظ کا ذخیرہ فراہم رکھتے ہیں،

عربی زبان تمام السنۂ سامیہ سے زیادہ حروف رکھتی ہے، عبری جو باعتبار ادبیات و علوم تمام سامی زبانوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے، اس کی بنیاد صرف ان ۲۲ حروف پر ہے۔

اب ج د (گ) ہ و ز ح ط ی، ک ل م ن، س ع ف، (پ) ص ق ر ش ت، ان کا مجموعہ ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت ہے۔ عربی زبان میں ۶ حرف

---

[۱] الہلال کلکتہ ۲۵ فروری ۱۹۱۴ء۔

زیادہ ہیں۔ث، خ ذ، ض ظ غ، جن کا مجموعہ ثخذ اور ضظغ ہے،

اس تفصیل سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ عربی زبان میں حروفِ ہجا کی یہ تبعیت عبری کی ترتیب کیا تھی ؟ یعنی دراصل اس طرح تھی، اب ج د، ہ و ز ح ط ی، ک ل م ن، س ع ف ص ق ر ش ت، ث خ ذ ض ظ غ، بعد از اسلام سب سے اول جس چیز کو عربی زبان حیطۂ تحریر میں لائی، وہ قرآن مجید ہے، کسی چیز کو لکھنے کے لیے حروفِ ہجا کی ترتیب و تحسین کوئی ضروری شے نہیں، لیکن اس کے پڑھنے کے لیے یقیناً سب سے اول حروف ہجا کی اور پھر ان کو بحسن و صحت پڑھ سکنے کے لیے حروف ہجا کی ترتیب صحیح و آسان کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ سب سے پہلے مسلمانوں نے حروف ہجا کو آسان ترین و بہترین ترتیب میں مبدل کیا، اور تمام ہم شکل و متحد الصورت حروف کو یکجا کر دیا، مثلاً

اب ت ث، ج ح خ، د ذ، ر ز، س ش، ص ض، ط ظ، ع غ، ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ہ، ی حروف ہجا کے تلفظ کی ایک اور مصیبت تھی، عبری میں جو السنۂ سامیہ کی مہذب ترین شاخ تھی، تلفظ کی صورت یہ تھی،

الف، بیتھ، گیل، دالھ، ہے، واؤ، زین، حیتھ، طیتھ، یود، کاف، لامید، مم، نن، سن، عین، فے، صیخ، قف، رش، شن، تاد،

قرآن مجید کے لیے حروف ہجا کی تہذیب و ترتیب میں اس اختلاف تلفظ کو بھی دفع کیا گیا، اور حتی الامکان ایک متحد و متساوی الصوت تلفظ وضع کیا گیا، مثلاً الف، بے، تے، ثے، الخ یا الف، با، تا، ثا، الخ

غرض یہ مباحث ایسے تھے، جو مسئلۂ تدوین علوم قرآنیہ میں سب سے اوّل

بحث و ترتیب کے لائق تھے، چنانچہ دوسری اور تیسری صدی کے علماء نے ان مباحث پر بھی منفرد و مخصوص کتابیں لکھیں، جن کا نام عموماً "ہجاء المصحف" ہے، ابن ندیم جو چوتھی صدی کا مصنف ہے، اس نے اس موضوع پر متعدد تصنیفات کا ذکر کیا ہے، جیسے ہجاء المصحف، یحییٰ بن حارث، ہجاء المصحف ابن قتیب، ہجاء المصحف احمد بن ابراہیم الوراق وغیر ذالک،

۲۲۔ النقط والشکل فی القرآن: عربی زبان میں ابتداءً حروف ہجا میں نقطے نہیں ہوتے تھے، اس لیے اکثر اہل عجم کی نظر میں حروف باہم متشابہ معلوم ہوتے تھے اور وہ ان کو صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے۔ حجاج بن یوسف ثقفی کے تمام اوراق عمل میں سیاہی کے سوا اور کچھ نہیں، اگر ان میں کچھ اجالا ہے، تو یہی ہے کہ اس نے قرآن کو اس مشکل سے نجات دی،

اس نے چند علماء کی مدد سے نقطے ایجاد کرائے، اس پر بھی غلطی رفع نہ ہوئی، تو قرآن کے الفاظ پر شکل یعنی زبر، زیر، پیش لگائے، اکثر عربی کتابوں میں تم نے "اعجام" اور "حروف معجم" پڑھا ہوگا، اس کے اصلی معنی یہ ہیں، کہ "لفظ عربی کو عجمی بنانا" چونکہ یہ نقطے عجمیوں کی خاطر ایجاد کیے گئے تھے، اس لیے حروف ہجا پر نقطے لگانا گویا "اعجام ہونا تھا، یعنی عربی لفظ کو عجمی بنانا تھا۔

چونکہ یہ علامات بالکل نئی تھیں، اس لیے ان کے قواعد و اصول کے لیے مستقل تصنیفات کی ضرورت تھی، علمائے اسلام نے یہ ضرورت بھی باحسن وجوہ پوری کی، اور حسب ذیل کتابیں یادگار چھوڑیں،

کتاب النقط والشکل خلیل بن احمد (واضع علم عروض) المتوفی ۱۷۵ھ کتاب النقط

والشکل محمد بن عیسی، کتاب النقط والشکل یحییٰ ابن مبارک یزیدی النحوی المتوفی ۲۰۲ھ، کتاب النقط والشکل ابوحاتم سجستانی المتوفی ۲۴۵ھ (یہ کتاب جداول و دوائر پر مشتمل ہے) کتاب النقط والشکل ابن قتیبہ دینوری المتوفی ۲۷۶ھ۔

۲۳۔ اجزاء القرآن | ہر کتاب تحصیل فوائد اور تسہیل مطالب کی غرض سے مختلف ابواب و فصول پر منقسم ہوتی ہے، صحف الٰہیہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں، تورات مختلف پرق (فرق) یعنی منازل اور مختلف اصحاح یعنی سور پر منقسم ہے، قرآن مجید کی اصلی تقسیم معنوی تو سورتوں پر ہے، لیکن لوگوں نے تلاوت کی آسانی کے لیے مختلف اجزاء پر اس کو منقسم کر دیا ہے، ان تقسیمات کا مبنیٰ صرف الفاظ و عبارات کی متساوی تقسیم ہے کہ پڑھنے والوں اور حوالہ دینے والوں کو سہولت و آسانی ہو۔

قرون اولیٰ کے عباد و زہاد علی العموم قرآن کی کامل تلاوت ایک ہفتہ میں ختم کر دیتے تھے۔ اس مناسبت سے قرآن کی سب سے پہلی تقسیم یہ ہوئی کہ سات ٹکڑوں پر منقسم کیا گیا، جن میں سے ہر ایک کو "حزب" "(ٹکڑا) یا "منزل" کہتے ہیں، کہ تلاوت قرآن کا مسافر ہر روز وہاں اپنے سفر الی اللہ کی ایک منزل ختم کرتا ہے،

تلاوت کا اس سے زیادہ سہل طریقہ یہ ہے کہ ہر مہینے میں ایک بار ختم کیا جائے، اس بنا پر لوگوں نے قرآن کو تیس روز کے حساب سے برابر برابر تیس حصوں پر تقسیم کر دیا، جن کا نام "پارہ یا جزء" ہے،

پھر ہر پارہ دو برابر حصوں میں منقسم ہوتا ہے، جن کو "نصف" کہتے ہیں، نصف کے بھی دو ٹکڑے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا ایک ایک ربع ہے، لیکن اصطلاحاً ایک ٹکڑے کو ربع، دو ٹکڑے کو نصف، تین ٹکڑے کو ثلث اور چاروں ٹکڑوں کو ملا کر

ایک "پارہ" کہتے ہیں؛

۲ ... قرآن مجید کے ان مختلف اجزاء و اقسام کی تعیین کہ کہاں سے شروع ہوتے ہیں، کہاں ختم ہوتے ہیں، کہاں تک نصف ہے، کہاں ربع ہے، کہاں ثلث ہے، محتاجِ تالیف و ترتیب تھی، اس لیے دوسری اور تیسری صدی کے علمائے نحو و ادب نے اس احتیاج سے بھی قرآن کو مستغنی کر دیا، اجزاء القرآن ابوبکر بن عیاش الموجود ۱۲۷ھ (یہ کتاب ۳۰ پاروں میں تقسیم ہے) اجزاء القرآن حمید بن قیس الہلالی، اسباع القرآن (۷ منازل کی تفصیل) حمزہ زیات المتوفی ۱۵۶ھ، اجزاء القرآن سلیمان بن عیسیٰ، اجزاء القرآن کسائی نحوی المتوفی ۱۸۰ھ، اجزاء القرآن ابوعمر الدوری الموجود ۲۰۲ھ،

۲۴۔ مقطوع القرآن و موصولہ | کسی ایسی کتاب کے لیے جو متنوع المعانی اور مختلف المطالب ہو، اس کو پڑھتے وقت نہایت ضروری ہے، کہ عبارت کا جوڑ توڑ اور ختم و شروع ایسے فقرہ پر کیا جائے، جس سے عبارت بے ربط اور معنی مختلط نہ ہوں، اسی کا نام قطع و وصل ہے، قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بلکہ صحیح طور پر مطالب سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے، کہ قرآن مجید کی مقطوعات و موصولات سے واقفیت ہو، حسب ذیل کتابیں اسی واقفیت کا ذریعہ ہیں، مقطوع القرآن و موصولہ عبداللہ عامر یحصبی قاری شام المتوفی ۱۱۸ھ، مقطوع القرآن و موصولہ حمزہ بن حبیب الزیات قاری بصرہ المتوفی ۱۵۶ھ، مقطوع القرآن و موصولہ علی بن حمزہ کسائی قاری کوفہ المتوفی ۱۸۰ھ،

۲۵۔ عدد آی القرآن | جس طرح عام کتابوں کی ہر فصل و باب کی ترکیب فقروں سے ہوتی ہے، اسی طرح قرآن مجید کی ہر سورت آیتوں سے مرکب ہوتی ہے، "آیۃ"

عربی میں (اور اُدہ عبری میں) لغت، نشان وعلامت کے مرادف ہے، عبری

اصطلاحاً عبری میں تورات کے ایک حرف کو بھی ادہ کہتے ہیں، کہ وہ اپنے مدلول علیہ کے لیے صرف ایک قسم کا نشان اور علامت ہے، لیکن عربی کی اصطلاح اس سے زیادہ وسیع قرار دی گئی ہے اور وہ قرآن کے پورے ایک فقرہ پر حاوی ہے،

آیت یا فقرہ کس کو کہتے ہیں، کسی کلام مسلسل کے اس مختصر ٹکڑے کو جو ادائے مطلب اور تفہیم معنی میں مستقل ہو، اس تعریف کے رو سے ممکن ہے کہ کلام کا ایک ٹکڑا جس کو ہم ادائے مطلب کے لیے مستقل سمجھتے ہوں تم نہ سمجھتے ہو، پس یہ بالکل ممکن ہے کہ اگر ایک فریق کے نزدیک سورہ فاتحہ کے سات ٹکڑے ہوں، یعنی سات آیتیں، تو دوسروں کے ہاں چھ یا آٹھ ہوں، اسی پر پورے قرآن مجید کی تمام آیات کی تعداد کو قیاس کرلو،

قرآن مجید کے تحفظ وصحت کی اخیر حد یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس کے ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت کا شمار کرلیا ہے، حروف اور الفاظ کی تعداد میں تو زیادتی اور کمی نہیں ہوسکتی، لیکن اوپر کی تفصیل کے مطابق آیات کی تعداد میں اختلافِ رائے ممکن ہے، چنانچہ "علم عدد آی القرآن" کا موضوع یہی مسئلہ ہے،

علم القرأۃ کی تفصیل میں اوپر گذر چکا ہے کہ فنون قرآن کے لیے قرون اولیٰ میں پانچ مشہور اسکول (درسگاہ) تھے: مکہ معظمہ، مدینۂ مبارکہ، بصرہ، کوفہ، شام، ان میں سے ہر اسکول نے اپنی تحقیق ورائے کے مطابق آیاتِ قرآنیہ کی تعداد وشمار پر مستقل رسائل ترتیب دیئے ہیں،

مکہ معظمہ | کتاب العدد عطاء بن یسار الفقیہ، کتاب العدد فزائی، کتاب حروف القرآن خلف البزاز۔

مدینہ مبارکہ | کتاب العدد نافع قاری مدینہ المتوفی ۱۶۹ھ، کتاب العدد عیسٰی المدنی، کتاب العدد اسماعیل بن ابی کثیر القاری۔

کوفہ | کتاب العدد حمزۃ الزیات قاری کوفہ المتوفی ۱۵۶ھ، کتاب العدد خلف النحوی الکوفی، کتاب العدد محمد بن عیسٰی الکوفی، کتاب العدد علی بن حمزہ الکسائی النحوی قاری کوفہ المتوفی ۱۸۹ھ۔

بصرہ | کتاب العدد ابن معافا، کتاب العدد عاصم الجحدری، کتاب العدد حسن بن حسن بصری، عدد ای القرآن محمد بن مستنیر قطرب المتوفی ۲۰۶ھ۔

شام | کتاب العدد یحیٰی بن حارث الذماری، کتاب العدد خالد بن معدان، (کتاب اختلاف العدد وکیع الفقیہ)

یہ قدماء کی تصنیفات ہیں، متاخرین میں موصلی (نام نہیں معلوم) کی ذات الرشد اور ابو معشر عبدالکریم بن عبدالصمد الطبری المتوفی ۴۷۸ھ کی تعداد الآای القرآن وغیرہ اسی فن کی کتابیں ہیں[1]۔

احکام القرآن | مسلمانوں نے اپنے صحیفۂ آسمانی کی جن جن حیثیتوں سے خدمت کی، لفظی، معنوی، نحوی، ادبی، لغوی، فقہی، کلامی، اخلاقی، روحانی، غرض مختلف پہلوؤں اور مختلف نقطہ ہائے نظر سے جو تصنیفات، کتابیں، اور رسالے لکھے، ان کی کثرت، ضخامت اور تعداد اس قابل ہے، کہ ان کو خود ایک مستقل کتب خانہ کا خطاب دیا جائے۔

---

[1] الہلال ۸ جولائی ۱۹۱۳ء

الہلال اور البلاغ مرحوم کلکتہ کے متعدد نمبروں، (۱۱ فروری تا ۸ جولائی ۱۹۱۴ء) میں میرے مضامین شائع ہو چکے ہیں، اور ان کا عنوان علوم القرآن ہے، افسوس ہے، کہ یہ سلسلہ ناتمام رہا، اور آج گویا اسی سلسلہ کا ایک اور نمبر ہدیۂ ناظرین ہے،

اسلام کی شریعت کی اصل اور اساس اس کا صحیفۂ الٰہی ہے، یہی ان کے دین اور دنیا کی ہر ضرورت کا مرجع اور مآب ہے، اور وہی ان کے ہر عقیدہ، ہر حکم مفروض، اور ہر نکتۂ اخلاقی و تمدنی کی بنیاد ہے، احادیث اور فقہ میں جو کچھ ہے، وہ اسی کی آیتوں کی تشریح و توضیح، بیان و تفصیل اور استنباط و اجتہاد ہے، کچھ اور نہیں، ظاہر بین سمجھتے ہیں، کہ بعض احادیث صحیحہ میں قرآن کے مخالف یا قرآن کے ماورا احکام ہیں، یہ فکر کا قصور، غور کی کمی، اور بصیرت کا نقص ہے، اسی لیے ائمۂ اسلام اور علمائے اعلام نے ابتداء سے قرآن مجید کے ساتھ اس حیثیت سے اعتنا کیا ہے، صحابۂ کرام میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ اس باب میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، احادیث میں بکثرت ایسے واقعات مذکور ہیں، کہ صحابہ اور صحابیات نے قرآن پاک کی آیتوں سے ایسے باریک اور دقیق قانونی اور فقہی نکتے پیدا کیے، جہاں تک عام اہلِ فہم کی رسائی ناممکن ہے، شام و عراق کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ اور فوج کے سپاہیوں میں جو زیادہ تر صحابۂ کرام تھے، یہ بحث پیش آتی ہے، کہ ممالک مفتوحہ کی یہ زمینیں عہد نبوی کے مفتوحات کی طرح مجاہدین میں تقسیم کر دی جائیں، یا وہ سلطنت و خلافت کی ملک قرار پائیں، اور ان کا حاصل بطور وظائف کے تمام مسلمانوں کو ملے، عام مجاہدین کا مطالبہ تھا کہ عہد نبوی کی پیروی کی جائے، اور یہ زمینیں صرف اُن سپاہیوں میں

تقسیم کردی جائیں، جو ان لڑائیوں میں شریک تھے، حضرت عمرؓ کا دعویٰ تھا، کہ ان زمینوں پر صرف انہی سپاہیوں کا حق نہیں، جنھوں نے ان ممالک کے فتح کرنے میں لڑائیاں لڑیں، بلکہ یہ خلافت و سلطنت کی ملکیت بن کر تمام موجودہ اور آیندہ نسلوں کی ملکیت ہیں، سپاہیوں کے سامنے مدینہ اور خیبر وغیرہ کی نظیریں تھیں، مگر یہ نکتہ ان سے پوشیدہ رہا، کہ چونکہ اس عہد میں مہاجرین عموماً اور بعض انصار بالکل تہی دست اور مفلس ہو گئے تھے، اس لیے اسلام کی پہلی دولت ان کی شخصی ملکیتوں میں دے دی گئی، اور اب چونکہ خدا کے فضل سے مسلمان بے نیاز ہو چکے تھے اس لیے اب اس کی حاجت نہ تھی، نیز حضرت عمرؓ یہ مصلحت پیش نظر رکھتے تھے کہ عراق و شام کے متمدن ممالک جن کے پیچھے مجوس و ترک اور رومیوں کی سلطنتیں ہیں جن کے مقابلہ اور مدافعت کے لیے ہمیشہ ایک مستقل فوج کی ضرورت پڑے گی اور یہاں اندرون سلطنت میں یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کی امداد کی حاجت ہوگی، اگر یہ صرف ان مجاہدین کی شخصی ملکیتیں قرار دے دی جائیں تو اتنی بڑی سلطنت کی بیرونی و اندرونی ضرورتیں کیونکر پوری ہوں گی، یہ مقدمہ اہل شوریٰ صحابہ کی عدالت میں پیش ہوتا ہے، اور وہاں بھی کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہوتا، آخر حضرت عمرؓ کا فہم قرآن کام کرتا ہے، اور وہ سب کے سامنے فرماتے ہیں، صاحبو! اللہ تعالیٰ نے ان فتوحات کا مصرف خود بتا دیا ہے،

ما افاء اللّٰہ علی رسولہ من	خدا نے اپنے رسول کو ان گانے والوں پر جو فتح دی
اھل القریٰ فللّٰہ وللرسول و	تو وہ خدا، رسول، قرابت داروں، یتیموں،
لذی القربیٰ، والیتامیٰ والمساکین	مسکینوں اور مسافر کا حصہ ہے، تاکہ یہ جائداد

وابن السبیل کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (حشر) ۔ تم میں سے صرف دولت مندوں کے ہاتھوں میں پھرا کرے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کا حق بنایا، پھر انصار کا حق جتایا، اور پھر آخر میں فرماتا ہے،

والذین جاء وا من بعدھم (حشر) اور ان مسلمانوں کا حصہ ہے، جو ان لوگوں کے بعد آئے؛

آپ نے فرمایا اگر یہ زمینیں آج صرف ان لڑنے والے سپاہیوں کو دیدی جائیں، تو بتاؤ آئندہ آنے والے مسلمانوں کا حصہ کہاں رہے گا؟ تمام صحابہؓ نے اس استدلال کو سُن کر سر اطاعت خم کر دیا، قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں اس واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ استدلال صرف خدا کی توفیق سے تھا،

حضرت عائشہؓ کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ اسلام میں متعہ جائز ہے یا نہیں، روایتیں مختلف تھیں، صحابہ میں حضرت ابن عباسؓ کو اس کے جواز پر اصرار تھا، قرآن پاک کی کوئی صریح آیت موجود نہ تھی، حضرت ام المومنینؓ نے لوگوں سے کہا تمہارے درمیان قرآن کا فیصلہ ہے، خدا فرماتا ہے؛

الا علیٰ ازواجھم اوما ملکت ایمانھم، مسلمانوں کی صرف دو قسم کی عورتیں حلال ہیں، ایک بیویاں، دوسری باندیاں؛

بتاؤ یہ متوعہ عورتیں ان دو صفتوں میں سے کس میں داخل ہیں؟ بیویاں نہیں ہیں، کہ ان کے لیے ترکہ اور وراثت نہیں، اور باندیاں تو ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہیں، اور

ان دو کے بعد کوئی تیسری قسم حلال نہیں[1]، کتنا اچھا استدلال ہے،

فاطمہ بنت قیس ایک صحابیہ ہیں، جو یہ روایت کرتی ہیں، کہ جن عورتوں کو ان کے شوہر تین طلاقیں دیدیں۔ ان کے شوہروں پر پھر ان کو نان نفقہ اور رہنے کا مکان دینا واجب نہیں، ان کی یہ روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے فیصلوں اور قرآن کی اس آیت کے خلاف ہے،

یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن واحصوا العدۃ واتقوا اللہ ربکم لا تخرجوھن من بیوتھن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ وتلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ۔ (طلاق۔۱)	اے نبی! جب تم لوگ (یعنی مسلمان) عورتوں کو طلاق دو تو ان کو عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کے دن گنو اور اپنے پروردگار اللہ سے ڈرو، ان عورتوں کو ان کے گھروں سے (جن میں وہ رہتی تھیں) نہ نکالو، لیکن جب وہ کھلی بدکاری کریں، یہ خدا کی حدیں ہیں، اور جس نے خدا کی حدوں سے تجاوز کیا، اس نے اپنے اوپر ظلم کیا،

لوگوں نے جب فاطمہؓ کی اس روایت کے ماننے میں پس و پیش کیا تو انھوں نے کہا اے لوگو! میرے تمہارے درمیان قرآن کا فیصلہ ہے، اس گھروں سے نہ نکالنے کی حکم والی آیت کے بعد ہی یہ حکم ہے، جس میں گھروں سے علیحدہ نہ کرنے کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے،

لا تدری لعل اللہ یحدث	تجھے معلوم نہیں شاید خدا کوئی نئی بات

[1] مستدرک حاکم۔

بعد ذالك امرا ۔۔۔ پیدا کرے ۔۔۔

یہ کنایہ ہے میاں بیوی کے دوبارہ ملاپ سے، تین طلاقوں کے بعد میل ملاپ کی کوئی صورت نہیں، اس لیے لامحالہ یہ حکم اُن عورتوں سے متعلق ہے جن کو ایک یا دو یعنی رجعی طلاقیں دی گئی ہوں، کہ اُن کے لیے ایک جگہ رہنے سہنے میں دوبارہ میل کا امکان ہے، بتاؤ تین طلاقوں کے بعد نئی بات کیا پیدا ہوگی، [1] غور کیجیے کتنا لطیف استدلال ہے،

یہ صحابۂ کرام کے عہد کی چند مثالیں ہیں، اس سے اندازہ کیجیے کہ اگر نکتہ رس اور دقیقہ شناس طبیعتیں اس طرز پر غور و فکر کریں تو اسلامی قانون کا کتنا حصہ کتاب پاک کی روشنی میں منور نظر آئے، چونکہ قرآن پاک میں فقہ کے ابواب و فصول نہیں ہیں، اور حدیث کی کتابیں احکام کے ابواب پر مرتب ہیں، اور ان سے زیادہ بہتر اور آسان ترتیب اور جزئیات کی توضیح کے ساتھ فقہ کی کتابوں کی ہے، اس لیے آسان اور سہولت طلب طبیعتیں ہر معاملہ کے پیش آنے کے وقت سب سے اول فقہ و فتاویٰ کی کتابوں کی طرف رجوع کرتی ہیں، اور اُن کے بعد کتب حدیث کی طرف، اور سب سے آخر میں قرآن پاک کی طرف، حالانکہ حضرت معاذ بن جبلؓ والی حدیث کے مطابق اُس کی ترتیب الٹی ہونی چاہیے، پہلے قرآن، پھر حدیث، پھر فقہ و فتاویٰ، اس کم بینی،

---

[1] ابو داؤد کتاب الطلاق۔

کسلمندی اور سہولت پسندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف قرآن پاک کے مطالب میں غور و خوض کا مادّہ روز بروز کم ہوتا جارہا ہے، اور دوسری طرف زمانہ کے جدید ضروریات اور نئے سوالات کی جواب دہی سے ہم عاجز ہوتے جارہے ہیں۔

اسلام کے عہدِ کمال میں ائمۂ مجتہدین اور عُلماے اسلام نے قرآن مجید کے فقہی اور قانونی پہلوؤں پر غور و فکر سے پہلوتہی نہیں کی، بلکہ پوری نکتہ سنجی کے ساتھ اس فرض کو ادا کیا ہے، تحریر و فن کی حیثیت سے سب سے پہلے امام شافعی نے اس موضوع پر کتاب لکھی، اور اس کے بعد فقہ اسلامی کے چاروں ارکان مالکی، شافعی، حنفی اور حنبلی نے اس بحث پر کتابیں لکھیں، چنانچہ کشف الظنون کے حوالہ سے حسب ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے،

عدد	کتاب کا نام	مصنف کا نام	سالِ وفات
۱	احکام القرآن	امام شافعی	۲۰۴ھ
۲	"	ابوالحسن علی بن حجر سعدی	۲۴۴ھ
۳	"	قاضی ابواسحاق اسماعیل بن اسحاق ازدی بصری	۲۸۲ھ
۴	"	ابوالحسن علی بن موسیٰ بن یزداد قمی حنفی	۳۰۵ھ
۵	"	امام ابوجعفر احمد طحاوی حنفی	۳۲۱ھ
۶	"	ابومحمد قاسم بن اصبغ قرطبی مالکی	۳۴۰ھ
۷	"	ابوبکر جصاص رازی حنفی	۳۷۰ھ

عدد	کتاب کا نام	مصنف کا نام	سال وفات
۸	احکام القرآن	ابو بکر احمد بن حسین بیہقی	۴۵۸ھ
۹	مختصر احکام القرآن	ابو محمد مکی بن ابی طالب قیسی	۴۳۷ھ
۱۰	احکام القرآن	امام ابو الحسن کیا الہراسی شافعی بغدادی	۵۰۴ھ
۱۱	"	قاضی ابو بکر ابن العربی اندلسی مالکی	۵۴۳ھ
۱۲	"	عبد المنعم بن محمد بن فرس الغرناطی	۵۹۷ھ
۱۳	تلخیص احکام القرآن	جمال الدین احمد بن السراج القونوی حنفی	۷۷۰ھ

ہندوستان میں بھی اس فہرست میں ایک نیا اضافہ کیا گیا ہے، اور وہ مولانا احمد امیٹھوی کی، جو ملا جیون کے نام سے مشہور ہیں، اور جو اصول فقہ میں نور الانوار کے مصنف ہیں، تصنیف تفسیرات احمدیہ ہے، جس میں ملا صاحب نے احکامی آیتوں کی تفسیر کی ہے،

احکام القرآن کی کتابوں کی اس طویل فہرست میں سے افسوس ہے کہ اب بہت سے نوادر ناپید ہو چکے ہیں، یا گمنامی کے گوشوں میں پڑے ہیں، تاہم اس وقت اس سلسلہ کی تین کتابیں چھپ چکی ہیں، تفسیرات احمدیہ ہندوستان کے مطبعوں میں چھپی ہے، اور ملتی ہے، اس کے علاوہ قاضی ابو بکر ابن العربی اشبیلی مالکی کی احکام القرآن، مولای عبد الحفیظ سابق سلطان مراکش کے خرچ سے ۱۳۳۱ھ میں مصر سے دو جلدوں میں چھپ کر شائع ہوئی ہے، اور

اس کے بعد سلطان رشاد سابق سلطان ترکی کے عہد حکومت میں ۱۳۲۵ھ ابوبکر جصاص رازی حنفی کی احکام القرآن تین جلدوں میں قسطنطنیہ سے شائع ہوئی ہے۔

ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے یہ امر بخوبی روشن ہوجاتا ہے کہ کتب فقہ میں جو احکام مذکور ہیں، اُن کا ماخذ قرآن مجید کی کون کون آیتیں ہیں، اور ائمۂ مجتہدین نے اُن سے کس کس طرح استخراج کیا ہے، خصوصاً ابوبکر جصاص رازی حنفی المتوفی ۳۷۰ھ کی تصنیف، نہ صرف قدامت کے لحاظ سے بلکہ دوسری حیثیتوں سے بھی نہایت عجیب چیز ہے، اور فقہ حنفی کے لیے طحاوی کے بعد یہ دوسری نعمت ہے، جو عالم وجود میں آئی ہے، یہ وہی ابوبکر رازی ہیں، اور یہی اُن کی تصنیف ہے، جس کا ذکر امام رازی اپنی تفسیر میں بار بار کرتے ہیں، اور شافعی المذہب ہونے کے باعث ان کے حنفی استدلالات پر وہ ہر جگہ حملے کرتے ہیں، ابوبکر رازی، امام ابوداؤد یعنی سنن ابی داؤد کے مصنف کے بیک واسطہ شاگرد ہیں، اور ایک ہی واسطہ سے ابوداؤد سے احادیث کی روایت کرتے ہیں،

امام موصوف قرآن مجید کی اس آیت

ونزلنا علیك الكتاب تبیانًا لكل شیء — اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جس میں ہر شے کا بیان ہے،

کی تفسیر میں لکھتے ہیں، -

یعنی به واللہ اعلم تبیان کل ... اس سے مراد اور خدا بہتر جانتا ہے،

شیٔ من امور الدین بالنص ... امور دین سے ہر شے کا بیان ہے، یا وہ صریح

والدلالۃ فما من حادثۃ — الفاظ میں مذکور ہیں، یا اشاروں سے سمجھا

جلیلۃ ولا دقیقۃ الا واللہ — جائے تو کوئی چھوٹا یا بڑا ایسا مسئلہ نہیں

فیھا حکم قد بینہ فی الکتاب — ہے جس میں خدا کا فیصلہ نہ ہو، جس کو

نصًّا او دلیلاً فما بینہ النبی صلی اللہ — اس نے اپنی کتاب میں صریح الفاظ میں

علیہ وسلم فانما صدر عن الکتاب — یا اشارات میں ظاہر کر دیا ہے، اور جو

بقولہ تعالیٰ۔ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا ہے

وہ بھی کتاب ہی سے ماخوذ ہے، جیسا کہ خدا

(جلد ۳ ص ۱۸۹) — فرماتا ہے،

اس کے بعد وہ آیتیں ہیں، جن سے سنت کی شرعیت اور رسول کی اطاعت ثابت ہوتی ہے، اور اسی طرح اجماع وقیاس کے جواز پر قرآن کی آیتوں سے استدلال کیا ہے،

حال میں ایک عالم محمد عبدالعزیز الحکیم نے ۱۳۲۵ھ میں اس موضوع پر الفتوحات الربانیہ فی الاوامر والنواہی نام ایک کتاب دو جلدوں میں عربی میں لکھی ہے، پہلی جلد میں قرآن کے اوامر ہیں، اور دوسری جلد میں اس کے نواہی ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ قدماء کی تصنیفات کی بربادی وتباہی اور نئی ضرورتوں

کے وجود سے اس سلسلہ میں ابھی کام کی سخت ضرورت ہے، یہی صورت ہے جس سے ہم نئے فتنوں کا دروازہ بند کر سکتے ہیں؛

(معارف، اپریل ۱۹۲۶ء)

اسماء القرآن

عام مسلمانوں کو قرآن مجید کے ناموں کی تحقیق نہیں معلوم، اس لیے ایک نو آریہ کو یہ کہنے کی جسارت ہوئی، کہ قرآن لفظ قرا اور آن سے مرکب ہے، قرء قرارت کا امر ہے، جس کے معنی پڑھ کے ہیں، اور آن کے معنی اب کے ہیں، دونوں لفظوں کے مرکب معنی یہ ہوئے، "پڑھ تو اب" آریہ محققین کی اس تحقیق کی داد ہمارے عربی مدارس کے میزان خواں طلبہ دیں گے،

نام کی ضرورت | مسئلۂ وجہ تسمیہ کے رو سے دنیا میں ہر چیز کے نام ہوتے ہیں، اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ایک شے دوسری شے سے ممتاز ہو جائے، تمام انسان، انسان ہونے کی حیثیت سے باہم مشترک اور غیر ممتاز ہیں، لیکن زید کے نام نے زید کو، خالد کے نام نے خالد کو، اور بکر کے نام نے بکر کو بالکل ایک دوسرے سے ممتاز اور الگ کر دیا، تمام کتابیں، کتاب ہونے کی حیثیت سے ایک ہیں، لیکن تورات کے نام نے تورات میں، انجیل کے نام نے انجیل میں اور زبور کے نام نے زبور میں باہمی امتیاز پیدا کر دیا ہے، اگر اعلام کے ذریعہ سے

اشیاء میں یہ باہمی امتیاز نہ ہوتا، تو انسان کو بات سمجھنا مشکل ہو جاتا، مخاطب کو یہ معلوم نہ ہو سکتا، کہ متکلم کس امر کے متعلق گفتگو کر رہا ہے، اس نتیجہ کی بنا پر ضروری تھا کہ قرآن مجید کا کوئی نام رکھا جاتا،

نام کا تناسب مسئلۂ وجوہ تسمیہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس شے کا نام رکھا جائے، اس نام کو اس شے سے کوئی خاص مناسبت ہو، گو اسم اور مسمی کا یہ باہمی تناسب عقلاً ضروری نہیں، کیونکہ نام سے اصلی غرض محض امتیاز ہے، اور وہ ہر طرح حاصل ہے، لیکن عقل اس تناسب کو مستحسن ضرور سمجھتی ہے، کیونکہ اس سے ایک فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے، کہ مناسبت قرینہ پر مخاطب کا ذہن متکلم کی زبان سے نام سنتے ہی مسمی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اس تناسب باہمی کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے، کہ اس قسم کے نام نہایت اختصار کے ساتھ اپنے مسمیات کے تمام مطالب اور غرض و غایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، گویا وہ عنوان کتاب ہیں، جو اپنے اندرونی مطالب کو ایک لفظ میں ادا کر رہے ہیں، فن بلاغت میں دو کتابیں ہیں: ایک کا نام اسرار البلاغۃ (راز ہائے بلاغت) اور دوسرے کا نام مطول (دراز تر) ہے، تم خود فیصلہ کر سکتے ہو، کہ فن بلاغت کی تصنیف کے لیے ان میں سے کون سا نام بہتر ہے اور کیوں بہتر ہے؟ —

علمائے اسلام کے چند افراد کی رائے ہے، جن میں امام شافعی بھی داخل ہیں کہ "قرآن مجید" کا نام قرآن کسی مناسبت سے نہیں، اور نہ یہ کسی مناسب

لفظ سے مشتق ہے، بلکہ قرآن کا نام، قرآن اسی طرح ہے، جس طرح انجیل اور تورات کا خدا نے انجیل اور تورات نام رکھ دیا ہے، اس رائے کی اصلی غلطی تو اس وقت ظاہر ہوگی، جب ہم یہ دکھلائیں گے، کہ قرآن مجید کا نام کس مناسبت سے قرآن رکھا گیا ہے، پہلے ہم اس کی تردید کرنا چاہتے ہیں، کہ تورات وانجیل وغیرہ کا نام بغیر کسی مناسبت کے تورات اور انجیل رکھا گیا ہے،

دیگر صحف انبیاء کے نام | انجیل یونانی لفظ ہے، اصل یونانی لفظ ہے جس کے لفظی معنی بشارت اور مژدہ کے ہیں۔ عیسائیوں کے

خیال کے مطابق انجیل کا نام مژدہ اس لیے ہے، کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کی بادشاہت کا مژدہ سناتے تھے، مسلمان کہتے ہیں، انجیل مژدہ اس لیے ہے کہ وہ پیغمبر اسلامؐ کی آمد آمد کی بشارت ہے، قرآن بآواز بلند کہہ رہا ہے،

اذ قال عیسی بن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد	یاد کر، جب عیسیٰ بن مریم نے بنی اسرائیل سے کہا، کہ میں تمہاری طرف خدا کا قاصد ہوں، میرے سامنے جو تورات ہے، اس کی میں تصدیق کر رہا ہوں، اور ایک ایسے رسول کی بشارت دے رہا ہوں جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا،
(الصف)	

تورات عبرانی لفظ (　　) ہے، تورات کے اصلی معنی

احکام، اوامر اور قوانین کے ہیں، چونکہ تورات سرتاپا قانون ہے، اس لیے اُس کا نام تورات ہوا، لفظ زبور عبرانی ہے، یا حبشی الاصل ہے، اصلی لفظ مزمور یا زمور ہے، عربی زبان میں زمور کی میم ب سے بدل گئی ہے، زمور گیت کو کہتے ہیں، زبور جن کو مزامیر داؤد کہتے ہیں، چونکہ وہ حضرت داؤدؑ کی مناجاتوں کا مجموعہ ہے، اس بنا پر اس کا نام زبور رکھا گیا ہے؛

الہامی کتابوں کے نام بھی الہامی ہونے چاہئیں

ہاں قرآن مجید اور دیگر صحف انبیاء کے ناموں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ دیگر صحف کے ناموں کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ہے، کہ ان کتابوں کے الہامی ہونے کے ساتھ ان کے نام بھی الہامی ہیں، حالانکہ ایک الہامی کتاب کے لیے ضروری ہے، کہ اس کے متعلق تمام چیزیں الہامی ہوں، دیگر صحف انبیاءؑ کے ناموں کے الہامی ہونے کا دعویٰ اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ان کتابوں میں ان کا نام کہیں مذکور نہیں ہوا ہے، اور کتابوں کے بارہ میں کسی الہام کا دعویٰ نہیں کر سکتے، انجیل کا نام بے شک ایک دو موقعوں پر انجیل میں آیا ہے، مگر کس طرح ؟ عربی انجیل میں اس کا نام تبشیر، بشریٰ اور بشارت ہے، انگریزی میں گاسپل ہے، یونانی میں انگلیان ہے، فارسی میں مژدہ ہے، اُردو میں خوشخبری ہے، اسی طرح دنیا کی اور زبانوں میں انجیل مختلف ناموں سے مشہور ہے، انجیل کی اصلی زبان کا نسخہ ناپید ہے، اس لیے یہ نہیں بتایا جا سکتا، کہ انجیل کا اصلی نام کیا تھا،

جس کے یہ ترجمے ہیں، یہ نقص صرف صحفِ بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ویدوغیرہ میں بھی پیدا ہے؛

لیکن قرآن مجید نہایت بلند آواز سے پکارتا ہے، کہ میرا نام قرآن ہے، اور ایک بار نہیں ساٹھ بار قرآن مجید نے پکار پکار کر کہا ہے، کہ میرا نام قرآن ہے، قرآن کے جو اور نام ہیں، ان کو بھی خود قرآن ہی نے ہم کو بتایا ہے، اس واقعہ کا نتیجہ کوئی معمولی نتیجہ نہیں ہے، اگر کسی دور میں عیسائیت روئے زمین سے فنا ہوجائے یا یہودیت مٹ جائے، یا آریہ نہ باقی رہیں، تو دنیا کو کون بتائے گا، یہ حضرت موسیٰؑ کی کتاب تورات ہے، وہ حضرت داؤدؑ کی کتاب زبور ہے، یہ حضرت عیسیٰؑ کا صحیفۂ انجیل ہے، یہ آریوں کی الہامی کتاب وید ہے، لیکن مسلمان روئے زمین سے فنا ہوجائیں، معدوم ہوجائیں تو بھی قرآن کا صفحہ صفحہ پکارے گا، کہ میں قرآن ہوں، مسلمان تمام دنیا میں پھیلے ہیں، مسلمان مختلف ممالک میں بیسیوں مختلف زبانیں بولتے ہیں، مسلمانوں نے اور زیادہ تر غیر مسلمانوں نے اکثر مہذب زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے کیے، مگر ہر جگہ اور ہر مقام پر اس کا نام قرآن رہا، ان واقعات سے متعدد نتائج مستنبط ہوتے ہیں،

(۱) جس طرح قرآن کے الفاظ و معانی الہامی ہیں، اس کے نام بھی الہامی ہیں،

(۲) جس طرح قرآن کو بلا تحریف و تبدیل بلا زیادت و نقص دائمی وجود عطا ہوا ہے، اسی طرح اس کے نام بھی دائم الوجود ہیں،

(۳) قرآن اپنے ثبوت میں اپنے پیرودں کا محتاج نہیں ہے۔

کثرتِ اسمائے قرآن مجید | قرآن مجید کے کثیر التعداد نام ہیں، خاص نام کے علاوہ قرآن مجید کے عام نام حسبِ تحقیق علامہ ابو المعالی شاید ۵۵ ہیں، اور یہ تمام نام خود قرآن مجید نے اپنے بتائے ہیں، اور نیز قرآن کا لفظ بھی قرآن مجید میں نہایت تکرار کے ساتھ آیا ہے، یہ کثرتِ اسماء، اور یہ تکرارِ لفظ قرآن ایک لطیف خطابی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے، دنیا میں قاعدہ ہے، کہ لوگ جس چیز کو محبوب رکھتے ہیں، اس کے ایک نام پر ان کو قناعت نہیں ہوتی، بلکہ محبت اور پیار سے وہ اس کو سیکڑوں ناموں سے یاد کرتے ہیں، اس کے ایک ایک نام کو بیسیوں بار دہراتے ہیں، ہر قوم اور ہر شخص کی زبان اور استعمال اس دعوے کے لیے شاہد عدل ہے، جس قوم میں جو چیز زیادہ محبوب ہوتی ہے، جس چیز کی زیادہ احتیاج ہوتی ہے، اس کے لیے اس کی زبان میں کثرت سے الفاظ ہوتے ہیں، جس شخص کو جو چیز زیادہ پیاری ہوتی ہے، زیادہ محبوب ہوتی ہے، اس کا نام بار بار لیتا ہے، خدا نے قرآن مجید میں جس کثرت اور جس تکرار سے قرآن مجید کے نام لیے ہیں، کیا اُس سے بھی یہی نتیجہ نہیں مستنبط ہوتا،

قرآن مجید کے عام نام | قرآن مجید نے اپنے جو عام نام بتائے ہیں، درحقیقت وہ اس کے عام صفات ہیں، مثلاً خدا نے قرآن میں جابجا اس کو ان ناموں سے یاد کیا ہے، کلام اللہ (خدا کا کلام) نور (روشنی) ہدیٰ (ہدایت) رحمۃ (رحمت)

شفاء (شفا) موعظۃ (نصیحت) ذکر (یاد) ذکر مبارک (مبارک ذکر) حکمت: (دانائی) حکمۃ بالغۃ (دل تک پہنچنے والی دانائی) مہیمن (گواہ) مصدق (گزشتہ صحف انبیاء کو سچا کرنے والا یا گذشتہ صحف انبیاء کو سچ کہنے والا) صراط مستقیم (راہِ راست) قیم (کفیل یا نگراں) قول فصل (قول فیصل یا حق و باطل کا فیصلہ کرنے والی کتاب) النبأ العظیم (خبر عظیم الشان) احسن الحدیث (سخن بہترین) روح (روح یا زندگی یا حیات) الوحی (الہامی کتاب) بصائر (دلائل بینائی) بیان (تفصیل کرنے والا تفسیر و توضیح کرنے والا) علم (دانش) حق (سچا، راست) ہادی (رہ نما، رہبر) تذکرہ (نصیحت) العروۃ الوثقیٰ (مضبوط وسیلہ) صدق (سچائی، راستی) منادی (پکارنے والا، آواز دینے والا) بشریٰ (خوش خبری) بشیر (خوش خبری دینے والا) نذیر (ڈرانے والا) بلاغ (پیغام) صحف (صحیفہ) احسن القصص (بہترین قصہ) کتاب (مجموعہ) کتاب مبارک (بابرکت کتاب) کتاب اللہ (خدا کی کتاب) کتاب منیر (نور بخشنے والی کتاب) الکتاب المبین، (ظاہر کرنے والی کتاب) الکتاب الحکیم (دانائی والی کتاب) کتاب عزیز، (پیاری کتاب، بڑی کتاب[1])

یہ صفات جو قرآن مجید کے نام کا کام دیتے ہیں، قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں وارد ہوئے ہیں، لغوی حیثیت سے یہ تمام الفاظ عربی ہیں، جن کے

[1] الاتقان سیوطی، فصل اسمائے قرآن۔

معنی ظاہر ہیں، ان اسمار کو قرآن مجید کے ساتھ کیا مناسبت ہے، اس کا بھی بیان کرنا ضروری نہیں، معنی پر ایک نظر ڈال کر، ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے، کہ ان میں سے ہر ایک نام کس وضاحت اور کس خوبصورتی اور کس اختصار کے ساتھ قرآن مجید کے صفات، قرآن مجید کے محاسن قرآن مجید کی غرض وغایت، قرآن مجید کے مقصود کی طرف اشارہ کر رہا ہے،

قرآن مجید کے مخصوص نام قرآن مجید کے مخصوص نام سے وہ نام مراد ہیں، جن کا اطلاق استعمال میں قرآن مجید کے سوا کسی اور پر نہیں ہوتا، اس قسم کے تین نام ہیں، فرقان مصحف اور قرآن، فرقان قرآن کا مشہور نام ہے، اس سے زیادہ مصحف اور ان دونوں سے مشہور تر قرآن ہے۔

فرقان قرآن مجید نے دو جگہ اپنے کو فرقان کے لفظ سے یاد کیا ہے،

تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہٖ	پاک ہے وہ ذات جس نے فرقان کو اپنے بندہ پر نازل کیا،

یہ آیت سورہ توبہ میں واقع ہے، دوسری آیت آل عمران میں ہے،

وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس وانزل الفرقان	اور تورات اور انجیل کو اس نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا اور فرقان کو نازل کیا،

قرآن مجید نے تورات کو بھی فرقان کے نام سے یاد کیا ہے،

ولقد اتینا موسی وھارون الفرقان۔ (انبیاء) — اور بے شک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان دیا۔

فرقان کس زبان کا لفظ ہے؟ اور اس کے کیا معنی ہیں، جارج سیل صاحب مترجم قرآن[1] کی بہت سے عبرانی علماء کی شہادتوں کی بنا پر رائے ہے کہ فرقان عبرانی سے ماخوذ ہے، یہود اپنی مذہبی کتاب کے اجزاء اور حصوں کو فرقہ اور فرق کہتے تھے، اسی لفظ سے اسلام نے اپنی مذہبی کتاب کے لیے فرقان کا لفظ اخذ کیا ہے،

ہم کو سیل صاحب کی اس رائے کے تسلیم کرنے میں کچھ عذر نہیں، لیکن پہلے وہ ہماری دو باتوں کا جواب دیں، فرقہ اور فرق یہود، توراۃ کے ایک جزء یا ایک باب کو کہتے ہیں، اگر فرقان فرقہ یا فرق سے ماخوذ ہوتا، تو زیادہ سے زیادہ وہ سورہ کے مقام پر بولا جاتا، لیکن اسلام کل قرآن مجید کو فرقان کہتا ہے، امر ثانی یہ ہے کہ جس طرح عبرانی میں فرقہ اور فرق حصہ اور ٹکڑے کے معنی میں ہے، جس کی مناسبت سے یہود اجزائے توراۃ کو فرقہ اور فرق کہتے ہیں، بعینہٖ اسی طرح یہ دونوں لفظ عربی زبان میں بھی اسی معنی میں آتے ہیں، خود قرآن مجید نے ان دونوں لفظوں کا انھی معنوں میں استعمال کیا ہے،

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین (توبہ) — پس کیوں نہیں ایک گروہ (قوم کے) ہر حصہ سے ہو، جس میں ایک جماعت ہو، کہ وہ

---

[1] دیباچہ انگریزی ترجمہ قرآن سیل باب ۳،

مذہب میں سمجھ حاصل کرے۔

فکان کل فرق کالطود العظیم، 　　　ہر حصہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح تھا،

(شعراء)

ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوتا ہے، کہ یہ دونوں لفظ اسی معنی میں عربی زبان میں مستعمل ہیں، ایسی حالت میں اسلام کو کیا ضرورت تھی، کہ وہ ان دو مستعمل لفظ یعنی "فرقہ" اور فرق کو چھوڑ کر ان سے ایک دوسرا غیر مستعمل لفظ یعنی "فرقان" پیدا کرے،

بعض علمائے اسلام کہتے ہیں، کہ قرآن کے معنی حصہ کرنے اور تقسیم کرنے ہیں، چونکہ قرآن مجید منزل، پارہ، سورہ، رکوع اور آیت پر منقسم ہے اس لیے اس کو فرقان کہتے ہیں، ہم اس کا انکار نہیں کرتے، کہ فرقان کے یہ معنی نہیں ہیں، لیکن ہم اس کو کچھ زیادہ مناسب وجہ نہیں سمجھتے،

ہمارا اعتقاد ہے، کہ قرآن اپنے ہر معنی کی تفصیل آپ کرتا ہے، اس لیے فرقان کے معنی بھی ہم کو خود فرقان میں ڈھونڈنا چاہیے، یہ ظاہر ہے کہ فرقان مصدر ہے اب اس کے مشتق معنی قرآن مجید میں دیکھو،

فالفارقات فرقاً۔ (مرسلات) 　　　قسم ہے اُن چیزوں کی جو حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی ہیں،

اس آیت سے فارق کے معنی فیصلہ کن یا ممیز کے ثابت ہوتے ہیں، فرقان

کے معنی کی توضیح کے لیے سورۂ انفال کی یہ آیت پڑھو،

ان کنتم آمنتم باللہ و ما انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان (انفال - ۵)	اگر تم ایمان لائے ہو خدا پر اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر اُس دن اتارا جو دن حق و باطل میں فیصلہ کرنے کا تھا،

اس آیت میں جنگ کو "یوم الفرقان" سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ درحقیقت اس جنگ نے حق و باطل اور کفر و اسلام کا فیصلہ کر دیا، ان آیات سے ثابت ہو گیا، کہ فرقان کے معنی فیصلہ کرنے یا حق و باطل میں تمیز دینے کے ہیں، فرقان مصدر ہے، عربی زبان میں مصدر اکثر اسم فاعل کے معنی بھی دیتا ہے، یہ آیت دیکھو،

یا ایہا الذین آمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا۔ (انفال - ۴)	ایمان والو! اگر خدا سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لیے فرقان بنا رہے گا،

اس آیت پاک میں فرقان جو مصدر ہے " فارق " کے معنی میں ہے، جو اسم فاعل ہے، اس بنا پر یہاں فرقان کے معنی فیصلہ کن یا حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی قوت اور ممیز یا قوت ممیزہ کے ہیں، اب دیکھو آیت کے معنی کس قدر صحیح اور درست ہیں،

یا ایہا الذین آمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا۔ (انفال - ۴)	مسلمانو! اگر خدا سے ڈرو گے تو وہ تم کو ضمیر فیصلہ یا قوتِ ممیزہ عطا کرے گا،

فرقان، اس موخر الذکر معنی میں قرآن میں کئی جگہ آیا ہے،

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتَابَ وَالْفُرْقَانَ (بقرہ - ۶)　　اور یاد کر جب ہم نے موسیٰ کو کتاب (توراۃ) اور قوتِ فیصلہ دی،

ظاہر ہے، کہ یہاں فرقان سے مراد تورات نہیں ہے، کیونکہ تورات کی تعبیر تو لفظ کتاب سے ہو چکی، اس لئے لامحالہ یہاں فرقان کے دوسرے معنی لینے ہوں گے۔ اور یہ وہی معنی ہیں جن کو ہم ضمیر، فیصلہ، روحِ تمیز، قوتِ تمیز بین الحق والباطل سے ادا کرتے ہیں،

ان تمام آیات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ فرقان کے معنی فیصلہ کرنے یا فیصلہ کرنے والے کے ہیں، جب کسی کتاب کو فرقان کہا جائے گا، تو اس کے معنی حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی کتاب کے ہوں گے، اس تحقیق کے بعد اس سوال کا جواب دینا ہے کہ تمام قرآن مجید میں فرقان کا تورات اور قرآن کے سوا کسی دوسرے نبی کے صحیفہ پر کیوں نہیں اطلاق ہوا؟ واقعہ یہ ہے کہ قرآن اور تورات کے سوا عموماً تمام صحفِ انبیأ صرف اخلاقی اور روحانی احکام پر مشتمل ہیں، تورات اور قرآن مجید میں اخلاق اور روحانیت کے علاوہ قانون اور لا کا بھی ذکر ہے، حق و باطل میں فیصلہ کرنا قانون اور لا کا فرض ہے، یہی وجہ ہے کہ فرقان کا نام خدا نے صرف اُن صحیفوں کو عطا کیا ہے، جو قانون پر مشتمل ہوں، لیکن چونکہ قرآن میں قانون کے ساتھ اخلاقی احکام بھی بکثرت ہیں، اور تورات

میں بھی قانون کے ساتھ ساتھ کسی قدر اخلاق کی تعلیم ہے، اس لیے تورات اور قرآن کو فرقان کے ساتھ ہدی اور ضیاء بھی خدا نے فرمایا ہے، تورات کے متعلق ہے،

ولقد اٰتینا موسیٰ وھارون　　اور بے شک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو
الفرقان وضیاء (انبیاء-۴)　　فیصلہ اور روشنی دی،

فیصلہ سے مراد قانون اور روشنی سے مراد اخلاقی اور روحانی احکام ہیں، دوسری آیت قرآن کی شان میں ہے،

شھر رمضان الذی انزل فیه　　ماہ رمضان جس میں لوگوں کی ہدایت کے لیے
القراٰن ھدی للناس وبینٰت　　قرآن اتارا گیا، اس حال میں کہ وہ نشانیاں
من الھدی والفرقان (بقرہ)　　ہیں، ہدایت اور فیصلہ کی،

ہدی سے مراد اخلاقی و روحانی تعلیمات اور فرقان سے قانون ہے، یہاں پر ایک نکتہ اور سمجھنے کے لائق ہے، تورات کی تعریف میں فرقان یعنی قانون کا لفظ پہلے آیا، اور ضیا یعنی روشنی کا لفظ بعد کو آیا، اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے، کہ تورات کا مقصود اول قانون اور مقصود ثانی اخلاق ہے، لیکن قرآن کی تعریف میں پہلے دو بار ہدی یعنی ہدایت کا لفظ آیا، اور آخر میں اس کو فرقان یعنی قانون کہا گیا، اس سے کنایۃً یہ بات مفہوم ہوتی ہے، کہ روحانیت اور اخلاق قرآن کا مقصد اولین اور قانون و ملک داری اس کا مقصد دوم ہے،

مصحف قرآن مجید کو مصحف بھی کہتے ہیں، لیکن یہ نام قرآن مجید میں نہیں آیا ہے، اس لیے یہ قرآن کا الہامی نام نہیں ہے، روایات میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب قرآن کاغذ پر مجموعی طور سے لکھا گیا، تو حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ اس کے لیے کوئی مناسب نام تلاش کرو، بعض لوگوں کی رائے ہوئی، کہ اس کا نام سفر رکھا جائے، لیکن اکثر لوگوں نے اس کو ناپسند کیا، ناپسندیدگی کی وجہ یہ تھی، کہ یہود بھی اپنی مذہبی کتاب کو سفر کہتے ہیں، سفر کتاب کو کہتے ہیں، اس کی جمع اسفار ہے، یہودی اور عیسائی اب تک اجزائے تورات کو اسفار بحالت جمع اور سفر بحالتِ مفرد کہتے ہیں، صحابہؓ میں سے وہ لوگ جنھوں نے حبشہ کا سفر کیا تھا، انھوں نے اہلِ حبشہ کو، اپنی مذہبی کتاب کو مصحف کہتے سُنا تھا، اس لیے (باختلافِ روایات) ان حضرات نے عموماً یا ان میں حضرت عبداللہؓ ابن مسعود نے یا سالم غلام ابوحذیفہؓ نے کہا کہ اس کا نام مصحف رکھا جائے، لوگوں نے پسند کیا، اور اس وقت سے قرآن مجید کو مصحف کہا جانے لگا، لفظ مصحف کے حبشی الاصل ہونے پر اس وقت بھی شہادت موجود ہے، مسٹر آرنلڈ اپنی کتاب سوار السبیل فی معرفۃ المعرّب والدخیل میں لکھتے ہیں، کہ مصحف حبشی لفظ ہے، اس کی اصل حبشی زبان میں مصحف ہے، مصحف حبشی زبان میں کتاب کو کہتے ہیں،

لیکن ہمارے نزدیک صحابہؓ کا قرآن مجید کو مصحف کہنا صرف اہل حبشہ

کی تقلید و متابعت پر مبنی تھا، ورنہ ظاہر ہے، کہ جب انھوں نے یہود کے تشابہ سے بچنے کے لیے قرآن کا نام سفر نہیں رکھا، تو اہلِ حبشہ کی تقلید میں جو عیسائی تھے، قرآن کو مصحف کیوں کہتے، بلکہ اصلی وجہ یہ ہے، کہ مصحف، صحاف کا صیغہ مفعول ہے، اصحاف صحیفہ سے ماخوذ ہے، صحیفہ چند اوراق کو کہتے ہیں، اصحاف کے معنی اوراق بندی یعنی منتشر اوراق کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کرنے کے ہیں، اس بنا پر مصحف اُن منتشر اوراق کو کہتے ہیں، جو مرتب کرکے کسی کتاب کی صورت میں جمع کر دیے جائیں، عربی زبان کا مستند لغوی ابن مکرم مصنف لسان العرب لکھتا ہے[1]،

المصحف الجامع للصحف المکتوبۃ بین الدفتین۔	مصحف اس کو کہتے ہیں، جو لکھے ہوئے اوراق کو دو دفتیوں میں جمع کرنے،

یہی مصنف آگے چل کر مصحف کے متعلق مشہور نحوی فرار کی رائے نقل کرتا ہے،

قال مصحف من اصحف ای جمعت فیہ الصحف۔	مصحف، صحف سے ماخوذ ہے یعنی اس کے اوراق جمع کیے گئے،

مشہور لغوی ازہری کی تحقیق ہے،

---

[1] لسان العرب جلد ۱۲ ص ۸۸

وانما سمی المصحف مصحفا لانہ — مصحف کا مصحف اس لیے نام ہے کہ اس کی
اصحف ای جعل جامعا للصحف — اوراق بندی کی گئی، یعنی دو دفتیوں میں
المکتوبۃ بین الدفتین[۱] — لکھے ہوئے اوراق کا جامع ہے،

ان ائمہ لغت کی شہادت سے مصحف کے معنی بالکل واضح ہو گئے، قرآن مجید عہدِ رسالت میں تحریری حیثیت سے اجزاء اور اوراق میں یک جا مرتب نہ تھا، اس لیے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جب قرآن اجزاء اور اوراق میں تحریری حیثیت سے مرتب ہو کر کتاب کی صورت میں آیا، تو مقتضائے واقعہ کے لحاظ سے اس کے لیے مصحف سے زیادہ موزوں نام نہیں ہو سکتا تھا، اب یہ عقیدہ بھی نہایت آسانی سے حل ہو سکتا ہے، کہ قرآن میں، قرآن کا نام مصحف کیوں نہیں آیا، حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا عہدِ رسالت میں نزول ہو رہا تھا، وہ اس وقت مصحف نہ تھا، یعنی مرتب کتاب نہ تھا، اور نہ ہو سکتا تھا، کیونکہ عہدِ رسالت میں قرآن کی وحی ختم نہیں ہو سکی تھی، اس بنا پر۔۔۔ قرآن کا نام، قرآن میں مصحف مذکور ہونا خلافِ واقعہ تھا، ہاں قرآن اس وقت صحف (اوراق) تھا، اس لیے قرآن نے اپنے کو صحف کے نام سے یاد کیا ہے،

کلا انھا تذکرۃ فمن شاء ذکرہ — ہرگز نہیں، یہ نصیحت ہے، جو چاہے اس کو
فی صحف مکرمۃ مرفوعۃ مطھرۃ — (عبس) یاد رکھے (یہ نصیحت) ایسے صحف میں ہے

[۱] لسان العرب جلد ۱۲ ص ۸۸

جو بزرگ، بلند اور پاک ہیں،

قرآن | قرآن کا مشہور تر اور حقیقی نام قرآن ہے، اور خود قرآن کہتا ہے کہ میں قرآن ہوں،

انه لقرآن کریم (واقعہ) بے شک یہ کتاب بزرگ قرآن ہے،

بل ھو قرآن مجید (بروج) بلکہ یہ کتاب قرآن مجید ہے،

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم (اسرائیل-۱) بے شک یہ قرآن اس بات کی ہدایت کرتا ہے جو بات بہت سیدھی ہے،

واوحی الی ھذا القرآن (انعام) اور وحی کیا گیا میری طرف یہ قرآن،

وان ھذا القرآن یقص (نمل) بے شبہ یہ قرآن بیان کرتا ہے،

اسی طرح قرآن مجید میں ساٹھ مرتبہ قرآن کا بلفظہ قرآن ذکر ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا اصلی نام قرآن ہے، اس کے بعد یہ تحقیق طلب امر ہے، کہ قرآن کس زبان کا لفظ ہے، اس کا کیا تلفظ ہے، اس کے کیا معنی ہیں، جارج سیل صاحب ہم کو پھر مشورہ دیتے ہیں، کہ قرآن عبرانی لفظ ہے، یہود پہلے یسعیاہ نبی کی کتاب کو قرا یا مقرا کہتے تھے، اور پھر مجموعۂ تورات کو قراہ یا مقرا کہنے لگے، قرآن اسی قراہ یا مقراہ سے بنایا گیا ہے[۱] ہم کہتے

---

[۱] دیباچہ ترجمۂ انگریزی قرآن مع نوٹ نمبر ا باب ۳

ہیں، کہ قراہ یا مقراہ کے عبرانی میں "پڑھنے" کے معنی ہیں جس کے مقابل اور ہم جنس عربی میں لفظ "قرآت" ہے، اس بنا پر کلام مجید کا نام اگر عبرانی قراہ سے ماخوذ ہوتا، تو اس کا نام قرآن نہ ہوتا، قراءة ہوتا، گو اس میں شک نہیں کہ بعض علمائے اسلام بھی قرآن کو قرء کا مصدر کہتے ہیں، جس کے معنی پڑھنے کے ہیں، لیکن یہاں بحث معنی سے نہیں ہے لفظ سے ہے،

عربی زبان کے ائمۂ لغت لفظ قرآن کی تحقیق میں مختلف الآراء ہیں، سب سے پہلا اختلاف یہ ہے کہ قرآن کا صحیح تلفظ قُرآن بروزن فعلان ہے، یا قران بروزن فعال ہے، جو گرچہ شق ثانی کا طرف دار ہے اس کی بھی دو جماعتیں ہیں، امام شافعی کہتے ہیں کہ صحیح قرارت قُران بروزن فعال ہے، اور نیز قران کسی مصدر یا اصل سے مشتق نہیں ہے، بلکہ خدا نے یوں ہی ایک لفظ کلام مجید کے نام کے لیے وضع کر دیا ہے، اس لیے سوائے نام ہونے کی حیثیت کے اور سوائے علمیت کے قرآن کے کوئی اور لغوی معنی نہیں جس کی مناسبت سے قران کا قرآن نام رکھا گیا ہو، فراء اور امام اشعری امام شافعی کے ساتھ یہاں تک تو شریک ہیں کہ صحیح لفظ قران بلا ہمزہ ہے، لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے، کہ اس لفظ کی از روئے لغت کوئی اصل نہیں، یا بجز علمیت اس کے کوئی اور مناسب معنی نہیں، اسی کے ساتھ فراء اور امام اشعری کی یہ بھی رائے ہے کہ قرآن میں نون اصلی نہیں ہے، یہاں پہنچ کر فراء اور اشعری میں ایک اور اختلاف شروع

ہوتا ہے،

امام اشعری کہتے ہیں، قران، قرن سے مشتق ہے، قرن کے لغوی معنی "ملانے" کے ہیں، چونکہ قرآن، سور، آیات اور حروف وغیرہ کو باہم ملاتا ہے، اس لیے اس کا نام قرآن رکھا گیا، فرار کی رائے ہے، قرآن قرائن سے ماخوذ ہے۔ قرائن قرینہ کی جمع ہے، قرینہ کے معنی "دلیل اور تشبیہ" کے ہیں، چونکہ قرآن کی ہر آیت دوسری آیت کی مفسر اور دلیل ہے، اور نیز قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کے اکثر مشابہ ہے، اس لیے اس کو قرآن کہتے ہیں،

امام شافعی کی رائے جمہور ائمۂ لغت کے خلاف ہے، اس لیے قابلِ تسلیم نہیں، تمام کتب لغت میں قرآن کے معنی اور تحقیق موجود ہے، جس سے اس قول کی پوری تردید ہوتی ہے، امام اشعری کی تحقیق اولاً صرف اسی حالت میں صحیح ہوسکتی ہے، جب قرآن کا صحیح تلفظ قُران ہو، حالانکہ قراءتِ مشہورہ میں صحیح روایت قرآن ہے، اور زجاج نحوی کی تحقیق کی بنا پر جس قراءت میں لفظ قران ہے، وہ بھی دراصل قرآن ہے، ہمزہ تخفیفاً ساقط کر کے اس کی حرکت ماقبل کو منتقل کردی گئی ہے، ثانیاً حروف، آیات، اور سور کے اجتماع اور اتصال کی بنا پر قرآن کو قرآن کہنا کوئی مستحسن اور قبول خاطر وجہ نہیں ہے، فرار کی رائے قطعی غلط ہے، اگر اس کی رائے کا اعتبار کیا جائے، تو اس کی تعلیل کی بنا پر صحیح لفظ قرآن ہوگا، جو عام متواتر روایت کے خلاف ہے، اسی بنا پر

زجاج نے فراء کی اس تحقیق کی ہنسی اڑائی ہے،

ان چند اشخاص کے علاوہ تمام ائمۂ لغت قراءۃ اور مفسرینِ قرآن بروزن فعلان پڑھتے ہیں، اور اس امر پر بھی ان کا تقریباً اتفاقِ عام ہے، کہ قران، نقصان، غفران وغیرہ کی طرح مصدر ہے، زجاج اور ان کے بعض ہم زمانوں کی رائے ہے، کہ قران صیغۂ وصف ہے، لیکن بہرحال یہ کوئی جوہری اختلاف نہیں ہے، جو لوگ اس کو مصدر سمجھتے ہیں، وہ بھی معنیً اس کو صیغۂ وصف مانتے ہیں، لیکن اشکال یہ ہے، کہ ازروئے لغت قرآن دو لفظوں سے ماخوذ ہو سکتا ہے، پہلا قرء، قراءۃ و قرآناً ہے، اس کے معنی پڑھنے کے ہیں، دوسرا قرء، قرءاً و قرآناً ہے، جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اربابِ علم نے دونوں راہیں اختیار کی ہیں، اور لفظ قران کی تحقیق کے متعلق درحقیقت یہی دونوں راہیں درست ہیں [۱]

(۱) پہلے معنی کے طرفدار قدما میں حضرت [۲] ابن عباسؓ اور متاخرین میں [۳] لحیان (ایک مشہور نحوی) اور چند اشخاص ہیں، ان کے نزدیک یہاں مصدر وصف مفعول کے معنی میں ہے، یعنی قران مقروء کے معنی میں ہے، اس بنا پر اس گروہ کی تحقیق میں قرآن کو قران اس لیے کہتے ہیں، کہ وہ بار بار پڑھا

---

[۱] ان مختلف اقوال کے لیے دیکھو اتقان فصل ۱۷، اور تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۸۳ [۲] ابن جریر طبری ج ۲۹ ص ۱۰۲ [۳] اتقان فصل مذکورہ

جاتا ہے، اور اس کی تلاوت کی جاتی ہے، دیگر صحیفوں کو تلاوت کا شرف حاصل نہیں ہے؛ اس تحقیق کے رو سے اُردو یا انگریزی میں لفظ قران کا مناسب ترجمہ ریڈر ہو سکتا ہے جس کے بعد علومِ عالیہ کی تحصیل جو مقصود بالذات ہے، شروع ہو جاتی ہے،

صحفِ سابقہ کو اپنی پرائمر ہونے کا خود اقرار ہے؛ حضرت عیسیٰؑ انجیل کے متعلق کہتے ہیں۔

میری اور بہت سی باتیں ہیں، کہ تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے ہو، لیکن وہ یعنی سچائی کی رُوح آوے تمہیں ساری کی راہ بتا دے گی؛

(یوحنا ۱۶، ۱۲، ۱۳ اُردو انجیل مطبوعہ لندن)

اسلام کہتا ہے وہ سچائی کی رُوح میں ہوں، میں عیسیٰؑ کی ادھوری باتیں اور ان کی پرائمری کورس کو مکمل کرنے آیا ہوں،

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ (مائدہ)	آج میں نے تمہارا مذہب مکمل کر دیا، اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں، اور تمہارے لیے مذہب کی رو سے اسلام کو پسند کیا،

(۲) قرآن کو دوسرے معنی یعنی جمع کرنے کے معنی میں لینے پر جمہور مفسرین اور ماہرینِ لغت کا اتفاق ہے، اور درحقیقت یہی صحیح بھی ہے،

ذهب اکثرون الی انه (ای القرآن) مشتق من القرء وهو الجمع (تفسیر فتح البیان جلد ا ص ۳۲)

اکثر لوگ اس بات کی طرف گئے ہیں، کہ قرآن قرء سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں؛

اس عام جماعت کے علاوہ ہم مزید تحقیق کے لیے قدمائے مفسرین واہلِ لغت کے اقوال بھی سنداً پیش کرتے ہیں،

ان قتادة وجه معنی القرآن الی الجمع (تفسیر طبری ج ۲۹ ص ۱۰۲)

حضرت قتادہ نے قرآن کے معنی توجیہ جمع کرنے کے ساتھ کی ہے،

قال ابو اسحاق الزجاج فی تفسیر...... معنی القرآن الجمع (تاج العروس ج ا ص ۱۰۳)

ابواسحاق زجاج نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔

قال الزجاج وابوعبیدة انه ماخوذ من القرء وهو الجمع، (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۸۳)

زجاج اور ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ قرآن قرء سے ماخوذ ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں،

(قال ابن الاثیر) الاصل فی هذه اللفظة۔ (نہایہ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۶۳)

ابن اثیر نے کہا ہے کہ قرآن کے اصل معنی جمع کرنے کے ہیں،

وقال الراغب (وهو الاصفهانی) ... وانما سمی قرآنا لکونه جمع

راغب اصفہانی نے لکھا ہے: قرآن کو قرآن اس لیے کہتے ہیں، کہ اس نے جمع

(اتقان ص ۱۱۹ کلکتہ) ... کیا ہے ...

جاہلی شاعر عمرو بن کلثوم کا شعر ہے

ذراعی عیطل ادماء بکر ... هجان اللون لم تقرأ جنینا

(وہ تمہیں) ... اونٹنی کی طرح ہاتھ (دکھلائیگی) جو گندم گوں، پہلوٹی، صاف رنگ ہو اور جس نے اپنے پیٹ میں کوئی بچہ نہیں جمع کیا،

سنان بن الفحل طائی کہتا ہے،

ولکنی نصبت لهم جبینی   وآلة فارس حتی قریت[1]

لیکن میں نے اپنی پیشانی کو اور سوار کے ہتھیار کو ان کے لیے نشانہ بنایا، یہاں تک کہ پانی جمع کر لیا،

مفسرین کے اقوال، ائمۂ لغت کی تصریحات اور شعرائے جاہلیت کے استعمال سے گو قرآن کے معنی بالکل واضح ہو گئے، لیکن قرآن مجید اپنے معنی کی توضیح میں غیر کا محتاج نہیں، وہ اپنے معنی کی توضیح آپ کرتا ہے۔

خدائے پاک فرماتا ہے،

ان علینا جمعه وقرانه (قیامہ)   بیشک اس کا اکٹھا اور جمع کرنا ہم پر ہے۔

---

[1] قرأت اور قریت دونوں جائز ہے، ...

اس تفصیل کے بعد کہ قرآن کے معنی جمع کے ہیں، اور نیز جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ قرآن یا مصدر بمعنی وصف ہے، یا خود صیغہ وصف ہے، یہ ثابت ہوگیا۔ کہ قرآن کے معنی جامع (جمع کرنے والا) کے ہیں، اب آخری مرحلہ یہ ہے کہ قرآن کو جامع کیوں کہتے ہیں، علمائے اسلام نے اس سوال کے تین جواب دیئے ہیں،

ابو اسحاق النحوی یسمی کلام اللہ تعالیٰ الذی انزله علی نبیه صلی اللہ علیه وسلم کتابا وقرآنا وفرقانا ومعنی القران جمع القران، وسمی قرآنا لانه یجمع السور فیضمها۔

ابو اسحاق نحوی: خدا کا وہ کلام جس کو اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا، اس کا نام قران اور فرقان رکھا گیا ہے، قرآن کے معنی جمع کے ہیں، اور قران اس لیے نام رکھا گیا ہے کہ وہ سورتوں کو باہم جمع کرتا ہے، اور ملاتا ہے

(لسان العرب ج ا ص ۱۲۳)

(۲) ابن الاثیر: وسمی القرآن لانه جمع القصص والامر والنهی والوعد والوعید۔

ابن اثیر: قرآن کا نام قرآن اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ قصص امر ونہی، وعدہ وعید سب کا جامع ہے،

(نہایہ ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۶۳)

یہ دونوں جواب تسمیہ قرآن کے مناسب وجوہ نہیں ہیں، کسی بلند رتبہ

کتاب کے لیے فصول والواب یا وعدہ وعید وامر ونہی کی جامعیت کوئی فضیلت نہیں رکھتی، بلکہ اصلی اور حقیقی وجہ قرآن کو جامع کہنے کی بقول امام راغب یہ ہے:

(۳) قال الراغب انما سمی قرآنا لکونہ جمع ثمرات الکتب السالفۃ المنزلۃ۔ (اتقان کلکتہ ص ۱۱۹)	قرآن کا اس لیے قرآن نام ہے کہ وہ تمام گذشتہ منزل من اللہ کتابوں کے نتائج کا جامع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا قرآن یعنی جامع سے بہتر نام نہیں ہو سکتا، مذہب اسلام دنیا کا کامل مذہب ہے، اس لیے اس کی کتاب کو جامع ہونا چاہیے، تورات قانون ہے، انجیل اخلاق ہے، اور زبور حمد وثنا اور مناجات ہے، لیکن قرآن قانون بھی ہے، قرآن اخلاق بھی ہے، قرآن ادعیہ ومناجات بھی ہے، قرآن تمام دنیا کی صحیح مذہبی کتابوں کا خلاصہ ہے، قرآن تمام صحف آسمانی کی روح ہے، قرآن انسان کی ہر قسم کی حاجتوں کا سامان ہے، قرآن ہر قسم کی ضروریات کا کفیل ہے، قرآن دین ودنیا کی ہر راہ کا مشعل ہے، قرآن عقائد، عبادات، معاملات، روحانیت، اخلاق، قانون، تمدن، معاشرت، سیاست، غرض ہر قسم اور ہر نوع کی تعلیمات اور ان کے اصول وفروع کا جامع ہے، کیا اس جامعیت میں دنیا کی کوئی مذہبی کتاب اس کا مقابلہ کر سکتی ہے، اور اگر نہیں کر سکتی تو ایسی حالت میں قرآن کا قرآن سے بڑھ کر کوئی جامع نام دوسرا نہیں ہو سکتا۔

(الندوہ اگست ۱۹۱۱ء)

مکررات القرآن

یعنی

قرآن مجید میں مکرر آیتیں کیوں ہیں

ایک دن نواب صدیق حسن خاں کی تفسیر دیکھ رہا تھا کہ اس عبارت پر نظر پڑی،

وقد نبغت فی ھذا الزمان اس زمانہ میں ایک فرقہ پیدا ہوا ہے جو اپنی طائفۃ تفسیر القرآن برایھا رائے سے قرآن کی تفسیر کرتا ہے، اور مکرر وتحذف منہ الآیات آیتوں کو قرآن سے خارج سمجھتا ہے، اس المتوالیات تسمی بالنیفرنیۃ فرقہ کا نام نیفریہ (نیچری) ہے۔

کیا ہندوستان میں کوئی ایسا فرقہ بھی ہے، جو مکرر آیتوں کو خارج از قرآن سمجھتا ہو؟

مخالفین اسلام کا قرآن مجید کے اسلوب بلاغت پر ایک اعتراض یہ ہے، کہ قرآن مجید میں ایک ہی قصہ مکرر سہ کرر بیان ہوتا ہے، ایک ہی آیت بار بار آتی ہے، ایک ہی بات سو سو دفعہ دُہرائی جاتی ہے، اس بار بار کی

تکرار سے کیا حاصل؟ اس سے کلام کا لطف جاتا رہتا ہے، اور کلام بدمزہ ہو جاتا ہے، پوری کتاب میں ایک بات کو ایک دفعہ کہہ دینا کافی ہے، قرآن مجید میں حضرت آدمؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ کے قصے ہر جگہ بیان کیے گئے ہیں، سورۂ الرحمٰن میں فبای آلاء ربکما تکذبان اور سورۂ المرسلات میں ویل یومئذ للمکذبین، ایک ایک آیت کے بعد ہے، اور بعض جگہ بالکل بے جوڑ ہے، لیکن یہ اعتراض کوئی نیا اعتراض نہیں، علمائے اسلام نے اس کے متعدد وجوہات دیے ہیں، علامہ کرمانی المتوفی ۵۰۶ھ نے ایک مستقل رسالہ اس باب میں لکھا ہے، جس میں انھوں نے اپنا نظریہ یہ قرار دیا ہے، کہ قرآن میں کوئی مکرر بات نہیں، جہاں جہاں قرآن مجید میں بظاہر ایک ہی معنی مکرر معلوم ہوتے ہیں، وہاں یہ ثابت کیا ہے، کہ ہر جگہ مختلف معنی مراد ہیں، اس لیے یہ اعتراض ہی غلط ہے، کہ قرآن مجید میں ایک ہی بات بار بار آئی ہے،

مثنوی میں مولانا رومؒ نے اس اعتراض کا ایک اور جواب دیا ہے، جو گو شاعرانہ استدلال ہے، مگر نہایت لطیف ہے، وہ کہتے ہیں ہم روزانہ دن رات ایک ہی کھانا کھاتے ہیں، اور ایک ہی قسم کا پانی پیتے ہیں، لیکن ہم کو کبھی اس بات کی شکایت نہیں ہوتی، کہ بار بار ہم ایک ہی کھانا اور ایک ہی قسم کا پانی کیوں پیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے، کہ جب ہم کھانا کھاتے یا پانی پیتے ہیں، تو ہم کو ایک نئی بھوک اور نئی پیاس معلوم ہوتی ہے، اس لیے ہر وقت

کے پانی میں ہم کو ایک نیا لطف ملتا ہے، اور ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ تو وہی پانی ہے جو ہم بار بار پی چکے، اب اس میں کیا مزہ رہا، اسی طرح جو لوگ تشنۂ ایمان ہیں اور جن کو سرچشمۂ ایمان کی تلاش ہے، ان کو ہر آیت میں ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے، اور ایک نئی لذت ملتی ہے، اس لیے ان کو تکرار بدمزہ نہیں معلوم ہوتی۔

غرر و درر میں شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ (المتوفی ۴۳۶ھ) نے اور فوز الکبیر میں شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی تکرارات قرآن پر مفصل بحثیں کی ہیں، لیکن اصل یہ ہے، کہ قرآن مجید میں جو تکراریں ہیں، وہ مختلف قسم کی ہیں، اور ان بزرگوں نے جو جوابات دئیے ہیں، وہ صرف خاص خاص قسم کی تکراروں کے متعلق ہیں، اس لیے اوّل ہم یہ بتانا چاہتے ہیں، کہ قرآن مجید میں کس کس قسم کی تکرار ہے،

قرآن مجید کو غور سے شروع سے آخر تک پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس میں دو قسم کی تکرار ہے، لفظی تکرار اور معنوی تکرار۔

۱۔ معنوی تکرار سے یہ مقصود ہے کہ ایک ہی مفہوم اور ایک ہی معنی کو خاص الفاظ کی پابندی کے بغیر بار بار کہنا، قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ یا نماز کی تاکید مختلف الفاظ میں جا بجا آئی ہے، لیکن ان معنوں کے ادا کرنے کے لیے کوئی خاص عبارت نہیں اختیار کی گئی ہے، بلکہ مختلف طرز اور مختلف طریقوں سے ایک ہی مفہوم کو ادا کیا گیا ہے،

۲۔ لفظی تکرار سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی مفہوم کو کسی خاص عبارت

اور الفاظ کے ساتھ بار بار ادا کرنا مثلاً سورۂ رحمٰن میں فبای آلآء ربکما تکذبان کی تکرار، شریف مرتضیٰ کا جواب اسی تکرار سے متعلق ہے، ہم پہلے معنوی تکرار کو بیان کرتے ہیں،

معنوی تکرار عموماً چند موقعوں پر ہے، بعض خاص خاص قصوں کی تکرار مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کا قصہ اور بعض خاص خاص فرائض اور عقائد کی تکرار مثلاً نماز توحید و معاد کا بیان، خدا کے صفات و احسانات اور مظاہر قدرت کا ذکر،

تکرار قصص | قرآن مجید میں جو قصے مذکور ہیں، وہ دو قسم کے ہیں، بعض قصے ایسے ہیں، جن کا بیان قرآن مجید میں دہرا دہرا کر آتا ہے، مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے قصے، اور بعض قصے ایسے ہیں، جن کا ذکر کہیں ایک موقع پر آگیا ہے، اور دوسری مرتبہ بالکل نہیں ہوا، مثلاً ذوالقرنین، اصحاب کہف، حضرت یوسفؑ، حضرت یونسؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت طالوتؑ وغیرہ کے قصے (صلوات اللہ علیہم اجمعین)

جن انبیاء علیہم السلام کے قصے بار بار آئے ہیں، وہ صرف چار ہیں، حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ،

اس کے متعلق دو باتیں قابلِ غور ہیں، اولاً یہ کہ انہی چار انبیاء کے قصے دہرائے گئے ہیں، ثانیاً یہ کہ ان کے دہرانے کی ضرورت کیا ہے،

سب سے پہلے ہم کو اس پر غور کرنا چاہیئے، کہ قرآن مجید میں اس کثرت سے

قصے کیوں مذکور ہیں، اصل یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں داخل ہے، کہ وہ غیروں کے حالات اور سرگذشت سے بالطبع نصیحت حاصل کرتا اور متاثر ہوتا ہے، اس بنا پر قرآن مجید اور تمام کتب سماوی میں جا بجا قصے مذکور ہیں جن سے یہ ثابت ہے کہ قومیں خدا کی نافرمانی سے کس قدر مبتلائے آلام ہوتی ہیں، اور نیک نفس قوموں کو خدا کس قدر عروج و راحت عطا کرتا ہے، لیکن چونکہ اس قسم کے قصے جب تک بار بار کان میں نہ ڈالے جائیں، ان سے صحیح عبرت اور کامل اثر نہیں حاصل ہوتا، اس لیے قرآن مجید میں ایسے عبرتناک قصے بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

ایک بڑی وجہ ان قصوں کے تکرار کی یہ ہے، کہ جس طرح ایک دلیل مختلف دعووں پر اثر کرتی ہے، ایک قصہ سے مختلف نتائج مستنبط ہوتے ہیں، اور متعدد موقعوں پر ان سے استشہاد پیش کیا جاتا ہے، اس لیے ہر جگہ ان قصوں کے اعادہ سے مختلف نتائج پیدا ہوتے ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ کا قصہ قرآن میں بار بار آیا ہے، مگر غور کرو، ہر جگہ ایک جدید نتیجہ کی طرف اس سے اشارہ کیا گیا ہے، کہیں تو اظہار قدرت کے موقع پر حضرت موسیٰ کا قصہ بیان کیا گیا ہے، کہیں بنی اسرائیل پر خدا نے اپنے احسانات کے اظہار کے موقع پر اس قصہ کا ذکر کیا ہے، کہیں نافرمان قوموں کی ہلاکت پر اس قصہ سے استشہاد کیا گیا ہے، کہیں اس سے بنی اسرائیل کی شرارت اور کفران نعمت

ثابت کیا گیا ہے، کہیں اس قصہ کے ذریعہ سچے نبی اور جھوٹے لوگوں میں فرق بتایا گیا ہے، کہیں اس سے خدا نے حضرت موسیٰؑ پر اظہار احسان کیا ہے، کہیں اس سے فرعون کے کفر، غرور اور نخوت کا تذکرہ مقصود ہے، کہیں اس سے انسان کی فطری کمزوری کا اظہار کیا گیا ہے، حضرت آدمؑ کے قصہ سے خدا کے احسانات، انسان کی کمزوری، نفس امارہ کی شرارت، نوع انسان کی عظمت، غرور کی مذمت، مختلف باتوں پر استدلال ہو سکتا ہے۔

غرضکہ تم اس سے نتیجہ نکال سکتے ہو کہ صرف ایک قصہ سے کس قدر مختلف نتیجے پیدا ہو سکتے ہیں، قرآن مجید میں جو ایک ہی قصہ کی بار بار تکرار ہوتی ہے، دراصل ہر جگہ اس قصہ سے ایک جدید نتیجہ کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے اس لیے وہ تکرار غیر مفید نہیں ہوتی۔

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہاں پہنچ کر، یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ تمام انبیاء میں سے صرف چند خاص انبیاء حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ کے واقعات کا اعادہ کیوں بار بار ہوتا ہے، اس کا حقیقی جواب یہ ہے، کہ قرآن مجید کے اصلی مخاطب صرف چار تھے، عموماً عام انسان اور خصوصاً مشرکین عرب، یہود اور نصاریٰ، عام نوع انسان کی عبرت اور تاثیر کے لیے حضرت آدمؑ کے قصے کی تکرار کی جاتی ہے، اور مشرکین عرب چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے بے انتہا گرویدہ اور معتقد تھے، اس لیے

ان کے لیے حضرت ابراہیمؑ کے واقعات سے اور یہودیوں کے لیے حضرت موسیٰؑ اور نصاریٰ کے لیے حضرت عیسیٰؑ کے قصوں سے استدلال پیش کیا جاتا ہے، اور ان ہی چار انبیاءؑ کے نام اور قصے باز بار آتے ہیں، اور چونکہ عرب میں خصوصاً مدینہ میں یہودی زیادہ تر آباد تھے، اس لیے حضرت موسیٰؑ کا نام سب سے زیادہ آیا ہے، ان کے بعد مشرکین کا درجہ ہے، جن کو حضرت ابراہیمؑ سے تعلق ہے اور آخر میں عیسائی ہیں، چنانچہ اسکی تصدیق ذیل کی تفصیل سے ہوگی،

۱- حضرت موسیٰؑ کا نام قرآن مجید میں ۱۳۵ مرتبہ آیا ہے،

۲- حضرت ابراہیمؑ کا نام قرآن مجید میں ۶۶ مرتبہ آیا ہے،

۳- حضرت عیسیٰؑ کا نام قرآن مجید میں ۳۴ مرتبہ آیا ہے،

فرائض و عقائد کی تکرار: اکثر فرائض اور عقائد کا بیان نہایت تکرار کے ساتھ آتا ہے، اور یہ دراصل وہی چیزیں ہیں، جو منتہائے اسلام ہیں، اور وہ حسبِ ذیل ہیں،

ایمان، نماز، زکوٰۃ، توحید، صفاتِ خدا، تاکید یادِ خدا، اظہار قدرتِ خدا، مذمت شرک، قیامت، حشر، جزا، سزا، ذکر موت، ذکر دوزخ و جنت، مذمت دنیا، اخلاق و عملِ صالح،

یہی بیانات ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں ہر جگہ بار بار آتا ہے خصوصاً ان میں ایمان، نماز، توحید، مذمتِ شرک، دوزخ و جنت کا ذکر نہایت

کثرت سے ہے، جن کا اندازہ ذیل کے بیان سے ہوگا،

۱۔ مدح توحید و مذمت شرک و کفر کا ذکر قرآن مجید میں ۲۵۰ مرتبہ سے زیادہ آیا ہے

۲۔ ایمان کا ذکر اور حکم کا قرآن مجید میں ۳۰۰ مرتبہ آیا ہے

۳۔ بہشت کا ذکر قرآن مجید میں تقریباً ۱۹۵ مرتبہ آیا ہے

۴۔ دوزخ کا ذکر قرآن مجید میں تقریباً ۲۰۰ مرتبہ آیا ہے

۵۔ نماز کا ذکر اور حکم قرآن مجید میں ۱۰۰ مرتبہ سے زیادہ آیا ہے،

شاہ ولی اللہ صاحب نے ان مذکورہ بالا فرائض و عقائد کے متعلق الفوز الکبیر میں ایک بہت دلچسپ بحث لکھی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے قرآن مجید میں جن امور کا ذکر کیا ہے، وہ دو طرح کے ہیں،

اوّل وہ امور ہیں، جو محض قانونی اور تشریعی حکم رکھتے ہیں، اور جن سے مقصد صرف یہ ہے کہ مخاطب کو ان کا علم ہو جائے، مثلاً طلاق، خلع، ظہار، ایلاء، وراثت، سزائے سرقہ، قصاص، شہادت، سزائے زنا وغیرہ،

دوم وہ امور، جو قانونی اور تشریعی نہیں، بلکہ وہ ایسے عقائد یا اعمال ہیں، جن کے متعلق خدا یہ چاہتا ہے، کہ وہ انسان پر چھا جائیں، انسان میں سما جائیں، انسان بالکل ان میں رنگ جائے، ان کا سخت معتقد یا پابند ہو جائے، خدا انہی چیزوں کو بار بار کہتا ہے، اور ۱۰۰، ۱۰۰ دفعہ دہراتا ہے تاکہ مخاطب

اس قدر متاثر ہو جانے، کہ ہل نہ سکے، ایمان، نماز، توحید، حشر، جزا، سزا وغیرہ جن کا ذکر قرآن مجید میں ہر جگہ ہے، وہ اسی قسم کے امور ہیں، جن کی تکرار سے مقصود یہ ہے کہ یہ چیزیں نفس پر بالکل چھا جائیں،

اس کی صحیح مثال یہ ہے کہ اگر ہم خیام اور حافظ کو غور سے پڑھیں، تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس رندی و عاشقی کے صرف چند مضامین ہیں جن کو وہ الٹ پھیر کر ہمیشہ باندھا کرتے ہیں، لیکن جب ہمارے سامنے کوئی شعر ان کا آجاتا ہے، تو ہم اس سے ایک نیا لطف حاصل کرتے ہیں، قرآن مجید کی بار بار تلاوت کرنے کا اسلام نے جو حکم دیا ہے، اس کا بھی یہی راز ہے،

شاہ صاحبؒ کی اصلی عبارت یہ ہے۔

اگر پرسند مطالب فنون خمسہ چرا در قرآن عظیم مکرر گفتہ شد چرا یک بار اکتفا نہ رفت گویم انچہ خواہم کہ سامع را افادہ نمایم دو قسم می باشد یک تعلیم مالا یعلم بود، پس مخاطب حکمے را نمی دانست و ذہن او ادراک (یعنی معلوم امر کا بیان نا) او نہ کردہ بود باستماع ایں کلام ان مجہول معلوم شود، و آں نادانستہ دانستہ گردد و دیگر آنکہ مقصود استحضار صورت آں علم در مدرکہ او باشد تا ازاں لذت فراداں گیرد و قوائے قلبیہ و ادراکیہ دراں علم فانی شوند و رنگ ایں علم بر ہمہ قوی غالب آید، چنانکہ معنی شعری را کہ ما آں را دانستہ ایم مکرر می گوید، و ہر بار لذتے می یابیم و بریں لذت تکرار آں

دوست می داریم...... لہذا در شریعت بہ تکرار تلاوت امر فرمودند۔

(فوز الکبیر مطبوعہ کلکتہ ص ۸۶، ۸۷)

یہ جواب حرف بحرف صحیح ہے، اور اس پر کسی اضافہ کی گنجائش نہیں،

لفظی تکرار قرآن مجید میں لفظی تکرار بھی بہت ہے، ایک ایک آیت ایک ہی سورہ میں بیسیوں مرتبہ آتی ہے، ایک ہی آیت میں ایک ایک لفظ یکے بعد دیگرے دُہرا دیا جاتا ہے،

پہلے ہم الفاظ کی تکرار کو بیان کرتے ہیں، اس قسم کی تکرار ہر زبان میں موجود ہے اور اس کو اصطلاح نحو میں تاکید کہتے ہیں، ہم ہمیشہ بولتے ہیں، دیکھو دیکھو، نہیں نہیں، زید زید، اس دوسرے لفظ سے مقصود صرف کلام پر زور ڈالنا ہوتا ہے، قرآن مجید کی جن آیتوں میں اس قسم کی تکرار ہے، وہ محض تاکید کے لیے ہے، اس تکرار کی چند مثالیں یہ ہیں،

اولیٰ لك فاولیٰ ثم اولیٰ لك فاولیٰ۔ (قیامہ) — ہلاکت ہو تمہارے لیے ہلاکت پھر ہلاکت ہو تمہارے لیے پھر ہلاکت ہو۔

کلا سوف تعلمون ثم کلا سوف تعلمون (تکاثر) — ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لوگے، پھر ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لوگے۔

عربی اشعار میں بھی اس قسم کی تکرار کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں، خنسا کہتی ہے،

اردت لنفسی بعض الامور ... فاولی لنفسی اولی لھا

میں نے اپنے لیے بعض چیزوں کا ارادہ کیا، ... تو ہلاکت ہو میرے نفس کے لیے ہلاکت

فراء نے اس قسم کی تاکید کی مثالیں بہت سی پیش کی ہیں، جن کو ہم غرر درر سے نقل کرتے ہیں،

کائن وکم عندی لھم من صنیعۃ ... ایادی ثنوھا علی واذجبوا

ان لوگوں کے کتنے اور کتنے احسان ہم پر ہیں، ... ایسے احسانات جن کو دوبارہ انھوں نے کیے ...

دیکھو اس مصرع میں الفاظ کی کتنی تکرار ہے،

کم نعمۃ کانت لکم کم کم وکم

کتنے تمہارے احسانات ہیں، کتنے کتنے اور کتنے

ایک عربی شاعر کہتا ہے،

نعق الغراب ببین لبنی غدوۃ ... کم کم وکم لفراق لبنی تنعق

کوے نے صبح کو لبنی کے فراق کی آواز دی ... اے کوے تو لبنی کے فراق کی کتنی کتنی اور کتنی آواز دیگا،

حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے تاکیدی الفاظ کی تکرار عربی زبان میں کثرت سے ہے، اور قرآن مجید میں بھی یہ اسلوب جابجا استعمال کیا گیا ہے،

اب صرف ایک بات بیان کرنی رہ گئی، قرآن مجید کی ایک ہی سورہ میں ایک ایک آیت کی تکرار بار بار کی جاتی ہے، سورۂ رحمٰن میں "فبای آلاء ربکما تکذبان" ۲۱ مرتبہ، ایک ایک آیت کے بعد آیا ہے،[1]

---

[1] تم خدا کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

سورۂ مرسلات میں " ویل یومئذٍ للمکذبین[1]" ایک دو آیت کے بعد گیارہ مرتبہ ہے، سورۂ قمر میں بھی اسی قسم کی تکرار ہے،

اس کا جواب مختلف پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے،

(۱) قرآن مجید میں ہر جگہ موثر اسلوب اختیار کیا گیا ہے، جب ہمارا مقصود یہ ہوتا ہے، کہ مخاطب کو ہر طرح سے متاثر کر دیں، تو ایک ایک جملے کو بار بار کہتے ہیں، اور مخاطب پر اس کا اثر پڑتا ہے، مثلاً ایک شخص پر تم نے کثرت سے احسانات کیے، وہ اپنے طرزِ عمل سے ان احسانات کا انکار کرتا ہے، تو تم اس کو اس طرح سمجھاتے ہو، تم ہمارے کن کن احسانات کا انکار کروگے، کیا ہم نے تم پر یہ احسان نہیں کیا، کہ تم کو رہنے کو گھر دیا، کیا یہ احسان نہیں، کہ تم کو روپیے دیدیے، یہ احسان نہیں، کہ تم کو پڑھایا،

قرآن مجید میں فبای آلاء ربکما تکذبان کی تکرار بھی اسی قسم کی ہے، دیکھو۔

ولمن خاف مقام ربہ جنتان،	جو اپنے خدا سے ڈرا اس کو دو جنتیں ملیں گی،
فبای آلاء ربکما تکذبان، ذواتا	تم اپنے خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کروگے،
افنان، فبای آلاء ربکما تکذبان	ان جنتوں میں ہری شاخیں ہوں گی، تم
فیھما عینٰن تجریان، فبای	اپنے خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کروگے،
آلاء ربکما تکذبان، فیھما	ان میں دو نہریں بھی جاری ہوں گی، تم اپنے

[1] اس دن (انبیاء کے) تکذیب کرنے والوں پر افسوس ہے،

من کل فاکہۃ زوجٰن، فبای ــــ خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کروگے، ان میں
آلاء ربکما تکذبان، ہر میوہ دو دو قسم کا ہوگا، تم اپنے خدا کی کن
(رحمٰن) ــــ کن نعمتوں کا انکار کروگے،

دوسری جگہ خدا قیامت اور عذاب کا حال بیان فرماتا ہے، اور اُس
وقت منکرین کی افسوسناک حالت سے عبرت دلاتا ہے،

کانہا جملٰت صفر، ویل یومئذ ــــ دوزخ کے شعلے زرد اونٹوں کی طرح ہونگے،
للمکذبین: ھذا یوم لا ینطقون ــــ اس دن جھٹلانے والوں پر افسوس ہے،
ولا یوذن لہم فیعتذرون، ویل ــــ یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ بول سکیں گے،
یومئذ للمکذبین، ھذا یوم ــــ اور نہ ان کو اجازت دی جائے گی، کہ عذر
الفصل جمعنٰکم والاولین، فان ــــ کریں، اس دن جھٹلانے والوں پر افسوس
کان لکم کید فکیدون، ویل ــــ ہے، یہ فیصلہ کا دن ہے تم کو اور تمہارے
یومئذ للمکذبین، ــــ اسلاف کو جمع کردیا ہے، اگر تم کوئی تدبیر
ــــ کرسکتے ہو تو مجھ سے کرو، اس دن جھٹلانے
(مرسلات – ۱) ــــ والوں پر افسوس ہے،

تم دیکھتے ہو کہ یہ طرز تکرار کس قدر موثر ہے،

(۲) مولانا آزاد بلگرامی نے لکھا ہے، کہ عربی کے قصائد اور غزلوں میں
ردیف نہیں ہوتی، اور نہ عرب میں دیگر اصناف سخن مخمس وغیرہ مستعمل ہیں، جن میں

ایک مصرع بار بار آتا ہے، قرآن مجید نے عرب کے لٹریچر پر چونکہ بہت سے اصنافِ سخن کا اضافہ کیا ہے، اس لیے سورۃ الرحمٰن وغیرہ میں جو ایک ہی آیت بار بار آتی ہے اس کو گویا غزل مردف سمجھنا چاہیے، جس میں ایک ہی لفظ ہر شعر کے آخر میں آتا ہے،

(۳) شریف مرتضیٰ نے تکرار آیات کا بہت اچھا جواب دیا ہے، وہ یہ ہے، کہ عرب کے اصناف سخن میں ایک قسم یہ بھی ہے، کہ قصیدہ میں ایک ہی مصرع کو بار بار کہنا، قرآن مجید گو نثر ہے، لیکن اس میں چونکہ عرب کے تمام اصنافِ کلام موجود ہیں، اس لیے بعض سورتوں میں صنف تکرار بھی اختیار کی گئی ہے، اس صنف کی مثالیں شعرائے عرب کے یہاں بہت ملتی ہیں، شریف مرتضیٰ نے چند مثالیں دی ہیں، ہم اور بھی بہت سی مثالیں پیش کرتے ہیں،

مہلہل بن ربیعہ ایک مشہور جاہلی شاعر ہے، وہ کلیب کے مرثیہ میں لکھتا ہے،

الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا خاف المغار من المغیر

الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا طرد الیتیم من الجزور

الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا ما ضیم جیران المجیر

الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا رجف العضاۃ من الدبور

الا ان لیس عدلاً من کلیب — اذا خرجت مخبأۃ الخدور

الا ان لیس عدلاً من کلیب | اذا ما اعلنت نجوی الامور
الا ان لیس عدلاً من کلیب | اذا ضاقت رحیبات الصدور
الا ان لیس عدلاً من کلیب | اذا ما خار جار المستجیر
الا ان لیس عدلاً من کلیب | اذا طالت مقاساة الامور
الا ان لیس عدلاً من کلیب | اذا هبت ریاح الزمہریر

اسی طرح سے بیس مرتبہ ایک ہی قصیدہ میں ایک مصرع کو دہرایا گیا ہے،

دوسری جگہ مہلہل کہتا ہے،

ذہب الصلح او تردوا کلیبا | وتحلوا على الحكومة حلا
ذہب الصلح او تردوا کلیبا | اوتذوقوا السیوف وردا ونہلا

اسی قصیدہ میں چھ مرتبہ یہی مصرع بار بار آیا ہے، مہلہل کہتا ہے،

علی ان لیس یوفی من کلیب | اذا قودوا الیک فلا تقاد
علی ان لیس یوفی من کلیب | لاعطاء الطرائف والتلاد

اس قصیدہ میں سترہ مرتبہ ایک ہی مصرع کی مہلہل نے تکرار کی ہے۔

حارث بن عبادہ جاہلی اپنے بیٹے کے مرثیہ میں کہتا ہے،

قربا مربط النعامة مني | لقحت حرب وائل عن حيال
قربا مربط النعامة مني | ليس دون اللقاء من اعتذال

حارث نے اس مرثیہ میں ایک ہی مصرع کو چھ الیس بار دہرایا ہے،

مہلہل اس مرثیہ کے جواب میں کہتا ہے:-

قربا مربط المشہر منی   کل شعرا و اشقر ذی بال

قربا مربط المشہر منی   فکلیب اشامنی قذالی

اس قصیدہ میں بھی ایک مصرع چالیس دفعہ دہرایا گیا ہے، لیلیٰ خیلیہ جو امیر معاویہؓ کے زمانے کی ایک مشہور شاعرہ عورت ہے، توبہ کے مرثیہ میں کہتی ہے:-

لنعم الفتی یاتوب کنت اذا التقت   صدور العوالی واستشال آسوافل

ونعم الفتی یاتوب کنت ولم تکن   لتسبق یوما کنت فیہ تجادل

اس مرثیہ میں لیلیٰ ... دو چار مصرعوں کو لے کر پورے قصیدہ میں ان کو دہراتی گئی ہے، عمرہ بنت نعمان اپنے شوہر کے مرثیہ میں کہتی ہے،

وحدثنی اصحابہ ان مالکا   اقام ونادی صحبہ برحیل

وحدثنی اصحابہ ان مالکا   ضروب بنصل الیف غیر نکول[1]

پھر بار بار اسی مصرع کو دہراتی چلی گئی ہے،

اس قسم کی لفظی اور معنوی تکرار صرف قرآن مجید ہی میں نہیں ہے، بلکہ تورات میں بھی موجود ہے، حضرت موسیٰؑ کا قصہ تورات میں مختلف نتائج کے لیے بیسیوں

---

[1] یہ تمام مذکورۂ بالا اشعار حرب بکر و تغلب میں ہے،

جگہ آیا ہے، لفظی تکرار بھی کثرت سے ہے، ایک مقام پر ہے،

تم میری سنتوں کی محافظت کرو، اور میرے مقدس سے ڈرو، میں خداوند ہوں، اور تم بھان متی اور جادوگروں پر التفات نہ کرو، اور ان کے طالب نہ ہو، کہ ان کے سبب سے ناپاک ہو جاؤ گے، میں[ا۵] خداوند تمہارا خدا ہوں، تو اس کے لیے جس کا سر سپید ہو، اٹھ کھڑا ہو، اور بوڑھے مرد کو عزت دے، اور اپنے خدا سے ڈر، میں خداوند ہوں، اگر کوئی مسافر تیری زمین پر تیرے ساتھ سکونت کرے تو اس کو مت ستا، بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے، ایسا جانو جیسے وہ تم میں پیدا ہوا ہے، اور ایسا پیار کرو جیسا آپ کو کرتا ہے، اس لیے کہ تم مصر کی زمین پر پردیسی تھے، میں خداوند تمہارا خداوند ہوں تم انصاف کرنے میں، پیمائش کرنے میں، تولنے میں، ناپنے میں، بے انصافی نہ کرو، چاہیے کہ تمہاری ترازو پورے پیمانے پوری دس سیریاں ہوں، میں خداوند تمہارا خداوند ہوں[ا۵]، جو تم کو زمین مصر سے نکال لایا سو تم میری ساری شریعتوں اور ساری عدالتوں کی حفاظت کرو اور ان پر عمل کرو، میں خداوند ہوں "

(احبار باب ۱۹)

[ا۵] میں خداوند تمہارا خدا ہوں، اس فقرہ کی تکرار احبار باب ۱۸، ۱۹ میں بہت جگہ ہے، میں نے صرف آخری حصہ لیا ہے،

آخر میں ایک بات کہنی اور باقی رہ گئی، دشمنانِ اسلام کا یہ بھی اعتراض ہے، کہ سورۂ الرحمٰن میں بعض جگہ "فبای آلاء ربکما تکذبان" کی تکرار بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے، مثلاً

یرسل علیکما شواظ من نار و نحاس فلا تنتصران، فبای آلاء ربکما تکذبان، فاذا انشقت السماء فکانت وردۃ کالدھان فبای آلاء ربکما تکذبان، فیو مئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان، فبای آلاء ربکما تکذبان، یعرف المجرمون بسیماھم فیوخذ بالنواصی والاقدام فبای آلاء ربکما تکذبان، ھذہ جھنم التی یکذب بھا المجرمون یطوفون بینھا وبین حمیم آن، فبای آلاء ربکما تکذبان۔ (رحمٰن۔۲)	تم پر آگ پگھلے ہوئے تانبے کا شعلہ بھیجا جائے گا، اور تم اپنے کو نہ روک سکو گے، تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے، جب آسمان پھٹ جائے گا، تو سرخ مثل تیل کے ہو جائے گا، تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے، اُس دن کسی انسان اور جن کا گناہ نہ پوچھا جائے گا، تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے، گنہگار اپنی علامت سے پہچان لیے جائیں گے، تو سر کے بال اور پاؤں پکڑ کر (ڈالے جائیں گے) تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے، یہی وہ جہنم ہے گنہگار انکار کرتے تھے، اس آگ اور گرم پانی کے درمیان طواف کرو۔ تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے۔

ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں جہنم و دوزخ کے حالات بیان کیے گئے ہیں، یہ عذاب ہے، نعمت نہیں، اس لیے اس کے بعد یہ کہنا کہ تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کروگے، ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے،

جمہور مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے، کہ جہنم و دوزخ گو خود نعمت نہیں ہیں، لیکن جہنم و دوزخ کے حالات بیان کر کے انسان کو عبرت دلانا ایک نعمت ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ جواب کس قدر رکیک و بارد ہے، ہمارے نزدیک اس کا اصلی جواب یہ ہے، کہ جہنم و دوزخ گو خاص خاص گنہگار افراد انسان کے لیے نعمت نہیں ہے، لیکن عام نوع انسان کے لیے خدا کا دوزخ کو پیدا کرنا بھی ایک عظیم الشان نعمت ہے، جس کے خوف سے مجرم انسان صالح ہوجاتا ہے،

اس کا دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ اس سورہ میں قرآن مجید نے جس صنف کلام کا استعمال کیا ہے، اس میں یہ بھی اجازت ہے، کہ گو اس مکرر مصرع کو جو ہر شعر میں آتا ہے، دوسرے مصرع سے تعلق نہ ہو) بلکہ پہلے مصرعوں سے تعلق ہوتا ہے) مگر پھر بھی اس کو دہراد یتے ہیں، مہلہل کے مذکورہ بالا قصیدہ کے دو شعر سند میں پیش ہیں:

قربا مربط المشہر منی　　　　لیت شعری وذاک انعم حال

مشہر (گھوڑے کا نام) اصطبل میرے قریب لاؤ، کاش میں جانتا اور یہ بہتر حالت ہے -

قربا مربط المشهر منی   من یکون الغداة رهن العوالی

شہر کا اصطبل میرے قریب لاؤ   کہ کل کون نیزوں کی نذر ہوگا

دیکھو ان دو شعروں میں پہلے مصرع کو، دوسرے مصرع سے تعلق نہیں، اور نہ تیسرے مصرع کو چوتھے مصرع سے تعلق ہے بلکہ دوسرے مصرع کو چوتھے مصرع سے تعلق ہے، مگر پھر بھی مکرر مصرع کو مہلہل نے ان دونوں شعروں میں دہرادیا ہے،

قرآن مجید میں بھی اس موقع پر گو دوزخ و جہنم کے ذکر کو فبای آلاء ربکما تکذبان سے تعلق نہیں، بلکہ اس کے ماقبل اور مابعد سے تعلق ہے، مگر پھر بھی اس کو دہرادیا گیا ہے، تاکہ سلسلۂ تکرار ٹوٹنے نہ پائے،

علوم قرآن دراصل ایک بحر ناپیداکنار ہے، اس قسم کے نکتے صرف اس دریا کے چند حباب ہیں،

(الندوہ، جنوری ۱۹۰۹ء)

ارضِ حرم

اور

اس کے احکام و مصالح

(قرآن مجید کی نظر میں)

جزیرۂ عرب کے متعلق اسلام کے جو احکام ہیں، اُن کا ماخذ قرآن مجید کی وہ چند آیتیں ہیں، جو سورۂ توبہ میں واقع ہیں، چونکہ خلافتِ فاروقی کے بعد جب سارا عرب اور عراق و شام اسلامی عَلَم کے نیچے آچکا تھا اور غیر مسلم قوتیں اس سرزمینِ اقدس سے معدوم ہو چکی تھیں، اسلام پر کبھی کوئی وقت ایسا نہیں آیا، جب جزیرۂ عرب اور ارضِ حرم کے تقدس اور حرمت کے خلاف اس پر کسی غیر مسلم سلطنت کے استیلاء کا خطرہ بھی کسی مسلمان کے دل میں گذرا ہو، اس لیے ان آیاتِ پاک کی تفسیر کبھی اس نقطۂ نگاہ سے نہیں ہوئی، جو اب ہر مسلمان کے پیشِ نظر ہے، اور اب معلوم ہوتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے عرب، عراق اور شام کے غیر مسلم تصرف سے باہر لانے کے لیے جو کوششیں کیں، اور مسلمانوں نے جو قربانیاں کیں، وہ درحقیقت ان ہی آیاتِ پاک کی عملی تفسیر تھی،

لیکن چونکہ مفسرین کے عہد میں یہ منظر کبھی خواب و خیال میں بھی نظر سے نہیں گذرا تھا، کہ سرزمین حرم کی کبھی وہی حالت عود کر آئے گی جو ظہور اسلام سے پہلے تھی، جب عرب کا شیرازہ منتشر تھا، ملک کا کوئی متحدہ نظام نہ تھا، قطعہ قطعہ پر قبائل اور شیوخ کی فرماں روائیاں تھیں، کفر و شرک کا استیلا تھا، یمن سے لے کر عراق و شام تک مجوسیوں اور رومی عیسائیوں کی طاقت بالا دست حکمراں تھی، اور ٹھیک آج کی طرح اس عہد میں بھی یمن، حضرموت، بحرین اور عمان پر ایران کے مجوسی مسلط تھے، عراق میں امیر فیصل کی جگہ آلِ منذر کا خاندان مجوسیوں کی حکمبرداری میں اور حدود شام میں امیر عبداللہ کے بجائے آلِ غسان رومیوں کے زیر حمایت تھے، اور شام کے بقیہ حصوں پر رومی عیسائیوں کی براہ راست حکومت تھی، عین اُس وقت جب جزیرۂ عرب کا یہ نقشہ تھا، سورۂ توبہ کی یہ آیتیں اُتریں،

یاایھا الذین آمنوا انما
المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد
الحرام بعد عامھم ھذا وان
خفتم عیلۃ فسوف یغنیکم اللہ
من فضلہ ان شآء ان اللہ علیم
حکیم، قاتلوا الذین لا یومنون

اے ایمان والو! وہ جو خدا کا شریک ٹھہراتے
ہیں، وہ نجس اور گندے ہیں، تو وہ اب کے
سال کے بعد حرمت والی مسجد کے قریب
نہ آنے پائیں، اور اگر تم ان کی آمد و رفت
کے رک جانے کے باعث فقر و فاقہ سے
ڈرتے ہو، تو ایسا خیال نہ کرو، خدا نے اگر

باللّٰہ ولا بالیوم الآخر ولا ۔۔۔ چاہا تو وہ تم کو اپنے فضل وکرم سے غنی کردیگا،
یحرمون ما حرم اللّٰہ ورسولہ ۔۔۔ بیشک خدا اپنے (اپنے حکم کی مصلحتوں کو)
ولا یدینون دین الحق من ۔۔۔ جاننے والا اور حکمت والا ہے، تم اُن میں سے
الذین اوتوا الکتٰب حتی یعطوا ۔۔۔ اُن لوگوں سے لڑو، جن کو کتاب دی گئی ہے
الجزیۃ عن ید وھم صٰغرون ۔۔۔ اور وہ خدا پر اور قیامت پر یقین نہیں رکھتے
۔۔۔ اور نہ اس کو حرام کرتے ہیں جس کو خدا اور
۔۔۔ اس کے رسول نے حرام کیا، اور نہ وہ سچے
۔۔۔ مذہب کی پیروی کرتے ہیں، اور ہیں لڑائی
۔۔۔ ان سے اس وقت تک جاری رکھو جب تک
۔۔۔ وہ مطیع ہوکر جزیہ (خراج اطاعت) نہ
ادا کریں، (توبہ ۴)

اُن آیتوں میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں،
(۱) اہلِ شرک مسجدِ حرام کے قریب نہ ہونے پائیں،
(۲) اگر تم کو فقر وفاقہ کا خوف ہے، تو خدا تم کو اپنے فضل وکرم سے غنی کردیگا۔
(۳) اُن اہلِ کتاب سے جو دینِ حق کے پیرو نہیں، اُس وقت تک لڑو جب تک کہ وہ جزیہ دے کر اطاعت نہ قبول کریں، ان آیتوں کی ترتیب، باہمی ربط، اور سیاق وسباق سے یہ بالکل عیاں ہے، کہ یہ تینوں باتیں باہم ایک

دوسرے سے متعلق اور مربوط ہیں؛ اور اسی تعلق اور ربط کا اقتضا یہ ہے کہ ہم قرآن پاک کے ان الفاظ کا وہ منشا سمجھیں، جس سے اس تعلق و ربط کی کڑیاں زیادہ وابستہ ہو کر نظر آئیں، فقہاء نے پہلی آیت سے یہ حکم قرآنی اخذ کیا ہے، کہ مشرک مسجد حرام کے اندر داخل نہ ہوں، اس اتفاق تام کے بعد یہ اختلاف رونما ہو گیا ہے، کہ کس قسم کا داخلہ ممنوع ہے، امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ غلبہ اور استیلا پا کر کوئی مشرک مسجد حرام کے اندر حاکمانہ داخل نہیں ہو سکتا، امام شافعی اور جمہور فقہائے اسلام کا مذہب یہ ہے کہ، مشرک کا ہر قسم کا داخلہ مسجد حرام میں ناجائز ہے، خواہ وہ حاکمانہ ہو، یا محکومانہ، امام ابوحنیفہ کی طرف اس آیت کی تشریح میں یہ ایک اور امر کی بھی نسبت کی گئی ہے کہ وہ اس آیت کا منشا صرف اسی قدر خیال کرتے ہیں، کہ آیندہ سے مشرک خانہ کعبہ کا حج نہ کرنے پائیں۔

الغرض فقہاء نے اس آیت کا منشا یہ متعین کیا ہے، کہ اس میں مشرکین کو مسجد حرام کے اندر داخل ہونے سے روکا گیا ہے، یا اس میں مراسم حج ادا کرنے سے باز رہنے کی ہدایت کی گئی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر اس آیت کا صرف اسی قدر مدعا ہوتا، تو بجائے اس طریقۂ ادا کے کہ فلا تقربوا المسجد الحرام، (تو اس حرمت والی مسجد کے قریب نہ ہونے پائیں) یا صاف اور سیدھے طریقہ سے ہی کیوں نہ کہدیا گیا کہ فلا یدخلوا المسجد الحرام (کہ مسجد حرام کے اندر داخل

نہ ہونے پائیں) فلا یقربوا المسجد الحرام (مسجد حرام کا آئندہ حج نہ کرنے پادیں) اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مسجد حرام کے اس قرب و نزدیکی سے مشرکین کو روکنے اور باز رکھنے کا مدعا اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، جو بعض فقہاء نے قرار دیا ہے، بالکل کھلی ہوئی بات ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے داخل ہونے یا حج کرنے کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ ان سب سے زیادہ وسیع، عام اور ہمہ گیر لفظ "قرب و نزدیکی" کا استعمال کیا ہے، مسجد حرام کے قرب و نزدیکی سے جب وہ روک دیئے گئے، تو اس کے اندران کا داخلہ یا اس کا حج خود بخود مسدود ہو جائے گا، اور اس پر غلبہ اور تسلط اور تولیت اور قیام و سکونت تو بدرجۂ اولیٰ منع ہوگی، الغرض قرآن پاک کے الفاظ اس باب میں خاص نہیں، بلکہ عام ہیں، اور وہ ہر قسم کے قرب و نزدیکی کے منع کو حاوی ہیں،

اگر قرآن پاک کے ان الفاظ کا مقصد خاص ہوتا، یعنی صرف عدم دخول یا عدم استیلاء یا عدم حج تک محدود ہو، تو اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے دو باتیں ذکر فرمائی ہیں، ایک یہ کہ "کفار کے اس انسداد اور روک دینے سے اگر تمہیں اپنے افلاس اور غربت کا ڈر ہے تو خدا تم کو غنی کر دے گا" اور دوسری یہ کہ "اہلِ کتاب سے جو دینِ حق کے پیرو نہیں جب تک جزیہ نہ دیں لڑائی جاری رکھو،" ان دونوں باتوں کا محض مشرکین کے مسجد میں داخل ہونے یا حج کرنے کی ممانعت سے کیا ربط و تعلق ہوگا، کیا مشرک اگر خانہ کعبہ میں داخل نہ ہونے

پائیں گے، اوران کو حج کی اجازت نہ ہوگی، تو مسلمان غریب ہوجائیں گے، اور اہلِ کتاب سے مقاتلہ جاری ہوجائے گا،

ایک اور بات اس موقع پر غور کے قابل ہے، یہ آیتیں سورۂ برائت کے ساتھ فتحِ مکہ کے بعد ۹ھ میں اُتری ہیں، جیساکہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، اوراس سورہ کے مضامین سے ظاہر ہے کہ اس وقت یمن سے عراق اور شام کے حدود تک اسلام کی طاقت اور حکومت قائم ہوچکی تھی، مشرکین عام طور سے مسلمان ہوچکے تھے، اور جو باقی تھے اُن سے اسلام کے سوا کوئی اور شے مطلوب نہ تھی، ایسی حالت میں ان کو صرف حرم کے اندر داخلہ سے یا حج سے روکنے کے کوئی معنی نہیں، اسی طرح ملک میں عیسائیوں یا یہودیوں کی جہاں کہیں بھی آبادی تھی، وہ فاتح مسلمانوں کی محکومی بہ دل اختیار کرچکی تھی، ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ مشرکین کو اگر وہ ہوں تو صرف حرم کعبہ کے داخلہ سے یا حج سے ممانعت نہیں کی گئی ہے، بلکہ مسجد حرام کے قرب سے ان کو باز رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، مقصود یہ ہے کہ غیر مسلم بیت الحرام کے قرب وجوار میں مقام نہ کریں، کیونکہ ان کو بیت خلیل کی ہمسایگی اور ہم جواری کا شرف حاصل کرنے کا کوئی استحقاق نہیں ہے، جیساکہ اسی سورہ میں بتصریح مذکور ہے،

ماکان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللہ شٰھدین علیٰ انفسھم بالکفر ۔ مشرکوں کو کوئی حق نہیں، کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں، درانحالیکہ وہ خود اپنے اوپر کفر

اولٰئک حبطت اعمالھم وفی النار ھم خلدون ○ انما یعمر مسٰجد اللہ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر واقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ ... (توبہ - ۳) کی گواہی دے رہے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے کام برباد ہو گئے۔ اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، اللہ کی مسجدوں کو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان لایا اور نماز کھڑی کی، اور زکوٰۃ دی، اور سوا خدا اور کسی سے نہ ڈرا ...

یہ یاد رہے کہ خدا نے عام مساجد کی تولیت کا حق اہلِ ایمان کو عطا فرمایا ہے۔ اسلام میں مقدس مسجدیں صرف تین ہیں، جو تین انبیاء کی یادگاریں ہیں، مسجد حرام جو حضرت ابراہیمؑ کی یادگار ہے، بیت المقدس جو حضرت سلیمانؑ کی تعمیر ہے، اور مدینہ کی مسجد نبوی جو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نشانی ہے ان تینوں مسجدوں کی تولیت اور آبادی صرف اُن کا حق ہے، جو خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر خدا کے سوا اور کسی کے خوف سے اُن کے دل مرعوب نہیں،

اس سورہ کے نزول کے وقت مکہ فتح اور تمام عرب مسخر اور بُت پرست مشرکین کا استیصال ہو چکا تھا، اب جو کچھ باقی رہ گئے تھے، وہ اہلِ کتاب مشرکین تھے، جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا نام لے کر بھی خدا کے احکام کی توہین کرتے تھے، اور بندوں کو خدا کا ہمسر قرار دیتے تھے، اس لیے آیت پاک،

انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام۔ (توبہ-۴) خدا کے شریک ٹھہرانے والے نجس ہیں، تو وہ اس حرمت والی مسجد کے قریب نہ ہوں،

کی تعمیم میں ہر قسم کے مشرک، شریک اور داخل ہیں، لیکن صورت واقعہ کے لحاظ سے مسجد حرام کے قریب بسنے والے یہود و نصاریٰ خصوصیت کے ساتھ داخل ہیں۔

اس تفصیل کے بعد اس آیت کا ربط و تعلق مابعد کی آیتوں سے بالکل واضح اور روشن ہو جاتا ہے، عرب کی تجارت تمامتر یہودیوں کے ہاتھ میں تھی، اور ان کے مہاجنی کاروبار کا جال تمام ملک میں پھیلا تھا، ملک میں غلہ اور سامان شام کے نبطی اور یہودی لاتے تھے، اور یہی یہاں کے بیوپاری تھے۔ یہودیوں کی تجارتی کوٹھیاں جو قلعوں کا مقابلہ کرتی تھیں، ہر جگہ قائم تھیں، اور جزیرۂ عرب کے صوبہ شام میں رومی عیسائیوں کی اور صوبۂ عراق میں مجوسی ایرانیوں کی فرماں روائی تھی، جن کو اسلام نے مشابہ اہل کتاب قرار دیا ہے،

آیت میں "قرب" کا لفظ خدا نے استعمال فرمایا ہے، یعنی یہ کہ ہر قسم کے مشرک مسجد حرام کے قریب نہ رہیں، قرب اور بعد کے الفاظ اضافی ہیں، یعنی ایک ہی حیثیت سے اس کو قریب بھی کہہ سکتے ہیں ہے، اور دوسری حیثیت سے اس کو بعید بھی کہہ سکتے ہیں: اس بنا پر جب خدا نے یہ حکم دیا کہ مشرک مسجد حرام کے قریب نہ رہیں، تو ضرور ہے کہ اس قرب و بعد کی تعیین کر دی جائے، اسی لیے شارع ؑ نے

اس قرب کی تعیین "جزیرۃ العرب" کے لفظ سے کردی، اور فرمادیا کہ جزیرۃ العرب میں اہلِ شرک کو سکونت کی اجازت نہ دی جائے، اس بنا پر احادیثِ صحیحہ اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب (جزیرۂ عرب سے اہلِ شرک کو نکال دو) اور لا تبقی فیہا دینان (اس جزیرہ میں دو دین نہ ہوں) اور لا یبقی فیہا قبلتان (اس میں عبادت کے دو مرکز نہ ہوں) حقیقت میں آیتِ بالا کی شرح اور تفسیر ہے اور حکم مذکور کا اجرا اور تنفیذ ہے،

اب اوپر کی لکھی ہوئی سورۂ توبہ کی تینوں آیتوں کو ملا کر دیکھیے اور ایک بار بغور ان پر نظر ڈالیے،

یا ایہا الذین آمنوا انما المشرکون	اے ایمان والو! جو شرک میں مبتلا ہیں، وہ
نجس فلا یقربوا المسجد الحرام	نجس اور گندہ ہیں، تو وہ اس سال کے بعد
بعد عامہم ھذا وان خفتم عیلۃ	مسجد حرام کے قریب نہ ہوں، اگر تم کو (ان
فسوف یغنیکم اللہ من فضلہ	کی آمد و رفت کے رک جانے سے) فقر و فاقہ
ان شاء ان اللہ علیم حکیم قاتلوا	کا خوف ہو، تو خدا تم کو اپنے فضل سے انشاء اللہ
الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم	غنی کر دے گا، بیشک خدا اپنے حکم کی مصلحتوں
الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ	کا جاننے والا اور حکمت والا ہے، تم ان میں
ورسولہ ولا یدینون دین الحق	سے جن کو کتاب الٰہی دی جا چکی تھی، ان سے
من الذین اوتوا الکتب حتی یعطوا	لڑو، جو خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتے،

الجزیۃ عن ید وھم صاغرون [illegible] اور نہ ان کو حرام کہتے ہیں، جس کو خدا اور

[illegible] اس کے رسول نے حرام کیا، اور نہ وہ دین حق

کی پیروی کرتے ہیں، اور نہ لڑائی ان سے

[illegible] اس وقت تک رکھو جب تک وہ محکوم ہو کر

[illegible] جزیہ نہ دیں، [illegible] (توبہ ۔ ۴)

ظاہر ہو گیا کہ ہر قسم کے مشرکین سے اور خصوصاً اہل کتاب مشرکین سے مسجد حرام کا قرب و جوار پاک ہونا چاہیے اور جزیرۂ عرب میں ان کی آمد و رفت اور سکونت مسدود ہونی چاہیے، مسجد حرام کے قرب و جوار میں اہل شرک میں سے جو لوگ آمد و رفت رکھتے تھے۔ اور سکونت کرتے تھے، وہ دو قسم کے تھے، ایک وہ جو مصالحانہ تجارتی کاروبار کے ذریعہ سے آتے جاتے تھے۔ دوسرے وہ تھے جو جزیرۂ عرب کے حدود میں فوجی اور شاہانہ قوت و اقتدار رکھتے تھے، اسلام نے ان دونوں کے لیے اپنے مقدس شہروں کے دروازے بند کر دیئے۔ ابھی گذر چکا ہے کہ اس ملک کا تمام کاروبار، لین دین، تجارت اور بیوپار یہودیوں اور بطیوں کے ہاتھ میں تھا، اس لیے لامحالہ مسلمانوں کو اپنی مالی اور اقتصادی قوت کے زوال اور اشیاء کی آمد و رفت کے انسداد اور باہر سے غلہ کی آمد بند ہو جانے کا خطرہ ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے اُن مصالحانہ تجارتی ذرائع کے بند ہو جانے سے جو خطرہ لاحق ہوا، اس کو اس تسلی سے جس میں آیندہ کی عظیم الشان پیشینگوئی چھپی تھی رفع

کر دیا، کہ اگر تم کو اس آمد و رفت کے بند ہو جانے سے فقر و فاقہ کا خیال ہے تو خدا اپنی دولت سے مالا مال کر دے گا، یعنی تم کو سرزمین کی وسیع حکومت اور تجارت سپرد کر دے گا،

تیسری آیت میں جس مقاتلہ کا ذکر ہے، وہ اس سرزمین اقدس کی غیر مسلم قوتوں کے مقابلہ میں ہے، جو عراق و شام کے صوبوں میں جو جزیرۂ عرب کے آخری حدود تھے۔ فوجی اور شاہانہ اختیارات رکھتی تھیں؛ اور اُن سے اُس وقت تک جنگ جاری رکھنے کا حکم تھا، جب تک وہ جزیہ دے کر اسلام کی اطاعت نہ قبول کریں،

اس کے بعد کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے شرک کا ثبوت دیا ہے، کہ اُن میں سے ایک نے عزیر کو اور دوسرے نے عیسیٰؑ کو خدا کا شریک و شبیہ ٹھہرا لیا ہے، اور اُن کے اس ارادۂ فاسد کا اظہار ہے، کہ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ وہ اسلام کی قوت کو کسی طرح شکست کر سکیں؛ چنانچہ فرمایا:

وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصاری المسیح ابن اللہ ذلک قولھم بافواھھم یضاھئون قول الذین کفروا من قبل قاتلھم اللہ انی یؤفکون	اور یہود نے کہا کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے، یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں (جن کو سچائی سے تعلق نہیں) یہ اُن کافروں کے قول کی نقل ہے، جو اِن کے پہلے تھے، خدا ان کو غارت کرے، کہ کدھر

اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الٰها واحدا لا اله الا هو سبحانه عما یشرکون. یریدون ان یطفؤا نور الله بافواههم ویابی الله الا ان یتم نوره ولو کره الکافرون. هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون۔ (توبہ-۴)

بھٹکائے جا رہے ہیں، انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے اپنے دین کے عالموں کو اور مسیح ابن مریم کو خدا بنالیا ہے، حالانکہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک خدا کو پوجیں، کوئی خدا نہیں، مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جس کو وہ خدا کا شریک بناتے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور (اسلام) کو منہ سے پھونک مار کر بجھا دیں، اور خدا کو منظور ہے کہ وہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کے رہے، اگرچہ ان کافروں کو دل سے یہ بات ناپسند ہو، وہی خدا ہے جس نے اپنے (محمدؐ) کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غلبہ عطا کرے، اگو مشرکوں کو برا کیوں نہ لگے۔

آیات بالا میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے شرک اور نور اسلام کے بجھانے کے لیے ان کی جن کوششوں کا حوالہ دیا تھا، وہ بعینہ آج تک قائم ہیں، اہل کتاب کی اس مذہبی بداعتقادی کو جس کی بنا پر مساجد الٰہی کی تولیت کا استحقاق

اُن سے چھن جاتا ہے، اُن کی مالی اور تجارتی بے ایمانیوں کو خدا نے ظاہر کیا ہے،
اور اس کے بعد حرمت کے چار مہینوں کا ذکر ہے، جن میں سرزمین عرب میں لڑنا
ناجائز ہے اور اس کے بعد رومیوں کی لڑائی یعنی غزوۂ تبوک کا ذکر ہے جس سے
شام کی لڑائیوں کا آغاز ہوتا ہے، اور چند سال کے بعد بیت المقدس کی کنجی
مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، اور تیسری مسجد کی تولیت کا فخر بھی ان کو عطا ہوتا ہے۔
سلسلۂ واقعات کی یہ کڑیاں ہمارے دعوے کی تائید اور شہادت ہیں، کہ اس
حکم کے نزول کے بعد عرب کے مشرکین پر فوج کشی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ اب ان کا کوئی
جتھا باقی نہیں رہا تھا، بلکہ اول شام کے عیسائی رومیوں سے مقابلہ کیا گیا، جو سرزمین
حرم کے پاس ہونے کے باعث نور اسلام کے بجھانے میں سب سے پیش پیش تھے،
چنانچہ قرآن مجید نے بھی اس کے بعد اسی جنگ کا تذکرہ کیا ہے، اور منافقین اور بعض
سچے مسلمان اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے، ان کو سخت لعنت ملامت کی ہے،

آخر میں ارشاد فرمایا،

یاایھا الذین آمنوا قاتلوا	اے ایمان والو! جو کفار تمہارے قریب ہیں،
الذین یلونکم من الکفار (توبہ - ۱۶)	ان سے جنگ کرو،

غزوۂ تبوک کے قرینہ سے یہ صاف ظاہر ہے، کہ اس قریب، متصل اور
ہم سرحد کفار سے مقصود عراق و شام کی غیر مسلم حکومتیں ہیں، جو بقیہ ارض عرب پر کسی
استحقاق کے بغیر قابض تھیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکم کی تعمیل

کے لیے غزوات کا رُخ ادھر ہی موڑ دیا، اور غزوۂ تبوک کے بعد مرض الموت میں غزوۂ موتہ کے لیے فوج کی آراستگی کا حکم دیا، اور چونکہ یہ مہم تمام نہیں ہوئی تھی؛ اس لیے وفات کے وقت اپنے چار جانشینوں کو وصیت فرمائی کہ جزیرۂ عرب نامسلموں سے پاک کیا جائے، بنابریں حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی اس محاذ جنگ کو قائم رکھا، بلکہ اس کو عراق تک وسعت دیدی، اور حضرت فاروق اعظمؓ نے اس مہم کو انجام تک پہنچایا، یہاں تک کہ جزیرۂ عرب اپنے پورے حدود میں آزاد ہوگیا، اور وہ صرف دینِ حق کا مسکن اور حضرت ابراہیمؑ کی بشارت کا مستحق ہوگیا، اور اس وقت یمن اور خیبر وغیرہ کے نصاریٰ اور یہود کو خالص عرب کے صوبوں سے ہٹا کر عراق و شام میں آباد کیا گیا،

اس تشریح سے یہ بھی واضح ہوگیا، کہ کامل جزیرۂ عرب اور اس کے مختلف حصوں کے کیا احکام ہیں، کامل جزیرۂ عرب کے لیے یہ حکم ہے، کہ وہ غیر مسلم کے استیلاء، تسلّط اور فرماں روائی سے آزاد ہو کہ اس سے زیادہ سرزمین حرم کے اصلی قرب و اتصال کی تولیت اور داخلہ کی جس سے اہلِ شرک کو روکا گیا ہے، اور کیا صورت ہوسکتی ہے، اور اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فتح مکہ تک غزوات کا سلسلہ قائم رہا، کہ یہ سرزمین بُت پرست اہلِ شرک کے قرب، تولیت اور استیلاء سے آزاد ہو، اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء عراق اور شام کے اہلِ شرک سے نبرد آزما ہوئے، تاکہ ان مقاماتِ مقدسہ کو اہلِ کتاب یا مشابہ اہلِ کتاب مشرکین کے قرب، تولیت اور استیلاء سے پاک و صاف کیا جائے۔

(۲) آیت پاک میں اس قرب کی ممانعت میں مسجد حرام کا لفظ خاص طور سے مذکور

ہے، اور اسی کی بقائے حرمت کی خاطر اس کے آس پاس کی زمینوں کے دروازے بھی اہلِ شرک پر بند کئے گئے ہیں۔ اس لیے اس مسجد حرام کے اندر کسی غیر مسلم کا داخلہ قطعاً ممنوع اور ناجائز ہوگا، ورنہ صریح نص کی مخالفت لازم آئے گی۔

(۳) آیت مذکورہ کی تشریح میں جو صحیح حدیثیں اخرجوا المشرکین کی آئی ہیں، ان میں جزیرۃ العرب کا لفظ صریح طور سے واقع ہے، اور اسی کے مطابق حضرت عمرؓ نے یمن اور خیبر سے غیر مسلموں کو خارج کر کے ان کو عراق اور شام میں جگہ دی، جو ان کا اصلی وطن تھا، اس لیے یہ ثابت ہوا کہ خالص عرب یعنی حجاز، یمن، حضرموت، عمان، بحرین، نجد، یمامہ وغیرہ عربی صوبوں میں غیر مسلم کی مستقل سکونت نہیں ہو سکتی، البتہ ان کا عارضی قیام ہو سکتا ہے، چنانچہ اسی اصول کے مطابق اس آیت کے نزول کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر خلفاء کے درباروں میں جن کا مرکز مدینہ منورہ تھا ہمیشہ غیر مسلم سفرائے سلطنت اور امراء آیا کرتے تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے اُن کے وہاں قیام کی مدت مقرر کر دی، یعنی تین دن جو مہمان داری کی جائز مدت ہے، چنانچہ عبدالرزاق میں یہ حدیث بسند موجود ہے۔

(۴) جزیرۃ العرب کی بغلی وسعت میں اگرچہ عراق و شام کے صوبے داخل ہیں، تاہم خالص عرب کے حدود سے وہ یقیناً باہر ہیں، اور قرآنِ پاک نے ان اہلِ کتاب کو جو وہاں سکونت پذیر تھے، اسلام کی حکومت اور استیلاء کے تسلیم کر لینے کے بعد ان کو وہاں سے نکالنے کا حکم نہیں دیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ نے اُن

صوبوں کے حدود میں اور ان صوبوں کے اندر اہل کتاب مشرکین کو جگہ دی اور وہاں آباد کیا، اس لیے جزیرہ کے ان صوبوں میں ان کو اسلام کے زیر سایہ اقامت اور سکونت کی اجازت ہے، اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو بیان فرماتے وقت اپنی صفات ان الفاظ میں بیان فرمائی ہیں،

ان اللہ علیم حکیم — بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے،

یعنی ان احکام کے جاری کرنے میں جو مصلحتیں اور فائدے ہیں، ان کو وہ خوب جانتا ہے اور اس کی حکمت اور دانائی ہی اس کی مقتضی ہے کہ وہ ان احکام کو نافذ کرے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے بیان میں "خانۂ کعبہ" کو بیت نہیں کہا جیسا کہ دوسرے موقع پر کہا ہے، "کعبہ" نہیں کہا جیسا کہ ایک اور مقام پر مذکور ہے، غرض اس کے متعدد اسماء اور صفات میں سے اس خاص موقع پر "مسجد حرام" یعنی " حرمت والی مسجد" کے نام سے اس کو تعبیر فرمایا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس کی " حرمت" ہی اس حکم کی بنا اور مصلحت ہے، اسی طرح نامسلموں کو جن سے اس حرمت والی مسجد اور اس کے اطراف کو پاک وصاف کرنا مطلوب ہے، لفظ "مشرکین" سے ادا فرمایا ہے، جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کے شرک کی آلودگی ہی ان کے منع قرب اور عدم دخول کی علت اور باعث ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم الٰہی کی تشریح میں یہ الفاظ فرمائے کہ

اخرجوا المشرکین من جزیرۃ — مشرکوں کو جزیرہ عرب سے نکال دو

العرب،

یا یہ فرمایا۔

لا تبقی دینان (جزیرۂ عرب میں دو دین (ایک حق اور ایک باطل) باقی نہ رہیں۔

اور یا یہ ارشاد ہوا۔

لا یبقی قبلتان (دو قبلے (یعنی عبادتوں کے دو مرکز) باقی نہ رہیں

یہ تمام مختلف الفاظ اور عبارات ایک ہی حقیقت کی تعبیر اور ایک ہی کنہ کی ترجمانی ہے،

(۱) اسلام نے اپنے کسی حکم میں اس مصلحت کو نظر انداز نہیں کیا ہے کہ وہ ایک اجتماعی دین ہے، اس کی عمارت کی پانچ بنیادیں توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اسکی اسی وحدت اور اجتماع کے پہلو کو نمایاں کرتی ہیں، توحید یہی ہے، کہ صرف ایک قادر ہستی کا اعتراف کیا جائے، نمازوں کی جماعت اور اوقات معین بھی اسی لیے مشروع ہیں، کہ مسلمان سیکڑوں اور ہزاروں کی کثرت کے باوجود، ایک ہو کر منظر عام پر آئیں، اور ایک ہی معین وقت میں تمام روئے زمین کے اہل ایمان خدا کے سامنے جھکے نظر آئیں، روزہ کے اوقات اور ایام کی تعیین اور ماہ رمضان کی تخصیص بھی اسی لیے ہے کہ زمین کے جس گوشہ میں بھی مسلمان ہوں، وہ سب ایک ہی وقت، ایک ہی حالت، اور ایک ہی کیفیت میں جلوہ گر ہوں، زکوٰۃ کی ایک خاص مقدار معین کی گئی اور اس کی مشروع

صورت یہ رکھی گئی، کہ وہ ایک ہی جگہ (بیت المال میں) جمع ہوکر مقررہ مصارف میں خرچ ہو، حج کے خاص مہینہ، خاص طریقے، خاص لباس، خاص مقام کی تعیین اسی لیے ہے کہ اس سطح ارضی کے تمام کلمہ گو، ایک ہی رنگ روپ، ایک ہی شکل و صورت ایک ہی طریق انداز سے ایک مرکز ربانی کے گرد جمع ہوکر، وحدت اسلامی کے مجسم پیکر بن جائیں، احادیث صحیحہ میں مسلمانوں کی وحدت اور اجتماع کے جو احکام ہیں، وہ بھی اسی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔

ید اللہ علی الجماعۃ ومن شذ شذ فی النار۔ (ترمذی)	خدا کا ہاتھ مسلمانوں کی اجتماعی ہیئت (جماعت) پر ہے، جو اس سے علیحدہ ہوا، دوزخ میں علیحدہ ہوا،
المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً۔ (مشکوٰۃ)	ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے دیوار کی طرح ہے، جس کی اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر اس کو مضبوط کرتی ہے،

اسی وحدت اور اجتماع کی دیوار ہے جو نمازوں کی جماعتوں میں اور جہادوں کی صفوں میں سیسہ پگھلائی ہوئی دیواروں کے مانند مستحکم، متحد اور مجتمع ہوکر، خدا کی نگاہوں میں محبوب اور عزیز ہوتی ہے،

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً کانھم بنیان مرصوص (صف)	بیشک اللہ ان سے محبت کرتا ہے، جو اس کی راہ میں صف باندھ کر اس طرح لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیواریں۔

اسلام کے اسی وحدت اور اجتماع کا اقتضا تھا کہ ان لاکھوں، کروڑوں دلوں اور چہروں کے لیے جو زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوں، سطح ارضی کا کوئی گوشہ مخصوص کر دیا جائے، جدھر سب کے رخ ہوں، وہ جہاں بھی ہوں، دن میں پانچ دفعہ ادھر پھیر جائیں، تاکہ دنیا میں ہر روز یہ اعلان ہوتا رہے کہ خلق الٰہی کی اتنی تعداد جسمانی وطن، مقام اور مسکن کے اختلاف کے باوجود اپنا ایک ہی روحانی وطن، مقام اور مسکن سے تعلق رکھتی ہے، اسی لیے حکم ہوا،

فول وجهك شطر المسجد الحرام وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره (بقرہ ۱۷)	تو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر (اور اے مسلمانو!) جہاں بھی تم ہو، اسی کی طرف اپنا چہرہ پھیرو،

اس مرکزی جہت کا نام قبلہ ہے، یہ مرکزی جہت اور قبلہ وہ بیت الٰہی قرار پایا، جو دنیا میں خدا کا پہلا گھر تھا،

واذ جعلنا البيت مثابة للناس وامنا۔	یاد کرو، کہ ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا،

نہ صرف اسی قدر بلکہ سطح ارض پر بسنے والے تمام مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور ان کی اجتماعی وحدت اور ان کے مصالح کے قیام کا اس کو ذریعہ اور نشان بنایا۔

جعل الله الكعبة البيت الحرام قياما للناس۔ (مائدہ ۱۷)	خدا نے کعبہ یعنی اس مقدس گھر کو لوگوں کے لیے ٹھہراؤ بنایا،

اب ضرورت تھی، کہ مومنین کا یہ مرکز، یہ مرجع، یہ نقطۂ اجتماع، یہ نشانِ وحدت، بیگانہ خیالات، اجنبی رسوم و آداب اور غیروں کے اختلاط اور امتزاج اور میل جول کے گرد و غبار سے پاک ہو، تاکہ ہدایت کا جو چشمہ یہاں سے بہہ کر نکلے، وہ ہر قسم کی آلائشوں سے مبرا اور ہر قسم کی گندگیوں سے منزہ اور ہر طرح کی نجاستوں سے صاف ہو، اسی لیے حکم ہوا کہ "مبتلایانِ شرک"، نجس اور ناپاک ہیں، تو وہ اس حرمت والی مسجد کے قریب نہ ہوں،

کسی خاص گوشۂ ارضی کو بیگانہ خیالات و عقائد اور آداب و رسوم کے شر و فساد اور تاریکی و گمراہی سے محفوظ رکھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے، کہ اس گوشہ کو خاص خیالات و عقائد اور آداب و رسوم کی جماعت کے لیے مخصوص کر دیا جائے اور دوسری جماعتوں کو وہاں کے قرب و اتصال، آمد و رفت، اور قیام و سکونت سے روک دیا جائے، کہ بیگانہ خیالات و عقائد، اجنبی آداب و رسوم کی سرایت اور نفوذ صرف اجنبی قوموں اور بیگانہ اشخاص کے میل جول، امتزاج اور صحبت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے دنیا کے دائمی مذہب کے لیے جس کے بعد کوئی نیا مذہب اس کو نہ دیا جائے گا، یہ ضرور تھا، کہ اس کے قیام و بقا اور تحفظ کے لیے ایک ایسا خطۂ اقدس مخصوص کر دیا جائے، جہاں وہ تنہا حکمراں اور آباد ہو، تاکہ اگر کبھی وہ دنیا میں بے وطن ہو جائے، تو اس سرزمین میں اس کا وطن رہے، یا اگر کبھی اس کی مشعلیں زمین کے دوسرے خطوں میں بجھ جائیں، تو روشنی کا ایک منارہ کم از کم ایک گوشۂ خاکی میں قائم رہے، جہاں سے

اس کی بجھی ہوئی مشعلوں کو دوبارہ روشنی مل سکے، یا اگر کبھی اس کی ہدایت کی بیرونی نہریں خشک یا مکدر ہو جائیں، تو اس کا ایک سرچشمہ باقی ہو، جہاں سے دوبارہ اسکو زندگی اور حیات مل سکے، یہی تفسیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی،

لا تبقی فیہا قبلتان — جزیرۂ عرب میں عبادت کے دو مرکز باقی نہ ہوں،

لا یترك فیہا دینان — جزیرۂ عرب میں دو دین چھوڑے نہ جائیں،

لامحالہ اگر کسی قوم کو یا افراد کو مستقل قیام کی اجازت دی جائے گی، تو لامحالہ وہ وہاں اپنی عبادت گاہیں تعمیر کریں گے، اپنے خیالات کی تبلیغ کریں گے، اپنے تمدن اور آداب و اخلاق کی اشاعت کریں گے، اور یہی شے مسجد حرام کی عظمت، تقدس اور حرمت کو بے بنیاد کرے گی، اسلام سے پہلے عراق میں مجوسی اور شام میں عیسائی حکومت تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ وسط عرب میں مزدکی اور عیسائی مذہب نشوونما پا رہے تھے، قوموں کے استیلاء اور تسلط کا آغاز اسی قرب و اتصال سے ہوتا ہے، دنیا کی تاریخ میں اس کے کس قدر بے شمار نظائر ہیں، خصوصاً یورپ کی اس برتری اور ترقی کے عہد میں مشرق کے کس قدر ممالک ہیں جن کے تسلط اور استیلاء کا آغاز اسی قرب و اتصال سے ہوا ہے، پہلے بحری آمد و رفت ہوئی، پھر عارضی سیاحتیں ہوئیں، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر تجارتی تعلقات ہوئے، مستقل کوٹھیاں تعمیر ہوئیں، آئندہ یہی کوٹھیاں سیاسی سازش گاہوں کی صورت میں بدل گئیں، اور آخر وہ فوجی اور جنگی قلعوں کی حیثیت میں منتقل ہو گئیں، مراکش سے لے کر مصر تک، خلیج بنگال سے لے کر

بحرِ ہند تک، اور خلیجِ عجم سے لے کر بحرِ حبشہ اور بحرِ عرب تک، کیا یہی نقشہ خال
نہیں نظر آتا، تو اسلام نے اگر ان مفاسد کے سد باب کے لیے تسلط اور استیلا
کے ذرائع و وسائل یعنی قرب و اتصال کو ممنوع قرار دیا، تو دنیا کے تاریخی تجربہ
کے لحاظ سے غلط نہیں کیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

آں کس است اہلِ بشارت کہ اشارت داند

معارف نومبر ۱۹۲۳ء

سرزمینِ حرم صرف خدا کے عبادت گذاروں (۲) کا مسکن ہے

ارضِ حرم کی نسبت گذشتہ مباحث میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ وہ اسلام کا دینی اور مذہبی مرکز ہے، اس کا گوشہ گوشہ اسلام کا معبد اور مسلمانوں کا مشہد ہے، ارضِ حرم جس دن ارضِ حرم بنی، اسی دن اس کی یہ خصوصیت عیاں کر دی گئی ہے، کہ وہ صرف رکوع اور سجود کا آستانہ اور اعتکاف و طواف کا مقام ہے اور انہی بندگانِ حق کا مسکن ہے جن کی زندگیاں راہِ خداپرستی میں وقف ہیں اور جو حیاتِ ابدی کے طالب اور جویاں ہیں، خانۂ حرم کے معماروں کو جب وہ اس کی تعمیر سے فارغ ہو چکے، اس کے مالک کا حکم پہنچا۔

ان طہرا بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود۔ (بقرہ)	تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے پاک کرو،

معلوم ہوا کہ ارضِ حرم کی تعمیر کا خاص مقصد یہ ہے کہ توحید کے پرستاروں کا یہ وہ مقام ہو، جہاں خدائے واحد کی پرستش کے سوا کوئی عمل مطلوب نہ ہو، اس کے سوا دنیا کے اور جتنے کام ہیں، وہ اس کی پاکی اور طہارت کے منافی ہیں، اس کی طہارت اور پاکی، اس کی عظمت اور تقدس صرف اسی میں ہے، کہ وہ عبادت الٰہی کا مرکز، توحید پرستی کا معبد، رکوع اور سجود کی چوکھٹ اور اعتکاف و طواف کی خانقاہ ہو،

حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے نام پر جب اس گھر کو بنایا اور اس کی پاسبانی کے لیے اپنی سب سے پیاری اور عزیز اولاد حضرت اسماعیلؑ کو قربان کیا تو ساتھ ہی مقصدِ الٰہی کے مطابق اپنی غرض بھی ظاہر کر دی۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ رَبِّ اِنَّھُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ

اور جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار اس شہر کو امن دینے والا بنا اور مجھ کو اور میری نسل کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کو پوجیں، میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے، تو جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے، ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے مقدس گھر کے پاس بن کھیتی کے میدان میں اس لیے لا کر بسایا ہے، ہمارے پروردگار! تاکہ وہ نماز کھڑی کیا کریں، (یعنی تیری عبادت کریں) (ابراہیم - ۶)

اس شہر کے سب سے پہلے آباد کار نے یہ ظاہر کر دیا کہ اس کی بنا صرف توحید پرستی کے لیے ہے، یہ باطل پرستیوں کا کبھی گہوارہ نہ بنے اس مقدس گھر کے سایہ میں جو لوگ بھی کبھی آباد ہوں ان کی سکونت کی غرض صرف یہی ہونی چاہیے، کہ وہ اقامتِ صلوٰۃ یعنی

عبادت الٰہی کے لیے اپنی حیات کو قربان کردیں، یہ ناپاک سازشوں اور چالبازیوں دنیاوی سیاستوں، اور ملعون ہوسناکیوں، تخت و تاج اور باج و خراج، فوج و عسکر اور تیغ و خنجر کی جگہ نہیں، وہ صرف ایک ہی بادشاہی کا دارالسلطنت اور ایک ہی سپہ سالار کا لشکرگاہ ہے، وہاں کا تاجدار صرف خدائے قدوس ہے اور وہاں کا سریر آرا صرف رب دو عالم ہے، وہ انسانی بادشاہیوں اور خوں ریزیوں کی سرزمین نہیں، وہ قدسیوں کا مسکن، حق جویوں کا مامن اور سچے فرزندانِ ابراہیم کا وطن ہے،

اور یہ بھی ذہن نشین رہے، کہ ابراہیمؑ کے اصلی جانشین وہ نہیں ہیں، جو صرف صلبی اور نسبی حیثیت سے ابراہیم کی جسانی اولاد ہیں۔ بلکہ وہ ہیں، جو ابراہیم کی پیروی اور اطاعت کرکے ان کی معنوی اور روحانی اولاد بننے کا درجہ حاصل کرچکے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے صاف کہہ دیا،

فمن تبعني فانه منّي (ابراہیم) جو میری پیروی کرے وہی مجھ سے ہے،

وہ تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے

پس ابراہیمؑ کی اولاد جس کو اس ارض حرم میں اسکی جانشینی کا حق حاصل ہے، وہی ہے جو یہاں کی سکونت کے لیے ابراہیمؑ کی اطاعت اور پیروی کی مالکانہ سند اپنے پاس رکھتی ہے، اسی بنا پر یہ سرزمین نہ کسی نسل خاص کی ملکیت ہے، نہ کسی قوم واحد کی مملوکہ ہے، نہ کسی خاندان خاص کی جائداد ہے، بلکہ یہ اُن تمام انسانوں کی ملکیت اور جائداد ہے، جو بت شکن ابراہیم کی پیرو اور مطیع ہے، وہ لوگ جو پشتہا پشت اور صدیوں سے اس میں مستقل سکونت رکھتے ہوں،

ان کا اس سرزمین پر استحقاق ایک ذرہ اُن سے زیادہ نہیں، جنھوں نے ابھی ابھی اس کے حدود میں قدم رکھا ہے، بلکہ وہ جو تیرہ صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ توحید کے پرستار چلے آتے ہیں، ان کا حق بھی اس ذلیل ترین ہستی کے حق سے سرِ مُو زیادہ نہیں، جس کی زبان ابھی چند لمحے گذرے کہ کلمۂ توحید سے مشرف ہوئی ہے، غرض عرب، عجم، ترکی و تاتاری، بنی ہاشم اور بنی امیہ، بنی فاطمہ اور آل معاویہ، مکی اور آفاقی، اس کے حقوق میں سب یکساں، مساوی اور برابر ہیں ۔

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی ۔ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اس گھر اور اس سرزمین کے مالک نے اس کی آبادی اور سکونت کے استحقاق کے لیے صرف ایک ہی حق کو تسلیم کیا ہے، اور وہ ابراہیمؑ کی اطاعت کیشی اور پیروی ہے، جو اس سند سے سرفراز ہے، وہ اس کی تولیت کا حق دار ہے، اور جو اس سے محروم ہے، وہ اس کے حق سے بھی محروم ہے!

ان الذین کفروا ویصدون عن	بیشک وہ جو کافر ہیں، اور جو راہِ الٰہی سے اور
سبیل اللہ والمسجد الحرام الذی	اس مسجد حرام سے روکتے ہیں، جس کو ہم نے تمام
جعلناہ للناس سواء العاکف	انسانوں کے لیے بنایا ہے، اور جس میں وہاں کے
فیہ والباد۔ (حج ۳)	رہنے والے اور باہر کے دونوں کے حق برابر ہیں۔

اس اعلانِ الٰہی کے بعد کون ہے جو سرزمینِ حرم کی تولیت کا اس لیے مدعی ہو کہ وہ عرب ہے، اس لیے مدعی ہو کہ وہ ہاشمی ہے، اس لیے مدعی ہو کہ وہ آلِ اشراف

نے اس لیے مدعی ہو کہ وہ صدیوں سے وہاں سکونت پذیر ہے، اس لیے مدعی ہو کہ سالہا سال سے اس کا خاندان وہاں حکمران ہے، اور کون ہے جو وہاں سے باہر دوسرے ملکوں کے رہنے والے مسلمانوں کے حق کو اس دلیل سے رد کر دے، کہ وہ عرب کی قوم نہیں، وہ سادات اور شرفا کے خاندان سے نہیں، وہ اس ملک کے باشندے نہیں، اس سرزمین کا مالک صرف ایک ہے، اور وہ خدا، اور اس کے تمام پرستاران حق اور کلمہ گو اس سرزمین کے حال و مستقبل کے حقوق میں یکساں اور مساوی ہیں، وہ آلِ ابراہیم کی اس تمام نسل کا مسکن اور وطن ہے جو آج دنیا کے اسلام کے گوشہ گوشہ میں پھیلی اور بکھری ہے، اسی بنا پر شریعت اسلام نے اس شہر کی پوری زمین کو وقف قرار دیا ہے، نہ اس کا کوئی حصہ کسی کی ذاتی ملکیت ہے، نہ وہ فروخت ہو سکتی ہے، نہ وہاں کرایہ پر کوئی مکان چلایا جا سکتا ہے، اور آج وہاں شخصی تصرفات کے جو نشانات ہیں، وہ شریعت محمدیہ کی رو سے ناجائز اور ناروا ہیں۔

وہ دار الامن ہے، آدم کی اولاد فرشتوں کے طعنوں کے باوجود، اپنی سفاکیوں اور خونریزیوں سے خدا کی زمین کو نجس و ناپاک کرتی رہتی ہے، خدا نے سطح ارضی کے ایک گوشہ کو اپنا نشیمن بنایا، اور اس کو اپنا گھر کہہ کر پکارا، کہ وہ اس خون سے لتھڑی ہوئی دنیا کا ایک ایسا ٹکڑا ہو، جو انسانی ظلم و ستم سے محفوظ، اور سفاکانہ خونریزیوں سے پاک ہو، جہاں انسانی خون کا ایک قطرہ بھی اس کے دامنِ عصمت کا داغ ہو، سطح ارضی کا یہ گوشہ سرزمینِ حرم ہے، جہاں مجرم سے مجرم انسان کا بھی خون گرانا ممنوع، جہاں حلال سے

حلال جانور کا شکار بھی گناہ، جہاں شاخوں اور درختوں کا کاٹنا بھی حرام، اور جہاں سبزہ اور روئیدگی کو چھیلنا بھی جرم ہے وہ صرف امن و امان کا وطن اور سکون و سلام کا مسکن ہے، ہر ذی روح و غیر ذی رُوح اُس کے سایہ میں مامون اور محفوظ ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی،

ربِ اجعل ھذا البلد آمنا (بقرہ) میرے پروردگار اس شہر کو امن دینے والا بنا،

لبوں کی جنبش سے پہلے یہ دعا بارگاہِ الٰہی میں قبول اور استجابت سے مشرف ہو چکی تھی، کہ دمِ تکوین اس کے ناصیۂ تقدیر میں یہ شرف مقدر ہو چکا تھا،

واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا۔ (بقرہ) اور جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا۔

خدائے عزیز نے اس شہر کے امن و امان کی قسم کھائی،

والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین۔ (تین) قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینا کی اور اس امن والے شہر کی،

قریش پر اپنا یہ احسان ظاہر فرمایا،

فلیعبدوا رب ھذا البیت الذی اطعمھم من جوع وآمنھم من خوف۔ (ایلاف) تو چاہیے کہ وہ اس گھر کے مالک کو پوجیں جس نے ان کو (اس خشک اور بنجر زمین) بھوک سے بچا کر کھانا دیا، اور خوف سے محفوظ رکھ کر ان کو امن بخشا۔

الم یروا انا جعلنا حرماً آمناً — کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے امن والا حرم بنایا،
ویتخطف الناس من حولھم — حالانکہ اس کے آس پاس کی بدامنی کا یہ حال
(عنکبوت) — ہے کہ لوگ اچک لیے جاتے ہیں،

اس کے دارالامن بنانے کے لیے بارگاہ خداوندی سے یہ منشور جاری ہوا۔

من دخلہ کان آمناً — جس نے اس کے اندر قدم رکھ دیا، وہ مامون
(بقرہ) — ہوگیا۔

اس نکتہ کو غور کرو، کہ مدینہ آنے کے چند سال بعد ہی اسلام اس قدر طاقتور ہوگیا تھا، کہ وہ جب چاہتا تلواروں کے سایہ میں ارضِ حرم میں داخل ہوجاتا۔، مہاجرین کے قلوب اپنے وطن کے دیدار کے لیے بیقرار تھے۔ انصار کی تلواریں کنانِ حرم (قریش) سے انتقام کے لیے بے تاب تھیں، عام مسلمان مسجد ابراہیمی کے شوقِ زیارت کے لیے بے چین تھے لیکن ان حالات کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ پاک میں اُن سب سے بالاتر ایک حقیقت تھی، اور وہ یہ کہ وہ دارالامن ہے، تلواروں کی دھاروں، نیزوں کی انیوں اور تیروں کے پیکانوں سے اس سرزمین کے "جسم اقدس" کو مجروح نہیں کیا جاسکتا، وہ قتل و غنیمت اور خونریزی سے گو وہ حق کے لیے ہو مغلوب نہیں کیا جاسکتا، وہ امن و صلح کا گھر ہے، اور وہ صرف امن و صلح ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے، آپ پر جوش مسلمانوں کے جذبات کے خلاف حدیبیہ میں دب کر صلح فرماتے ہیں، اور فوجوں کی فاتح تلواروں کو، اس کے حدود کے اندر

فاتحانہ داخلہ کی اجازت نہیں دیتے اور فرماتے ہیں قریش جو بات بھی ایسی پیش کریں گے جس میں خانۂ الٰہی کی حرمت ہو گی میں اس کو قبول کروں گا، دوسرے سال سینکڑوں مسلمانوں کے جلو میں اس طرح ادائے عمرہ کے لیے مکہ میں داخل ہوتے ہیں، کہ انسانی قتل و خونریزی کے تمام اسلحہ مکہ سے باہر چھوڑ دیئے جاتے ہیں، ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوتا ہے، دس ہزار مجاہدین کے دستے قدسیوں کے پیکر میں قسم قسم کے بیرقوں اور نشانوں کے سایہ میں دم بدم شہر سے قریب ہوتے جاتے ہیں، انصار کی تلواریں انتقام کے جوش میں بار بار نیام سے باہر ہو رہی ہیں، اُن کے علمبردار عبادہؓ کی زبان پر یہ ترانہ ہے!

الیوم یوم الملحمة الیوم تستحل الکعبة۔ — آج گھمسان کا دن ہے، آج کعبہ خونریزی کے لیے حلال کر دیا جائے گا،

حضورؐ کے سمعِ اقدس تک یہ آواز پہنچتی ہے، حکم ہوتا ہے کہ "عبادہؓ نے غلط کہا، آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے" اور اس قصور میں فوج کا علم عبادہؓ سے لے کر، ان کے بیٹے کو دیدیا، آگے بڑھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ مبارک میں تلواروں کی چمک نمایاں ہوئی، معلوم ہوا کہ سیف اللہ خالدؓ کی تلوار نیام سے نکل آئی ہے، اُن سے بازپرس کی گئی، تو ظاہر ہوا کہ قریش کے ایک دستہ نے تیروں کی بارش سے دو مسلمانوں کو جامِ شہادت پلا دیا، آپؐ نے سُن کر فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہی تھی"، بعض شدید مجرموں نے حرم کی سرزمین میں جا کر پناہ لی، حکم ہوا کہ وہ جہاں بھی ہوں قتل کیے جائیں، یہی وہ

ساعت تھی جس میں فرزند اسماعیل اور جانشین ابراہیم کے لیے سرزمین حرم میں قتل جائز قرار دیا گیا۔

لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ (بلد) نہیں! اس شہر کی قسم کھاتا ہوں، اور اے پیغمبر تو اس شہر میں حلال ہے۔

قرآن مجید نے اس حلت کی حد کی تعیین بھی کر دی،

فَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ۔ (بقرہ) تو قریش سے حرمت والی مسجد کے پاس نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ تم سے اس میں نہ لڑیں تو اگر وہ تم کو وہاں قتل کرنا چاہیں، تو تم ان کو بھی قتل کرو۔

یعنی اس وقت جب آپؐ کے لیے اس سند جواز پر عمل کا وقت تھا، فرمایا:

وانه لم يحل القتال فيه لاحد قبلي ولم يحل لي الا ساعة من نهار فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة (حدیث) میرے پہلے کسی کے لیے اس زمین میں لڑنا حلال نہیں ہوا، اور میرے لیے بھی حلال نہیں ہوا لیکن ایک گھڑی دن کے لیے تو اب وہ خدا کا محترم بنانے سے قیامت تک کے لیے محترم ہے۔

اب ان گنہگار انسانوں کے حق میں کیا فیصلہ ہے، جنھوں نے مسجد حرام کے امن و امان کو ہر قسم کے آلات قتل سے زخمی اور مجروح کیا اور معصوم سرزمین کو انواع و اقسام کے قتل و خونریزی سے ناپاک و نجس کیا،

یہاں ظالم سزایاب ہوگا ارض حرم کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص اس کے

امن وامان اور صلح و سلام کے خرمن میں آگ لگائے گا وہ اس میں خاک ہو جائے گا، اور جو مفسد اس کے حدود میں ظلم و ستم گاری کو آشکارا کرے گا، وہ خود دوسروں کے ظلم و ستم گاری کا نشانہ بن جائے گا، گھر کے مالک کا اعلان عام ہے۔

ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم ۔ (حج ۔ ۳) اور جو اس میں منحرف ہو کر ظلم کا ارادہ کرے گا ہم اس کو دردناک عذاب چکھائیں گے۔

ہمارے سامنے تاریخ کی زبان حال اس پیشینگوئی کی شہادت تصدیق کے لیے کافی ہے، جب کبھی لوگوں نے اس سرزمین کو اپنے دنیاوی جاہ جلال کا مرکز بنانا چاہا، اور اس کے امن وامان کی بارگاہ کو خطرہ میں ڈالا، خواہ وہ باہر کے حملہ آور ہوں، یا اندر کے مدعی ہوں، اصحاب الفیل کا کیا حشر ہوا، یزید اور اس کے خاندان کا چند سال میں استیصال ہو گیا، حضرت ابن زبیرؓ کو ناکامی ہوئی، مدینہ منورہ بھی حرم ہے، آپ نے فرمایا کہ "جس طرح ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا، میں مدینہ کو حرم بناتا ہوں" اس لیے مدینہ کے مدعیوں کا بھی حشر یہی ہے۔ یزیدیوں کی بربادی ہوئی، واقعۂ حرہ میں انصار زادوں کو ناکامی ہوئی، نفس زکیہ اور دوسرے سادات ناکام رہے، کیونکہ ان مدعیوں نے حرم کے امن وامان کو خاک و خون میں لتھڑ دیا، شریف حسین اور اس کی اولاد کی ناکامی تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے،

سرزمین حرم دارالسلطنت نہیں بن سکتی

تم نے ایک ایک کرکے پڑھا کہ ارض حرم صرف عبادت گذاری کا گھر ہے، وہ تمام دنیائے اسلام کی ملکیت ہے،

وہ دارالامن ہے، یہاں ظالم سراپا ب ہوگا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ سرزمین
بادشاہیوں اور فوج کشیوں کے لیے نہیں ہے، یہ بغاوتوں اور فسادوں کا مقام نہیں
ہے، یہ سازشوں اور چال بازیوں کی کمین گاہ نہیں ہے، اور اس کو یقین جانو! کہ ملک
کا دارالسلطنت جس کی تعمیر فتنوں اور ہنگاموں سے اور جس کی بنا خونریزی اور
سفاکیوں سے ہوتی ہے، ارضِ اقدس کو اس سے پاک اور مبرا ہونا چاہیے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، ان میں سے کون تھا، جو اپنے
آبائی وطن کا شیدا نہ تھا، تاہم کسی نے بھی اس ملک کو سیاست کا بازیچہ نہیں بنایا،
اور ملک کا دارالخلافہ مدینہ منورہ ہی کو باقی رکھا، حضرت عثمانؓ کے فتنہ نے یہ بھی ظاہر
کر دیا، کہ حرم ابراہیمی کی طرح، حرم محمدی بھی سیاست گاہِ اقوام بننے کے لائق نہیں،
چنانچہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی بنا پر دارالخلافہ کو مدینہ منورہ
سے کوفہ میں منتقل کر دیا، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جب ان کے برخلاف مکہ کو
سیاسی مرکز بنایا، تو نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، اب بھی غور کرو،
کہ اگر شریف حسین کی حکومت برقرار رہنے یا باہر سے کوئی دوسری سلطنت حملہ آور
ہو، تو خانہ کعبہ کی توہین اور بربادی کے سوا اور کیا صورتِ حال ہو سکتی ہے، ہر دارالسلطنت
فسق و فجور، نمائش و تمدن، فتنہ و فساد، دنیاداری اور گنہ گاری کا مرکز اور مرجع ہوتا ہے، پھر
کیا اے مسلمانو! ارضِ حرم میں بھی یہی منظر دیکھنا چاہتے ہو، فاعتبروا یا اولی الابصار۔

(معارف، نومبر و دسمبر ۱۹۲۳ء)

پیغامِ امن

یعنی محبتِ الٰہی اور مذہبِ اسلام

اسلام دُنیا میں خدا کا آخری پیغام ہے، وہ دُنیا میں مذہب کی تکمیل ہے، وہ اپنے پیغمبر کے الفاظ میں دینِ الٰہی کی عمارت کا آخری پتھر ہے، وہ فطرت ہے اور فطرت کے مطابق ہے، وہ دُنیا میں اس وقت صلح و امن کا جھنڈا اُڑاتا آیا، جب دنیا خاک و خون میں لتھڑی ہوئی تھی، وہ اُس خدا کا منادی ہے، جو رحم مجسم، عدل مجسم، نیکی محض، خیرِ کل اور امن و امان ہے، وہ ظلم و ستم، بے اطمینانی و اضطراب، شک و شبہ کے طوفانوں سے بھاگ کر امن و شادی کے طلبگاروں کو ایک ہی پناہ کی جگہ بتاتا ہے، ففروا الی اللہ (۵۱:۵) ہر طرف سے بھاگ کر اللہ کی طرف جاؤ۔

مخالفین کی نکتہ چینی اس حقیقت کے باوجود یہ کس قدر افسوسناک ہے کہ ....

.... منجملہ ان اعتراضات کے جو نہایت فخر و غرور اور طعن و طنز کے ساتھ مسیحی مبلغین اور یورپین مستشرقین اسلام پر کیا کرتے ہیں، ایک یہ ہے کہ اسلام نے خدا کا جو تخیل اپنے پیرووں کے سامنے پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک جبار، قہار، پُر غضب صاحبِ جلال و جبروت شاہنشاہ ہے، جس سے ہمیشہ بندوں کو ڈرتے اور کانپتے

رہنا چاہیے، اور اسی کا اثر اس کے تمام احکام میں نمایاں ہے، برخلاف اس کے عیسائی مذہب اس کو محبت، پیار، رحمت اور شفقت کے پیکر میں جلوہ گر کرتا ہے، اور اسی لیے اس کو "باپ" کے نام سے پکارتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی نصیحتوں میں نرمی اور رحم وکرم کا جذبہ غالب ہے۔

مستشرقین اسی اعتراض کو اسی صورت میں پیش کرتے ہیں، کہ چونکہ اسلام ایک جنگجو مذہب ہے اس لیے اس کے تخیل میں خدا کی جباری وقہاری اور غیظ وغضب کا تصور سب سے زیادہ ہے، اور اسلام کی یہی کمی تھی جس کو تصوف نے آکر پورا کیا، اور بجائے اس کے کہ فقہاء کی طرح خدا کی اطاعت کا مبنیٰ خشیت اور خوفِ الٰہی کو قرار دیا جائے، انھوں نے خدا کے عشق ومحبت کو قرار دیا۔

ناآشنایانِ اسلام کو، اسلام کے متعلق بحث وکاوش کرتے ہوئے یہ نکتہ ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے، کہ وہ محض تخیلی اور خیال آرائی کا مذہب نہیں ہے، بلکہ وہ اس عملی دنیا کا عملی مذہب ہے، دنیا میں کروڑوں انسان ہیں، ہر انسان کے پیچھے ہزاروں کام ہیں، اور انسان کے ہر کام کا تعلق دوسرے انسان سے ہے، ان دونوں انسانوں میں کوئی باہمی تعلق ایسا ہونا چاہیے، جو ایک کو دوسرے سے پیوستہ کردے، ایک کو دوسرے کی طرف جھکادے، اور ایک کا رشتہ دوسرے کے ساتھ جوڑ دے، اس تعلق اس پیوستگی اور اس رشتہ کو جو چیز پیدا کرتی اور قائم رکھتی ہے، وہ محبت اور خوف کا جذبہ ہے، اسی کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ وہ نفع کی طرف رغبت اور ضرر سے نفرت ہے،

غرض انسان کی تمام تحریکات کا سرچشمہ محبت و خوف اور رغبت نفع و نفرت ضرر ہے، خدا اور اس کے صفات کے متعلق انسان کے جو خیالات اور تصورات ہیں، وہ بھی اسی اصول کے ماتحت ہیں، وحشی اقوام کے مذہبی خیالات پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ مناظر اور موجودات فطرت کی پرستش اسی اصول کے مطابق کرتی ہیں، بعض چیزوں سے وہ ڈرتی ہیں، تو وہ ان کی پوجا کرتی ہیں، کہ ان کے ضرر سے محفوظ رہیں، بعض دوسری اشیاء کے لطف و کرم کی متوقع ہوتی ہیں، کہ وہ ان کے منافع سے بہرہ اندوز ہوسکیں،

اب عام انسانی معاملات اور کاروبار پر غور کرو، کہ انسان کی موجودہ فطرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ دنیا کا یہ نظام صرف محبت اور رغبت کے جذبات سے چل سکے، اگر ایک دن بھی دنیا کے بازاروں، سلطنتوں کے دفاتر اور قوموں اور جماعتوں کی مجلسوں اور سوسائٹیوں میں تنہا اس پر عمل ہو، تو نظام عالم درہم و برہم ہوجائے، اور اطاعت و فرمانبرداری کا سب سے بڑا رکن اور ضابطہ داری (ڈسپلن) کا دار و مدار ہے، خاتمہ ہوجائے، اسی طرح اگر صرف نفرت و عداوت اور خوف و خشیت تمام تر عالم کے کاروبار میں دخیل ہوجائے، تو یہ دنیا جہنم کا طبقہ بن جائے، اور دلوں کی شگفتگی اور انبساط جو ہماری سرگرمیوں اور ولولوں کا مایۂ حیات ہے، دفعۃً فنا ہوجائے، اس لیے دنیا کا نظام ان دوگونہ جذبات کے بغیر کبھی قائم نہیں رہ سکتا، اور انسان اپنے ہر عمل میں ان دونوں کے سہارے کا محتاج ہے،

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب قائم تھے، ان میں افراط و تفریط پیدا ہوگئی تھی،

اور صراطِ مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے۔ یہودی مذہب کی بنا سرتا پا خوف خشیت اور سخت گیری پر تھی، اس کا خدا "فوجوں کا سپہ سالار، اور باپ کا بدلہ پشتہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا" یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر شاذ و نادر کہیں نظر آئے گا، اس کے برعکس عیسائیت تمام تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور ہے، اس کے "اکلوتے بیٹے کا باپ" تمام انسانوں کا باپ ہے، وہ اپنے "فرزندوں" کے جرم و خطا سے غضبناک نہیں، بلکہ پشیمان اور متاسف ہوتا ہے،

اس افراط و تفریط کا نتیجہ یہ ہے کہ یہودیت ایک خشک اور بے لذت مذہب بن گیا، اور عیسائیت اس قدر تر ہے کہ تردامنی اس کے نزدیک عیب نہیں رہتی، ایک گنہگار عورت کو یہودیت سنگسار کرنے کا حکم دیتی ہے، لیکن عیسائیت صرف اسی قدر کہتی ہے کہ "جو گنہگار نہ ہو، وہ اس عورت کو پتھر مارے اور اے عورت! جا! پھر ایسا نہ کرنا"، مگر اسلام ان میں تفریق کرتا ہے، مجبور و مجنون و مدہوش وغیرہ مستثنیٰ ہیں، بے شوہر عورت اور بن بیوی کے مرد کو کوڑے مارے جائیں، شوہر والی عورت اور بیوی والا مرد سنگسار ہوگا، یہودی مذہب کسی باز پرس کے بغیر ہر حال میں مرد کو طلاق کی اجازت دیتا ہے، مذہب عیسوی کسی حال میں طلاق کا فتویٰ جاری نہیں کرتا، اسلام اس کے متعلق تفصیلی احکام رکھتا ہے، غرض یہی حال اسلام کا تمام دیگر مسائل میں ہے، کہ وہ عیسائیت اور یہودیت کے درمیان ہمیشہ بیچ کی راہ اختیار

کرتا ہے،

یہی حال اعتقادیات کا ہے، وہ نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج، اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے، اور نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ، یا محمد صلعم کا باپ سمجھتا ہے، اور تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کے صفات سے متصف کرتا ہے، وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے، کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے، اور رحمان و کریم بھی ہے، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے، اور غفور و رحیم بھی ہے، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے، اور پیار بھی کرتا ہے، بگاڑتا بھی ہے اور نوازتا بھی ہے، نفع اور نقصان دونوں اسی کے ہاتھ میں ہے، اس سے ڈرنا بھی چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے،

کسی حسین اور محبوب چیز کی نسبت اگر اس کے عاشقوں اور محبت کرنے والوں سے پوچھا جائے، کہ اس کی کون سی ادا تم کو پسند آئی، اس کے کس حصہ میں تم کو حسن و جمال کا منظر نظر آتا ہے، اس کے کس حسن و خوبی نے تم کو فریفتہ کیا ہے، تو یقیناً پوری جماعت کا ایک ہی جواب نہ ہوگا، کوئی کسی حصہ کا نام لے گا، کوئی کسی ادا کی تعریف کرے گا، کوئی کسی خوبی کا اپنے کو شیدا بتائے گا، اسی طرح دنیا میں جو پیغمبر آئے، وہ کئی قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے خدا کے صرف جلال و کبریائی کا جلوہ تھا، اور اس لیے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ، دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے، اور وہ لوگوں کو اسی خمخانۂ عشق

کی طرف بُلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ہستی آئی جو برزخ کبری، مجمع کمال، اور جامع مستی و ہشیاری تھی، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ایک طرف آپؐ کی آنکھیں خوفِ الٰہی سے اشک آلود رہتی تھیں، دوسری طرف آپؐ کا دِل خدا کی محبت اور رحم وکرم سے مسرور تھا، کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر لوگوں کو نظر آجاتے۔ چنانچہ جب راتوں کو آپؐ شوق وولولہ کے عالم میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے، قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبانِ مبارک پر ہوتیں، آیتیں گذرتی جاتیں، جب کوئی خوف وخشیت کی آیت آتی پناہ مانگتے۔ اور جب کوئی مہر ومحبت اور رحم وبشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعاء مانگتے[1]۔

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ خوف وخشیت اور رحم ومحبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے، اسی لیے کہا گیا ہے، کہ الایمان بین الخوف والرجاء "ایمان کامل خوف اور اُمید کے درمیان ہے"، کہ تنہا خوف، خدا کے رحم وکرم سے نااُمید بنا دیتا ہے، اور محض رحم وکرم پر بھروسہ لوگوں کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے، جیساکہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں ہم کو تم کو اور سب کو نظر آتا ہے، اور مذہبی حیثیت سے عملاً اس کے نتائج کا مشاہدہ یہودیوں اور عیسائیوں

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۹۳

میں کیا جا سکتا ہے، ایک ناامید محض اور دوسرا سراپا امید ہے

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا، اور اپنے کو "فرزند الٰہی" کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا، اور حضرت عیسیٰؑ کے جوڑ پر، حضرت عزیرؑ کو "فرزند الٰہی" کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا،

نحن ابناء اللّٰہ واحباؤہ (مائدہ)
ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا،

قل فلم یعذبکم بذنوبکم بل انتم بشر ممن خلق۔ (مائدہ)
اگر ایسا ہے تو خدا تم کو تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے، اس لیے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں، بلکہ تم بھی انہی انسانوں میں سے ہو، جن کو اس نے پیدا کیا،

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا،

یاایھا الذین ھادوا ان زعمتم انکم اولیاءُ للّٰہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین۔ (جمعہ۔۲)
اے وہ جو یہودی ہو، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو، کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو، تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی

تمنا کیوں نہیں کرتے۔

اسلام رحمت الٰہی کے تنگ دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے، ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر دعا کی کہ "خدایا! مجھ کو اور محمد کو مغفرت عطا کر۔" آپ نے فرمایا "خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا[1]" ایک اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی، کہ خدایا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر، آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا "یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ[2]"

اسلام کے متعلق عیسائیوں نے جو یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے، کہ اس کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے مبرا ہے، اس غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ اسلام عیسائیت کی اس اصطلاح اور طرز ادا کو سخت ناپسند کرتا ہے، جس کے ذریعہ سے وہ خدا کے ان اوصاف کو نمایاں کرتی ہے، یعنی باپ اور بیٹے کا لفظ کہ اس سے گمراہی پھیلتی ہے، یہ گمراہی کچھ عیسائیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اور دوسرے فرقے بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں،

اصل یہ ہے کہ خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو یہ فرقے اپنی بولی میں نمایاں کرنا چاہتے ہیں، یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی رشتوں کے ذریعہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب [2] ابوداؤد کتاب الادب،

سے نمایاں ہوتے ہیں، اس بنا پر بعض کوتاہ اندیش فرقوں نے اس طریقۂ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا، اس لیے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا، اور دیبیاں انسانوں کی مائیں بنیں، خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شوہر کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے، جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پُراثر منظر اور ناقابلِ شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں، اس لیے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شوہر کی اصطلاح سے ادا کیا جاتا ہے، سدا سہاگ نقرا، اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

دیکھو! یہ تمام فرقے جنھوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا، وہ کس قدر راہ سے بھٹک گئے، اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام کو بلکہ خواص تک کو گمراہ کر دیا، اور لفظ کی اصلی رُوح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گیے، اسی لیے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا، ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی اور خدا کے لیے ان الفاظ کا استعمال اس نے ضلالت اور گمراہی قرار دیا، لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کو اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے، اس کا

انکار نہیں کرتا، بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے، اور ان سے بھی زیادہ کا طالب ہے۔

فاذکروا اللہ کذکرکم آباءکم، او اشد ذکرا۔ (بقرہ۔ ۲۰)

تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔

بہرحال رحم و محبت کے اس جسمانی طریقۂ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا، کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں جانتا، کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں، ان کے تمام خیالات اور تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں، اس لیے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور، کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہو سکتا، اور نہ اس کے لیے ان کے لغت کا کوئی ایسا لفظ ل سکتا ہے جو اصل غیر مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے، جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو، انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے، اور اس طرح ان ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے،

اس "ان دیکھی ہستی"، کی ذات و صفات کے متعلق جس کو تم خدا کہتے ہو،

ہر مذہب میں ایک تخیل ہے، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا، کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے
پیرووں کے گرد وپیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے، لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب
کا کام یہ ہے، کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے
اس حد تک پاک و منزہ کر دے، جہاں تک بنی نوع انسان کے لیے ممکن ہے،
خدا کے متعلق، ماں، باپ اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے،
کہ اس تخیل کے معتقد ناممکن ہے کہ خالص توحید کے صراطِ مستقیم پر قائم رہ سکیں،
اس لیے اسلام نے یہ کیا، کہ ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے الفاظ کو
خالق و مخلوق کے اظہار ربط و تعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا، بلکہ ان کا
استعمال بھی شرک و کفر قرار دیا، تاہم چونکہ حقائق روحانی کا اظہار بھی انسانوں
ہی کی مادی بولی میں کرنا ہے، اس لیے اس نے جسمانی و مادی رشتہ کے ان جذبات،
احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقات مابین کے اظہار کے لیے
مستعار لے لیا، جن کا اظہار دوسرے مذاہب نے ان رشتوں کے ذریعہ کرنا
چاہا تھا، اور اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کیے بغیر
ربط و تعلق کا اظہار اس نے کیا، اور انسانوں کو استعمالات کی لفظی غلطی سے جو
گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں، ان سے ان کو محفوظ رکھا،

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لیے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں،
جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے،

اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے، تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کیے گیے ہیں، ہر قوم نے اس علم اور نام کے لیے اسی وصف کو پسند کیا ہے، جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی،

اسلام نے خالق کے لیے جو نام اور علم اختیار کیا ہے، وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے، اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے، مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے، کہ یہ ولاۃ سے نکلا ہے، ولاہ اور ولہ کے اصل معنی عربی میں اس "غم، محبت اور تعلق خاطر" کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے: اسی سے بعد کو مطلق "عشق و محبت" کے معنی پیدا ہو گئے، اس لیے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں، جس کے عشق و محبت میں کائنات کے دل سرگرداں، متحیر اور پریشان ہیں، حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادیؒ، قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے۔ اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں "من موہن" یعنی دلوں کا محبوب" کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے، وہ "رحمان" اور "رحیم" ہے، ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں، یعنی "رحم والا"، مہربان، لطف و کرم والا" اور پھر یہی اوصاف قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں ہیں جن کے پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے،

۔ کیا اس سے بڑھ کر، اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لیے کوئی دلیل مطلوب ہے، لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں خدا کا دوسرا علم یہی لفظ "رحمان" ہے، جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا لفظ ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بیسیوں اوصافی نام ہیں، احادیث میں اس کے ننانوے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں، ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آ گئے ہیں، لیکن استقصا کرو، تو معلوم ہوگا، کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے، جن میں اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف الودود (سورۂ ذات البروج) آیا ہے، جس کے معنی "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں، کہ وہ سرتاپا مہر و محبت اور عشق و پیار ہے، اس کے سوا خدا کا ایک اور نام الولی ہے، جس کے لفظی معنی یار اور دوست کے ہیں، خدا کا ایک اور نام قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے، وہ الرؤف ہے، رؤف کا لفظ "رافت" سے نکلا ہے، رافت کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر کے ہیں، جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کے لیے قرآن مجید میں ایک اور نام حنان آیا ہے، جو حن سے مشتق ہے "حن" اور "حنین" اس سوز دل اور محبت کو کہتے ہیں، جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور مستعارانہ معانی کو ظاہر کرتے ہیں، جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے اختیار کیے ہیں۔

ان کے علاوہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں اللہ تعالیٰ کے جو اسماء اور صفات مذکور ہیں، ان کو بھی اس موقع پر پیش نظر رکھنا چاہیے، اس کا نام غفار (بخشش کرنیوالا) غفور (بخشنے والا) سلام (امن و سلامتی) ہے کہ وہ سرتاپا اپنے بے پناہ بندوں کے لیے امن اور سلامتی ہے، پھر وہ مومن (امن دینے والا) ہے، وہ العدل یعنی سرتاپا انصاف ہے، العفو (معاف کرنے والا) ہے، الوہاب (عطا کرنے والا) الحلیم (بُرد بار) الصبور (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) التواب (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا) البر (نیک اور مجسم خیر) اور المقسط (منصف اور عادل) ہے۔

تورات کے اسفار اور انجیل کے صحیفوں کا ایک ایک ورق ڈھونڈو، کیا اللہ تعالیٰ کے لیے یہ پُر محبت، یہ سراپا مہر و کرم اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی، اسلام اللہ تعالیٰ کے لیے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس لطف و احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے وہ بے بہرہ نہیں، جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایۂ روحانی سمجھتے ہیں، مگر بات یہ ہے کہ ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ وہ شرک و کفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسان کو بچانا چاہتا ہے، جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتاپا روحانی معانی کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں، اور اس لیے وہ اس بلند تر توحید کی سطح سے بہت نیچے گر کر سررشتۂ حقیقت کو ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں۔

اسلام متکلم ازل کا آخری پیغام ہے، اس لیے ضرورت تھی، کہ وہ اس قسم کی لغزشوں سے پاک اور مبرا ہو، حقائق روحانی کی تعبیر کے لیے یقیناً مادی اور جسمانی استعارات اور مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی مذہب کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تعلیم کو ان استعمالات کی غلطیوں اور غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے، چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات اور مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ، ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کر دیا ہے، قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق و محبت کے ان دلآویز اور زلولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بایں ہمہ وہ انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہتا، کہ وہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لیے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اب (باپ) کے بجائے "رب" کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے،

اب اور رب، ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو، تو معلوم ہوگا، کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل، اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہے، اب یعنی باپ کا تعلق، اپنے بیٹے سے ایک خاص کیفیت اور مدت سے لے کر، ایک محدود عرصہ تک رہتا ہے، اس کے وجود میں اس کو یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے مگر اس کے قیام و بقا، زندگی، ضروریاتِ زندگی، سامانِ حیات، نشوونما اور ارتقار کسی چیز میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی، عہد طفلی تک شاید کچھ اور واسطہ ہو، اس کے بعد تو بچہ اپنے والدین

سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو، کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے، اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے، کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لیے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے، کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے؟

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے، جو آغاز سے انجام تک قائم رہتا ہے، جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گویا عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر موجودات کا ہاتھ پکڑے رہتا ہے، وہ ذرہ ہو یا پتھر، قطرۂ آب ہو، یا قطرۂ خون، یا مضغۂ گوشت ہو یا منبت استخوان، شکم مادر میں ہو، یا ابن اپنے باہر، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ، رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے استغنا اور بے نیازی نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے، اس سے لفظ رب یک قلم پاک ہے، اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں، جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

اب ہم کو ان آیتوں اور حدیثوں کو آپ کے سامنے پیش کرنا ہے، جن سے روشن ہو کہ اسلام کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے۔

اور وہ خم خانۂ الست کی سرشاری کی یاد بھٹکے ہوئے انسانوں کو کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت "حبِ الٰہی" ہے، اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبانِ الٰہی نے شہادت دی،

والذین آمنوا اشد حبا للّٰہ (بقرہ ۱۷)　　وہ جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں،

اس نشۂ محبت کے سامنے باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان، مال، خاندان رشتہ کو قربان اور نثار ہو جانا چاہئے، ارشاد ہوتا ہے،

ان کان آباءکم وابناءکم و　　اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، اخوانکم وازواجکم وعشیرتکم　　تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو واموالِ اقترفتموھا وتجارۃ　　تم نے کمائی اور وہ سوداگری جس کے مندا تخشون کسادھا ومسٰکن ترضونھا　　پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے، خدا اور اس کے احب الیکم من اللّٰہ ورسولہ　　رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ وجہادٍ فی سبیلہ فتربصوا حتی　　محبوب اور پیارا ہے، تو اس وقت تک انتظار یاتی اللّٰہ بامرہٖ (توبہ)　　کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی، تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے، چنانچہ جو لوگ کہ راہِ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے، اُن کو پکار کر سنا دیا گیا،

يا أيها الذين آمنوا من يرتد منكم عن دينه فسوف يأتي الله بقوم يحبهم ويحبونه (مائدہ - ۸) مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائے گا، تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں، وہ اپنے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا، جن کو وہ پیار کرنے گا، اور وہ اس کو پیار کریں گے۔

لیکن جیسے حضرت مسیح نے کہا، درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے، تم کو رید کی محبت کا دعویٰ ہے، مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو کون تمہارے دعوی کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں، مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے،

قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله (آل عمران) اگر تم کو خدا سے محبت ہے، تو میری پیروی کرو، کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔

طبقات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے۔

إن الله يحب المحسنين (مائدہ) خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،

ان اللہ یحب التوابین (بقرہ)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
ان اللہ یحب المتوکلین (آل عمران)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
ان اللہ یحب المقسطین (مائدہ)	خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔
ان اللہ یحب المتقین (توبہ)	خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔
ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ (صف)	خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستہ میں لڑتے ہیں۔
واللہ یحب الصابرین (آل عمران)	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
واللہ یحب المتطہرین (توبہ)	اور خدا پاک وصاف لوگوں کو پیار کرتا ہے،

دنیا کے عیش و مسرت، باغ و بہار، شادی و خوشی میں اگر کوئی خیال کا نٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغص بنا کر، بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے، تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے، پہلے کا نام حزن و غم ہے اور دوسرے کا نام خوف و دہشت ہے، غرض غم اور خوف یہی وہ کانٹے ہیں، جو انسانیت کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہے ہیں لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں، ان کو بشارت ہے کہ ان کا چمنستان عیش اس خارزار سے پاک ہوگا،

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون (یونس)	ہاں خدا کے دوستوں کو نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے،

محبت کا جو جذبہ بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگذر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے، اس کا نام رحم اور رحمت ہے، اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے، اس کی رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے، اس کا نام رحمان و رحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے، وہ نہ ہو تو کچھ نہ ہو، اسی لیے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے، مجرم سے مجرم اور گنہ گار سے گنہ گار کو وہ نوازنے کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار ہے، گنہگاروں اور مجرموں کو وہ اپنے بندے کہہ کر تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے،

قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللّٰہ ان اللّٰہ یغفر الذنوب جمیعاً انہ ھو الغفور الرحیم (زمر)

اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے، کہ وہ بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے،

فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بشارت سناتے ہیں، تو کہتے ہیں،

ولا تکن من القانطین

ناامیدوں میں سے نہ ہو،

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے، کہ مرتبۂ خلت محبت سے مافوق ہے، جواب دیا۔

ومایقنط عن رحمۃ ربہ الا القوم

اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا

الضالون۔ کوئی اور مایوس نہیں ہوتا،

خدا پر بندوں کی جانب سے کوئی پابندی عائد نہیں، مگر اس نے خود اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر کچھ چیزیں فرض کرلی ہیں، منجملہ ان کے ایک رحمت ہے، خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، وہ گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، وہ سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب ہے، وہ قاہر ہے، وہ جبار ہے، وہ منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور ہے، رحمان و رحیم ہے، رؤف و عفو ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود بخود عائد کرلی ہے، اور اپنے اوپر اس کو فرض گردان لیا ہے۔

کتب علی نفسہ الرحمۃ۔ اللہ نے از خود اپنے اوپر مہربانی کرنے کو لازم کرلیا ہے۔ (انعام)

خاص قاصد کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ، اور تسلی کا یہ پیام دو کہ اس کا باب رحمت ہر وقت کھلا ہے۔

واذا جاءك الذین یؤمنون بآیتنا فقل سلام علیکم کتب ربکم علی نفسه الرحمة انه من عمل منکم سوء بجهالة ثم تاب من بعده واصلح فانه غفور رحیم۔

اے پیغمبر! جب تیرے پاس وہ آئیں، جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں، تو ان کو کہہ کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کرلیا ہے، کہ جو کوئی تم میں سے براہ نادانی

برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد توبہ کرے اور

نیک بنے تو بے شک وہ بخشنے والا اور رحم

کرنے والا ہے۔ (انعام)

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں،

ورحمتی وسعت کل شئ (اعراف) اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرتی ہے۔

بخاری و ترمذی وغیرہ صحیح حدیثوں میں ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا، تو اس نے اپنے دست خاص سے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی، ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے، تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا، اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا" یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے۔

بارگاہِ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے، کہ "اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے، میں تمہیں بخشتا رہوں گا، خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی چاہو، تو میں معاف کر دوں خواہ تم میں کچھ ہی عیب ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے

بھری ہو، پھر تم ہمارے پاس آؤ، اور میرا کسی کو شریک نہ بناتے ہو، تو میں بھی تمہارے پاس پوری زمین بھر مغفرت لے کر تمہارے پاس آؤں،" کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے،

حضرت ابوایوب صحابی کی وفات کا وقت جب قریب آیا، تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا اور مخلوق پیدا کرتا، جو گناہ کرتی کہ وہ اس کو بخشتا، یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لیے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے، کہ نکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں، مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے،

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں، جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں، قرابت داروں، اولادوں میں میل ملاپ اور رسم و محبت ہے، اور جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے یہ مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہد حقیقی کے سرمایۂ محبت کا کتنا حصہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کیے، ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے وہ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں، باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں[1]" اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں۔ اور کس نے گنہگار انسانوں کے

---

[1] یہ حدیثیں دوسری صحیح کتابوں میں بھی ہیں، مگر پیش نظر اسوقت جامع ترمذی ابواب الدعوات ہے،

مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے؟ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے، کہ ایک شخص شراب خواری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہ نے تنگ آکر کہا "خداوندا! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر، کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے"، رحمۃ للعلمین کو صحابہ کی یہ بات ناپسند آئی، فرمایا "اس پر لعنت نہ کرو، کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے"۔

ابن ماجہ میں ہے کہ مدینہ میں ایک غریب مسلمان نے وفات پائی، اس کا غم کس نے کیا ہوگا؟ ہاں اس دل نے جو دنیا کا غمخوار بن کر آیا تھا، اس کے فراق ظاہری سے چہرۂ مبارک پر اندوہ و ملال کے آثار تھے، صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے، فرمایا "ہاں کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت تھی"۔ اس غریب میں اس محبت کا اثر یہ تھا، کہ وہ ہمیشہ زور زور سے قرآن پڑھا کرتا تھا، صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، کہ آپؐ نے ایک صاحب کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا تھا، وہ جب نماز پڑھاتے تھے، تو ہر نماز میں ہر سورہ کے آخر میں قل ہو اللہ ضرور پڑھتے تھے، جب سفر سے یہ جماعت لوٹ کر آئی، تو خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اس نے یہ واقعہ عرض کیا، فرمایا ان سے پوچھو کہ آخر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، لوگوں نے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: کہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت بیان ہے، تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے"، فرمایا "ان کو بشارت دو کہ وہ رحم والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے"۔

یہ بشارت اسلام کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے، اس قسم کا دوسرا واقعہ ایک اور انصاری کا ہے، وہ قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے، وہ ہر رکعت میں پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے۔ پھر دوسری سورہ پڑھتے تھے، ان کے مقتدیوں نے ان پر اعتراض کیا، انھوں نے کہا، تمہاری امامت چھوڑنے کو تیار ہوں، مگر اس سورہ کا ہر رکعت میں پڑھنا نہیں چھوڑ سکتا، بالآخر یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، آپؐ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی، عرض کی یا رسول اللہ! اس میں رحم والے کی صفت ہے جو مجھے محبوب ہے، فرمایا یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی۔

(بخاری کتاب الصلوٰۃ)

المرء مع من احب صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے، کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا، کہ "یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی،" فرمایا "تم نے اس کے لیے کیا سامان رکھا ہے؟" نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا، نہ روزوں کا، اور نہ صدقات وخیرات کا بڑا ذخیرہ ہے، جو کچھ سرمایہ ہے وہ خدا اور رسول کی محبت کا ہے اور بس" فرمایا "تو انسان جس سے محبت کرے گا، وہ اسی کے ساتھ رہے گا، صحابہؓ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا، جب خدا کسی بندے کو چاہتا ہے تو فرشتۂ خاص جبریل سے اس کا تذکرہ کرتا ہے، کہ میں فلاں بندے کو پیار کرتا ہوں،

تو جبریل بھی اس کو پیار کرتے ہیں، اور آسمان میں پکار دیتے ہیں، کہ خدا اس بندہ کو پیار کرتا ہے، تم بھی پیار کرو، تو آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں، اور پھر زمین میں اس کو ہر دل عزیزی اور حسن قبول حاصل ہوتا ہے،

ترمذی میں ہے، کہ حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں، کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرا بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو اس قدر ڈھونڈتا ہے، کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، یہاں تک کہ میں اس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے، وہ کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے"۔

امام بزار نے مسند میں حضرت ابوسعیدؓ سے روایت نقل کی ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے، یہ وہ لوگ ہیں، جن کو خدا سے محبت ہے، اور جن کو خدا پیار کرتا ہے، وہ اچھی باتیں بتاتے ہیں، اور بری باتوں سے روکتے ہیں" الخ۔

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ آپؐ نے فرمایا "لوگو! خدا سے محبت کرو، کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے، اور خدا کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو، اور میری محبت کے سبب میرے اہل بیت سے محبت کرو"،

جو کچھ اسلام کی تعلیم تھی، وہ پیغمبر اسلام کی عملی زندگی تھی،

— عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب "حبیب خدا" ہے، دیکھو کہ حبیب و محبوب میں خلت اور محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں، آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں میں اور خلوت کی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے اور کیا مانگتے تھے، کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے، امام احمد اور بزار نے مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں، اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں محبت الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے۔ انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے، لیکن محبوبِ خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں، دعا فرماتے تھے، خداوندا!

اسئلک حبک وحب من یحبک و　　میں تیری محبت مانگتا ہوں، اور جو تجھ سے
حب عمل یقرب الی حبک　　محبت کرتا ہے اس کی محبت اور اس کام کی
(احمد، ترمذی، حاکم)　　محبت جو تیری محبت سے قریب کر دے،
اللھم اجعل حبک احب الی من　　الٰہی! تو اپنی محبت کو میری جان سے، میرے
نفسی واھلی ومن الماء البارد　　اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ
(ترمذی، حاکم)　　میری نظر میں محبوب بنا۔

عرب میں ٹھنڈا پانی، دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے، لیکن حضورؐ کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں سیر ہوتی تھی، وہ صرف محبت الٰہی ہی کا زلالِ خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا، عام انسان روٹی

سے جیتے ہیں، مگر ایک عاشق الٰہی (مسیح) کا قول ہے کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا"، پھر وہ کون روٹی ہے، جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا، حضورؐ دعا فرماتے ہیں۔

اللھم ارزقنی حبک وحب من ینفعنی حبہ عندک (ترمذی) خداوندا! تو مجھے اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہے مجھے روزی کر۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے، مگر جانتے ہو کہ اس راہ کی آخری منزل کیا ہے۔ صحیحین میں ہے،

من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما۔ یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے، تمام ماسوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں،

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں، کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور ان سے اسی طرح محبت کریں، اور چونکہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے، اس لیے وہ یہ سمجھتے ہیں، کہ اسلام محبت الٰہی کے مقدس جذبات سے محروم ہے، لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، کہ یہ نہیں بلکہ اسلام کی بلندی نظر اور محبت کا علوئے معیار ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار کو پست تر اور فروتر سمجھتا ہے، قرآن مجید کی یہ آیت پاک بھی اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جا چکی ہے،

واذکروا اللہ کذکرکم آباءکم او اشد ذکرا۔ تم خدا کو اس طرح یاد کرو، جس طرح اپنے باپ

ذکراً (بقرہ - ۲۵) ... یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بہت زیادہ)

احادیث سے ہمارا یہ دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی ہے، جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آتا ہے، اپنی جان بچا رہا ہے، بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے، اسی حال میں ایک عورت آتی ہے، اس میدانِ حشر میں اس کا بچہ گم ہو گیا ہے، محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے، کہ جو بچہ بھی اس کو سامنے نظر آجاتا ہے، بچہ کے جوشِ محبت میں اس کو چھاتی سے لگا لیتی ہے، اور اس کو دودھ پلا دیتی ہے، رحمۃ للعلمینؐ کی نظر پڑتی ہے، صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں "کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے؟" لوگوں نے عرض کی "ہرگز نہیں" فرمایا "تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے بہت زیادہ محبت ہے" (صحیح بخاری باب رحمۃ الولد)

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے، اور عرض کرتی ہے "یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے، کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟" فرمایا "ہاں! بے شک اس سے زیادہ ہے"، بولی "تو کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی"، یہ سن کر فرطِ اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا "خدا اس بندہ کو عذاب دیتا ہے، جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے" (سنن نسائی باب ما یرجیٰ من الرحمۃ)

آپؐ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں، ایک صحابی چادر میں ایک پرند کو مع اس کے

بچوں کو باندھ کر لاتے ہیں، اور واقعہ عرض کرتے ہیں کہ "یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پہ منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً آکر میرے ہاتھ پر بچوں پر گر پڑی" ، ارشاد ہوا "کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اُس ذات کی جس نے حق کے ساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے" (مشکوٰۃ، بحوالہ ابوداؤد باب رحمۃ اللہ)

ربانی خم خانۂ عشق کا آخری ہوشمند سرشار، ریاض محبت کی بہار جاوداں کا آخری نغمہ خواں، عندلیب، نظارۂ جمال حقیقت کا پہلا مشتاق، مستورازل کے چہرۂ زیر نقاب کا پہلا بند کشا زندگی کے آخری گھنٹوں میں ہے، مرض کی شدت ہے، بدن بخار سے جل رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلانِ خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جاں نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضورؐ کی طرف لگی ہیں، نبوت کے آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعۃً لب مبارک وا ہوتے ہیں، تو یہ آواز آتی ہے، لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برارت کرتا ہوں، کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، میرا پیار صرف ایک ہی ہے، وہی جس نے ابراہیم کو اپنا پیارا بنایا" یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالت نزع میں زبانِ مبارک پر یہ کلمہ تھا" خداوندا! "بہترین رفیق"

(صحیح بخاری وفات)

پروفیسر نکلسن ایک دفعہ غور سے ان صفحات کو پڑھ لیں، یہ سچ ہے کہ اسلام رحمتِ الٰہی کے ساتھ غضبِ الٰہی کا بھی معتقد ہے، مگر یہ جانتے ہو کہ اسلام کے عقیدہ میں اس کی رحمت و غضب کا باہمی توازن کیا ہے، خدا فرماتا ہے،

رحمتی سبقت غضبی (بخاری) میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے،

صلائے عام | اے ربانی عشق و محبت کے طلبگار و! اگر واقعی تمہارے دل فانی محبت سے ہٹ کر کسی باقی کی محبت کے خواہش مند ہیں، اگر درحقیقت تمہیں ازلی وابدی محبوب کی تلاش ہے، اگر دراصل تمہارا جسم نہیں، بلکہ تمہاری روح کسی کی محبت کی سرشاری کے لیے بے تاب ہے تو آؤ، کہ یہ دولت صرف اسلام کے آستانہ پر بٹتی ہے، اور اسی کے خزانہ سے ملتی ہے،

اس نے اس کے حصول کا طریقہ بھی بتا دیا ہے،

ان الذین آمنوا وعملوا الصلحت سیجعل لهم الرحمان ودا (مریم) جو لوگ ایمان لائے، اور نیک کام کیے، عنقریب خدا ان کے لیے محبت پیدا کر دے گا۔

پس "ایمان" اور "عمل صالح" یہی دو چیزیں ہیں، جن سے محبت الٰہی پیدا ہوتی ہے، یا محبت الٰہی کے وجود کے اسباب ہیں، ہمارا ایمان مستحکم ہو اور اعمال نیک ہوں تو اس دولت کے ہم مستحق قرار پائیں،

(معارف ۲۳ جولائی ۱۹۲۳ء)

القرآن والفلسفۃ الجدیدہ

اسلام سے پہلے تمام اہل مذاہب کا یہ مسلّمہ اصول تھا، کہ مذہب میں عقل کو کیا دخل، سیکڑوں علماء اور موجدین صرف اس لئے قتل کیے گئے، کہ اُن کی علمی کوشش کے نتائج مذہبی تعلیمات کے مخالف تھے، وہ لوگ کبھی شہید نہ کیے گئے۔ اور نگاہ حقارت سے نہ دیکھے گئے، جن کے علمی خیالات یا علمی ایجادیں گو تعلیمات مذہبی کی مخالف نہ تھیں، مگر وہ ایسی چیزیں تھیں، جن کا پتہ اُن کی مذہبی کتابوں سے نہیں لگتا تھا۔

اسلام دنیا میں پہلا مذہب ہے، جس نے اپنے مسائل کی بنیاد عقل پر رکھی، قرآن مجید کی طرز تعلیم دیکھو، کہ اس نے اپنے پیرؤں کو جہاں کسی مسئلہ کی تلقین کرنی چاہی ہے، اس کے ساتھ اس کی دلیل بھی بیان کر دی۔ بے تتبع سے ایسی بہت سی حدیثیں اور آیتیں مل سکتی ہیں، جن میں یہ صاف صاف کہا گیا ہے، کہ مذہب کو عقل سے ماننا چاہیے۔

لیهلك من هلك عن بينة ويحيي من حي عن بينة (انفال)	چاہیے کہ مرے تو وہ بھی دلیل سے اور جیے تو وہ بھی دلیل سے۔
لا تقف ما ليس لك به علم.	جس بات کو تم جانتے اس کے پیچھے نہ ہو لیا کرو
قد جاءكم بصائر من ربكم (انعام)	خدا کی طرف سے دلیلیں تمہارے پاس آئیں،

افلا یتدبرون القرآن	کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے،
عن[1] عائشۃ عن جدامۃ امۃ بنت وھب الاسدیۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال هممت ان انھٰکم عن الغیل فنظرت فاذا فارس والروم یغیلون ولا یضر اولادہم	حضرت عائشہؓ ایک صحابیہ سے روایت کرتی ہیں، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے یہ چاہا تھا کہ تم لوگوں کو زمانۂ حمل میں مقاربت کرنے سے روک دوں مگر میں نے جب رومیوں اور فارسیوں کو دیکھا کہ وہ ایسا کرتے ہیں اور اُن کی اولاد کو اس سے ضرر نہیں پہنچا اس لیے نہیں روکا،

اس حدیث سے اس بات پر بخوبی روشنی پڑتی ہے کہ احکام اسلام تمامتر عقلی مصالح پر مبنی ہیں، اسلام کے متعلق یہ آج کوئی جدید خیال نہیں ہے جو زمانہ حال کے مقتضائے مذاق کے موافق پیدا ہو گیا ہو، بلکہ یہ خیال اُس وقت سے ہے جب سے اسلام کی زندگی شروع ہوتی ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب، حجۃ اللہ[2] البالغہ میں ان لوگوں کا جواب دیتے ہوئے کہ احکام اسلام کے لیے عقلی مصالح جب سلف نے نہیں مدون کیے، تو اب کیونکر کیا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں،

---

[1] شرح معانی الآثار للامام الطحاوی جلد ثانی ص ۲۷، اور بخاری جلد اول

[2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۷ مطبوعہ مصر،

قلنا لا یضر ناعدم تدوین	ہم کہتے ہیں کہ سلف کا اس علم کو نہ مدون کرنا
السلف ایاہ بعد ما مھد النبی	کچھ ہمیں مضر نہیں ہے جبکہ خود رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اصولہ و	صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اصول و فروع
فروعہ واقتفی اثرہ فقہاء	ممہد فرما دیے ہیں اور آپ کے بعد فقہائے
الصحابۃ کامیری المومنین عمر	صحابہ نے بھی اس کی تقلید کی جیسے امیر المومنین
وعلی وزید وابن عباس وعائشہ	حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ اور جیسے حضرت زید بن ثابتؓ
وغیرھم رضی اللہ عنھم بحثوا عنہ	اور حضرت عائشہؓ وغیرہم نے اس پر بحثیں کی ہیں،
وابرزوا وجوھاً منہ، ثم لم یزل	اور بہت سی باتیں ظاہر کیں، پھر اس کے
علماء الدین وسلاک سبیل الیقین	بعد بھی ہمیشہ علماء حسب استعداد علمی اس کو
یظھرون ما یحتاجون ما جمع اللہ	ظاہر کرتے رہے،
فی صدورھم۔	

صحابہؓ کے بعد جب پہلی صدی کا آفتاب ڈوب رہا تھا، مسلمانوں کے ایک فرقہ نے اپنی علمی زندگی کا مقصد ہی تطابقِ عقل و نقل قرار دیا تھا، اس کے بعد بھی علماء نے اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں تالیف کیں، خاص اسی خیال کو مدِ نظر رکھ کر ائمۂ دین نے قرآن کی تفسیریں کیں، غالباً اس موضوع پر سب سے پہلے جو تفسیر لکھی گئی ہے، وہ ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر ہے جس کا ذکر تفسیر کبیر رازی میں بار بار آتا ہے، اور اکثر جگہ بلا قصد امام کے قلم سے اس کی تعریف نکل جاتی ہے، مدت سے اس تفسیر کا

ایک نسخہ بھی صفحۂ عالم پر موجود نہیں ہے، تفسیر کشف الاسرار اور شیخ محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ شاگرد امام غزالی کی تفسیر بھی اسی عنوان کے ذیل میں ہے، مگر یہ دونوں کتابیں تکلفاتِ تاویل سے بالکل لبریز ہیں،

اس باب میں سب سے لطیف تصنیف امام رازی کی تفسیر کبیر ہے، گو اس کے صفحات بھی تطابق عقل و نقل سے زیادہ اشاعرہ اور معتزلہ کی خانہ جنگیوں کی نذر ہیں، مگر خیر جو کچھ بھی اس تطابق کے متعلق لکھا ہے، فلسفۂ قدیم کے مقابلہ میں بہت ہی پاکیزہ لکھا ہے،

اب جب سے دنیا میں علومِ جدیدہ کا زور ہے، مسلمانوں میں غلغلہ برپا ہے، کہ قرآن کو سائنس کے حملہ سے بچایا جائے، سائنس نے مذہب کے ارکان متزلزل کر دیئے، اس کا جواب حضرت الاستاذ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی بیش بہا تالیف الکلام میں دیا ہے، ہم اس موقع پر اس کا اقتباس دیتے ہیں۔

"اب دیکھنا چاہیے کہ سائنس کو مذہب سے کیا تعلق ہے، سائنس جن چیزوں کا اثبات یا ابطال کرتا ہے، مذہب کو ان سے مطلق سروکار نہیں، عناصر کس قدر ہیں، پانی کن چیزوں سے مرکب ہے، ہوا کا کیا وزن ہے؟ نور کی کیا رفتار ہے، زمین کے کتنے طبقات ہیں، یہ اور اس قسم کے مسائل، سائنس کے مسائل ہیں، مذہب کو ان سے کچھ سروکار نہیں، مذہب جن چیزوں سے بحث کرتا ہے، وہ یہ ہیں، خدا موجود ہے یا نہیں، مرنے کے بعد اور کسی قسم کی زندگی ہے یا نہیں۔ خیر و شر یا نیکی و بدی کوئی چیز ہے

یا نہیں، ان میں سے کون سی چیز ہے، جس کو سائنس ہاتھ لگا سکتا ہے[1]"

قرآن میں جو مباحث ہیں، وہ اخلاقی، تمدنی اور سیاسی ہیں، یا وہ امور ہیں جن کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ اخلاق پر پڑتا ہے، اور ان کو سائنس سے تعلق نہیں، ہاں ضمنی طور سے قرآن پاک میں سائنس کے جو مسائل آگیے ہیں، وہ خدا کے اظہار قدرت اور لطافتِ صنعت کے موقع پر ہیں، ہم ذیل میں نمبروار ان فلسفیانہ مباحث پر غور کرتے ہیں، کہ آیا وہ واقعی فلسفہ جدیدہ کے مخالف ہیں،

۱۔ علم طبقات الارض (جیالوجی) کے ماہرین بیان کرتے ہیں، کہ موجودہ کائنات سے پہلے کوئی چیز موجود نہ تھی، انسان تھا نہ حیوان، نہ چاند تھا نہ سورج، دنیا کی کل کائنات ایتھر (ائیتھر) تھی یعنی ایک قسم کے چھوٹے چھوٹے ذرات جو ہوا سے بھی زیادہ لطیف ہیں، مدتوں کے بعد قدرت نے ان میں قانون قوتِ جذب ودفع (ٹراکشن) پیدا کیا، اور اس طرح جامد (سولڈ) سائل (لکوئیڈ) ہوائی (گیس) اجسام بنا کر سب سے پہلے اجرام سماوی (ہیولئی باڈیز) کی تکوین کی، قرآن اس مسئلہ پر یوں روشنی ڈالتا ہے،

ثم استوی الی السماء وھی دخان	پھر خدا نے اجرام سماویہ کی طرف توجہ کی،
فقال لھا وللارض ایتیا طوعًا	اس حال میں کہ وہ دھواں تھے، تو کہا ان سے
او کرھًا قالتا اتینا طائعین۔	اور زمین سے کہ آؤ (دستی میں) بخوشی یا بجبر
(فصلت-۲)	بولے کہ ہم بخوشی آئے،

---

[1] الکلام ص ۸۔

کس دلآویز مکالمہ کی صورت میں نبی پاک نے ابتداے آفرینش کا حال بیان کیا ہے، اور اثیتھر کے بیان کرنے کے لیے (دھواں) دخان سے بڑھ کر اور کیا لفظ ہو سکتا ہے،

۲۔ علماے طبقات الارض یہ بھی تسلیم کرتے ہیں، کہ عالم پر ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے، جس میں تمام کائنات ایک گرم اور روشن کرہ کی شکل میں تھی، پھر جتنے کرے عالم میں ہوئے اسی بڑے کرے سے ٹوٹ ٹوٹ کر بنے ہیں، ہماری یہ زمین بھی جس پر ہم آباد ہیں، اسی عظیم الشان کرہ کا ایک ٹکڑا تھی، جو اپنے کرہ سے ٹوٹ کر بنی ہے، جس وقت یہ زمین علیحدہ ہوئی تھی، اسی گرم اور روشن کرہ کی طرح یہ بھی گرم تھی، مگر رفتہ رفتہ سرد ہوتی گئی، اور پھر اس قابل ہوئی کہ اس پر آبادی ہو سکے، قرآن اس کا فلسفہ یوں ظاہر کرتا ہے،

اولم یری الذین کفروا ان السموٰت	کیا کفار نہیں جانتے کہ آسمان و زمین پہلے ایک
والارض کانتا رتقاً ففتقنٰھما،	گولا (کرہ) تھی، تو میں نے ان کو علیحدہ کیا،

چونکہ پہلے فلسفہ کا بہت کم صحیح حصہ دنیا کے سامنے موجود تھا، عموماً حکما کا خیال تھا، کہ آسمان میں خرق والتیام محال ہے، اس بنا پر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں عجیب عجیب باتیں لکھی ہیں،

بعضوں کا خیال ہے کہ آسمان اور زمین کے پھاڑنے کے یہ معنی ہیں کہ آسمان پھاڑ کر پانی برسایا، اور زمین پھاڑ کر سبزیاں اگائیں، ابو مسلم اصفہانی کہتا ہے کہ

فتق مرادف ہے فطور کا، فطور پھاڑنے کو بھی کہتے ہیں اور فطور کا ایجاد سے بھی استعارہ ہے، اس لیے فتق بھی یہاں ایجاد سے استعارہ ہے، اس لیے یہاں پھاڑنے کے معنی ہی نہیں، بلکہ ایجاد کے معنی ہیں، امام رازی اس آیت کے یہ معنی قرار دیتے ہیں، کہ یہ ظاہر ہے کہ آسمان و زمین پہلے معدوم محض تھے، اور فلسفۂ الٰہی کا یہ مسئلہ ہے کہ اشیائے معدوم محض میں آپس میں امتیاز نہیں ہوتا، تو اب اس آیت کے یہ معنی ہوئے کہ آسمان و زمین، سب آپس میں حالت عدم میں گڈمڈ تھے، تو میں نے ان کو جب پیدا کیا تو وہ ایک دوسرے سے ممتاز ہو گئے۔

مگر یہ ظاہر ہے کہ ان مطالب میں تکلف برتا گیا ہے، پہلی تاویل کے موافق اول یہ کہ یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، کہ آسمان و زمین پہلے ایک کرہ تھا، دوسرے یہ کون تسلیم کرے گا کہ پانی برستے وقت آسمان یا اجرام سماویہ میں شگاف پڑ جاتا ہے، ابو مسلم کا قول بھی صحیح نہیں ہے، اول ہم یہی تسلیم نہیں کرتے کہ فطور ایجاد کے معنی میں مجازاً استعمال ہوتا ہے، بلکہ یہ لفظ ایجاد اور شق دونوں معنوں میں مشترک ہے، جیسا کہ کتب لغت کی شہادت ہماری تائید کرتی ہے، اس لیے فتق کو فطور کا مرادف مان کر ایجاد کے معنی میں قرار دینا صحیح نہیں ہے، دوسرے کچھ دیر کے لیے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے، کہ فطور ایجاد کے معنی میں بطور استعارہ کے مستعمل ہوتا ہے، تو یہ کس علم کا اصول ہے، کہ جب دو مرادف لفظوں میں سے ایک مجازاً دوسرے معنی میں مستعمل ہو جائے، تو دوسرے کا بھی اس معنی میں استعمال صحیح ہو،

امام رازی کی تاویل بھی ہمارے خیال میں درست نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ عدمات آپس میں ممتاز نہیں ہوتے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ آپس میں مخلوط بھی ہوں، کیونکہ معدومات امتیاز اور خلط دونوں سے پاک ہیں، اس لیے یہ کسی طور پر صحیح نہیں ہو سکتا کہ "آسمان اور زمین دونوں ایک کرہ تھے، تو میں نے ان کو الگ کیا، [illegible]

ہم نے آیت کے جو معنی قرار دیے ہیں، وہی رائے بجنسہ حضرت ابن عباسؓ اور عظیم المرتبت تابعین کرام کی بھی ہے، جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سلف قرآن کے کس قدر صحیح معنی سمجھتے تھے، گو اس زمانہ کے حکما، اس رائے کو ایک سخت غلطی تصور کرتے ہوں گے، مگر سلف کا ایمان دیکھو کہ ہزار دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، مگر قرآن جس کا ناطق ہے وہ اسی پر یقین رکھتے تھے۔

أحدها وهو قول الحسن وقتادة وسعيد بن جبير ورواية عن عكرمة عن ابن عباس رضي الله عنهم أن المعنى كانا شيئا واحدا ملتزقين ففصل الله بينهما ورفع السماء إلى حيث هي وأقر الأرض (۱)

حضرت حسنؒ، قتادہؒ، سعید بن جبیرؒ کا یہ قول ہے، جس کو عکرمہ نے اور عکرمہ حضرت ابن عباسؓ نے روایت کرتے ہیں، کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ آسمان اور زمین ایک چیز تھی، آپس میں ملی ہوئی تو پھر خدا نے ان دونوں کو علیحدہ کیا، اور آسمان کو بلند کیا، اور زمین کو اپنی جگہ پر رکھا۔

ت۔ یہ مسلّمہ مسئلہ ہے جو بطور مشاہدہ کے ثابت ہو چکا ہے کہ ہمارا ماہتاب بھی ہماری زمین کی طرح ذاتی روشنی نہیں رکھتا، بلکہ وہ اپنی روشنی آفتاب سے حاصل کرتا ہے، اور چونکہ جسم شفاف کا یہ اصول ہے، کہ وہ نور کے جتنے اجزا حاصل کرتے ہیں، اتنے ہی اجزا وہ بھی نشر کرتے ہیں، اس لیے ہمارا چاند آفتاب سے روشنی کے جتنے ذرات لیتا اتنے ہی وہ اپنے مقابل جسم کو دیتا بھی ہے، اس وجہ سے ہمارا چاند جب ہماری زمین کے سامنے ہوتا ہے، تو ہمیں روشن نظر آتا ہے، ورنہ وہ دراصل آفتاب کی طرح ذاتی روشنی نہیں رکھتا، قرآن اس مسئلہ پر یوں روشنی ڈالتا ہے:

وجعل الشمس ضیاءً والقمر نوراً۔ خدا نے آفتاب کو ضیاء (ذاتی روشنی) اور چاند کو نور (غیر ذاتی روشنی) بخشا۔

علماء لکھتے ہیں کہ ضیاء اور نور دو چیزیں ہیں، ذاتی روشنی کو ضیاء اور مستفاد کو نور کہتے ہیں۔[1]

۴۔ فلسفۂ جدیدہ نے ثابت کیا ہے کہ اجزائے مادہ فنا نہیں ہوتے، اور تم جس کو فنا کہتے ہو، وہ دراصل تفرق اجزا ہے، ہم جب کہتے ہیں کہ فلاں چیز فنا ہوگئی، تو وہ دراصل فنا نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنی پہلی نوعی صورت کو چھوڑ کر دوسری صورت اختیار کر لیتی ہے، ہم نے جب پانی گرم کیا، اور اس کی حرارت درجۂ صفر سے ۱۰۱

[1] حاشیہ شرح چغمنی ص، شرح مواقف،

درجہ تک پہنچ جائے گی، تو پانی بخارات بن کر اڑ جائے گا، تو کیا واقعی اس کا پانی بالکل فنا ہو گیا ہے؟ نہیں بلکہ حرارت نے جو قوت دفع کو بڑھانے والی اور قوت اتصال کو کم کرنے والی ہے، اس کے اجزاء کو منتشر کر کے اس کو ہوا بنا دیا، ایک آدمی مر گیا، اور وہ زیر زمین دفن کر دیا گیا، مدت کے بعد اگر ہم اس کی قبر کھودیں گے، تو اس کے جسم کا ایک عضو بھی نہ پائیں گے، تو کیا اس کے اجزاء معدوم محض ہو گئے؟ نہیں بلکہ منتشر ہو گئے، کچھ مٹی میں مل گئے، کچھ بخار بن کر اڑ گئے، قرآن اس نکتہ کو یوں ادا کرتا ہے،

قد علمنا ما تنقص الارض منهم وعندنا کتاب حفیظ (ق)

زمین نے جو کچھ ان کے اجزاء کم کر دیے ہیں، ہم ان کو جانتے ہیں اور ہمارے پاس محفوظ کتاب ہے،

پھر دوسری جگہ یوں فرماتا ہے،

فجعلناهم احادیث ومزقناهم کل ممزق (سبا - ۲)

ہم نے ان کو قصہ کہانی بنا دیا، اور ہم نے ان کو چاک کر ڈالا

خدا نے موت کو اس آیت میں تمزق یعنی انتشار اجزاء سے تعبیر کیا،

۵۔ ہر زمانہ کے فلسفی اس پر متفق رہے ہیں، کہ عالم میں ایک عادی قانون جاری ہے جس کی وجہ سے عالم کے ہر واقعہ کی کڑی دوسرے سے لگی ہوئی ہے، واقعات میں آپس میں ایک ایسا زبردست سلسلہ علل و معلول پایا جاتا ہے، جو دنیا کے

برباد ہوئے بغیر ٹوٹ[1] نہیں سکتا۔ قرآن اس کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے،

ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ۔ خدا کے قانون میں تبدیلی نہ پاؤ گے،

لن تجد لسنۃ اللہ تحویلا۔ تم خدا کے قانون میں تغیر نہ پاؤ گے۔

ان فی خلق السموٰت والارض واختلاف اللیل والنہار لاٰیات لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموٰت والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلاً (آل عمران)

آسمان وزمین کی پیدائش اور شب و روز کے انقلاب میں ان عقلمندوں کے لیے بہت سی دلیلیں ہیں، جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے سوتے یاد کرتے ہیں، اور آسمان وزمین کی ساخت پر غور کرتے ہیں، اور کہتے ہیں، خدایا! تو نے یہ چیزیں بے کار نہیں پیدا کیں،

خود خدائے پاک سبزہ اگنے کی علت پانی کو ٹھہراتا ہے، گو یہ علت خود اسی کے حکم سے کام کر رہی ہے،

وانزل من السماء ماء فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم۔ خدا نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے تمہاری معیشت کے لیے پھل پیدا کیا۔

۶۔ علوم جدیدہ کے مطابق اگر زمین ہلکی ہو جاتی تو آفتاب کی قوت کشش سے

---

[1] خدا کی قدرت سے اس کا توڑنا باہر نہیں ہے، پر اس کی عادت نہیں کہ توڑ دے، نیز یہ تمام علل و معلول کا اس قدر مناسب سلسلہ اسی کی کامل قدرت کا کرشمہ ہے،

کھنچ کر زمین آفتاب سے جا ملتی، یا آفتاب سے قریب ہو جاتی، اور یہ دونوں خوفناک صورتیں ایسی تھیں کہ جن کی وجہ سے انسان کبھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے بڑے بڑے پہاڑوں کا زمین میں اضافہ کر کے زمین میں ثقل کو جو کشش کا ایک نتیجہ ہے زیادہ کر دیا، قرآن اس کو یوں بتاتا ہے،

والقینا فیھا رواسی　　ہم نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں۔

فجعلنا فی الارض رواسی ان　　تو زمین میں ہم نے پہاڑوں کے کھونٹے نصب

تمید بھم　　کر دیئے تاکہ وہ ان کو لے کر مائل نہ ہو جائے

(حرکت نہ کر جائے)

۷۔ فلاسفۂ حال بڑے زور سے یہ دعویٰ کرتے ہیں، کہ احساسات و ادراکات (فیلنگ) سے صرف انسان ہی فیضیاب نہیں ہے بلکہ حیوانات بھی اس فیض سے محروم نہیں ہیں، حیوان بھی ہماری طرح ادراک و شعور رکھتے ہیں، اور نفع و نقصان کو خوب سمجھتے ہیں، وہ بھی مقدمات کو ترتیب دے کر ایک نتیجہ پیدا کرتے ہیں، بلکہ بعض حیوان کے حاسے انسان سے زیادہ مدرک اور تیز ہیں، چیونٹی ہم سے زیادہ قوت شامہ رکھتی ہے، چیل کی قوت باصرہ انسان سے بدرجہا زیادہ ہے، کتے کی قوت سامعہ ہم سے قوی ہے، وہ اکثر زمین پر کان رکھ کر ذرات ارض کے صدمہ کو محسوس کر کے دور کی آوازیں سن لیتا ہے، بعض حیوانات ایسی ایسی صنعتیں کرتے ہیں، جو ہرگز کسی بے عقل کے بس کا کام نہیں، ذرا مکڑے کے جالے کو غور کرو، اس کے باریک

تارکیونکر تیار ہو گئے، اور پھر اُس جالے کی وقتِ صنعت کو دیکھو، اسی طرح ہر
جانوروں کے اعمال پر نگاہ غور ڈالو تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کا کوئی کام بدسلیقگی پر دال
نہیں ہے، بلکہ ان کی بعض صنعتیں ایسی ہوتی ہیں، جن کی مثال ہم انسان نہیں بنا سکتے،
شہد کی مکھیاں متمدن انسان کی طرح اپنا ایک بادشاہ منتخب کرتی ہیں جس کی
اطاعت اپنا فرض جانتی ہیں، ناتوان حیوانات درندوں سے کیوں ڈرتے ہیں، اگر
ہماری طرح مقدمات ترتیب دے کر یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ یہ ان کو تکلیف پہنچائے گا،
اور جو تکلیف پہنچائے اُس سے ڈرنا چاہیے، اس لیے اس سے ڈرنا چاہیے،

ان وجوہ سے فلاسفۂ عالی کا یہ دعویٰ کرنا کہ حیوان بھی ہماری طرح ادراک
وشعور کا جوہر رکھتے ہیں، بیجا نہیں، قرآنِ پاک اس مسئلہ کی یوں وضاحت کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ [illegible] کیا ہر جاندار جو آسمان اور زمین میں ہے اور
وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ [illegible] صف بصف اڑنے والے پرند، خدا کی تسبیح
کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ وَاللّٰہُ [illegible] کرتے ہیں، ہر ایک اپنی تسبیح و نماز جانتا ہے،
عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ [illegible] اور خدا ان کے اعمال سے واقف ہے،
وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ [illegible] نہیں ہے کوئی چلنے والا زمین پر اور نہ کوئی
یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ (انعام) پرندہ جو اپنے بازوؤں پر اڑتا ہے لیکن وہ لوگ
[illegible] بھی تمہاری طرح ہیں،

علمائے ہیئت (اسٹرانومی) کہتے ہیں، کہ آفتاب اپنے محور (ایکسیس) پر گردش

کرتا ہے، الشمس والقمر بحسبان سے بھی یہ اشارہ ہوتا ہے، کہ آفتاب ٹھیک چکی کی طرح اپنے دورے پورے کر رہا ہے، قرآن مجید کی ایک دوسری آیت بھی اس پر دال ہے،

والشمس تجری لمستقر لها ذلك	آفتاب اپنی جگہ پر حرکت کر رہا ہے، یہ ایک
تقدیر العزیز العلیم ۔ (یٰسین ۔۳)	باقدرت دانا کا اندازہ ہے، ۔

۹۔ علم نباتات (بوٹانی) کے علماء کو اس پر بڑا ناز ہے کہ مدتوں کی جاں فشانی کے بعد انھوں نے یہ معلوم کیا ہے، کہ انسان کی طرح نباتات بھی ایک قسم کا ادراک رکھتے ہیں، ان کے جوڑے ہیں، یہاں تک ان کا دعویٰ ہے کہ وہ تمام باتیں اُن میں موجود ہیں، جو ایک ذی روح میں ہونا چاہئیں، وہ ہماری طرح اپنی جڑوں کی مدد سے گردوپیش کے مادہ (میٹر) سے اپنی غذا کھاتے ہیں اور اپنے باریک ریشوں کے ذریعہ سے عرق، حیوانی خون کی طرح اپنے تمام اعضا میں پہنچاتے ہیں، اپنی پتیوں کی وساطت سے ہماری طرح ہوا میں سانس لیتے ہیں، بعض درخت ایسے بھی ہیں، جو صرف ہاتھ لگ جانے سے مرجھا جاتے ہیں، ایسے درخت بھی ہیں، جن کے اوپر کا سر کاٹ دیا جائے، تو وہ مقتول الراس انسان کی طرح اپنی زندگی کے دن ختم کرلیں گے ایسے درختوں کو انگریزی میں پام کہتے ہیں: (جیسے کھجور، تاڑ، ناریل) بعض بعض درخت ایسے بھی دریافت ہوئے ہیں، کہ جب تک اُن کے نر و مادہ میں ایک خاص اتصال نہ پیدا کیا جائے، وہ بارآور نہیں ہوتے، چنانچہ عرب میں خرما کے درخت

جب تک آپس میں نر و مادہ سے ملائے نہیں جاتے، کھجوریں نہیں ہوتیں، ایسی زوجیت اور درختوں میں بھی پائی گئی ہے، قرآن اس مسئلہ کو یوں ظاہر کرتا ہے،

سبحان الذی خلق الازواج کلھا	پاک ہے وہ خدا جس نے ہر چیز کو جوڑا پیدا
مما تنبت الارض ومن انفسھم	کیا ہے، پودوں اور درختوں کو اور خود تم کو
ومما لا یعلمون۔ (یٰسین۔ ۳)	اور ان چیزوں کو جن کو تم نہیں جانتے۔

۱۰۔ تحقیقاتِ جدیدہ کے پہلے بار بار یہ شبہہ دلوں میں پیدا ہوتا تھا کہ خدا تو اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے،

الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعًا۔	وہ خدا جس نے دنیا کی تمام چیزیں تمہارے نفع کے لیے پیدا کیں،

اور حال یہ ہے کہ دنیا کی بہت سی چیزیں انسان کے قبضۂ قدرت سے باہر ہیں، مگر تحقیق جدید نے دنیا کے بہت سے راز فاش کر دیئے، اور بتایا کہ ہم کیونکر خدا کے خلیفہ بن کر ان کو مسخر کر سکتے ہیں، اس نے ہوا کو تھاما، بجلی کو پکڑا، بے جان چیزوں سے وہ کام لیا، جو جاندار نہیں کر سکتے، یہ دھوپ جس کی نسبت ہم خیال کرتے ہیں، کہ بجز اس کے کہ اشیاء میں نشو و نما کی قوت پیدا کرے، اور موسم سرما میں غرباء کے لیے آتشدان بنے یا ہماری آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت پیدا کرے، ہمارے اور کس کام آسکتی ہے؟ مگر امریکہ میں دھوپ کی حرارت کو مجتمع کر کے وہ کام نکالے جاتے ہیں، جو کوئلے یا گیس سے نکل سکتے ہیں، اور اس کے بل پر

ان پیشِ نظر انجنوں کی طرح، دھوپ کے انجن چلائے جاتے ہیں۔

اگر انسان کی اَن تھک کوششیں یوں ہی جاری رہیں، تو قریب ہے کہ انسان فطرت کے بہت سے اور پوشیدہ اسرار جان لے اور پھر اسے معلوم ہو جائے گا، کہ اسلام کی آسمانی کتاب صحیفۂ فطرت کے کہاں تک مطابق ہے۔

حکمت و شرع دریں جا بہم آمیختہ اند — نمک و بادہ، دریں میکدہ یار افتاد است

عقل را نیست سرِ عربدہ اینجا با نقل — پنبہ را آشتی اینجا بشرار افتاد است

(الندوہ، جولائی ۱۹۰۶ء)

مسئلۂ ارتقا اور قرآنِ مجید

مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا موجود ہے، جو مسئلۂ ارتقاء کو نہ صرف صحیح سمجھتا ہے، بلکہ اس مسئلہ کی صحت کا اسکو اس درجہ اعتقاد ہے، کہ وہ کہتا ہے کہ جب قرآن مجید مسئلۂ ارتقاء کا منکر ہے، تو یہ کون مانے گا، کہ قرآن پاک جدید فلسفہ کے بالکل مطابق ہے، یورپ کے کل علمائے طبیعیات بھی اس گروہ کے ہم زبان ہیں، یہ ایک دوسری بحث ہے کہ قرآن مجید کی صحت کا معیار فلسفیانہ تحقیقات قرار دی جاسکتی ہیں یا نہیں، لیکن اس اصول کو مان کر، اس شبہ کو رفع کرنے کے صرف دو طریقے ہو سکتے ہیں،

(۱) مسئلۂ ارتقا خود ثابت نہیں،

(۲) اگر مسئلۂ ارتقاء ثابت ہے تو قرآن مجید اس کا منکر نہیں،

ہم مذکورۂ بالا شبہ کے رفع کرنے کے لیے علی الترتیب دونوں طریقوں سے کام لیتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مسئلۂ ارتقاء گو بجائے خود نہایت صحیح ہو، مگر اس کے جو دلائل ہمارے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، وہ اس درجہ کمزور ہیں، کہ مسئلۂ ارتقا کا مخالف بجائے اس کے کہ ان کی تردید کی زحمت اٹھائے، صرف ان دلائل کو

منظر عام پر پیش کر دینا ہی اپنی کامیابی سمجھتا ہے، ناظرین خود دیکھ لیں، کہ یہ دلیلیں مسئلۂ ارتقاء کی صحت کا کہاں تک یقین دلاتی ہیں،

ڈارون نے "ڈیسنٹ آف مین فام" اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے اس مسئلہ کے ثبوت کے وہ دلائل لکھے ہیں، جن کے اعتماد پر وہ یہ کہتا ہے کہ دنیا کی تمام مخلوق اصل فطرت میں ایک تھی جس سے ترقی کر کے یہ مختلف نوعیں پیدا ہوئیں، اور انسان اس فطری رفتار کا آخری مرحلہ ہے، ہم ان تمام دلائل کو ترتیب وار ذکر کرتے ہیں،

(۱) جسمانی مشابہت، انسان کا جسم حیوانات کے جسم کے بالکل مشابہ ہے، پٹھے، اعصاب، اعضائے داخلی، دماغ، انسان کے یہ سب اعضاء اور حیوانات مثلاً بندر، چمگادڑ، گادبجری کے بالکل مشابہ ہیں،

(۲) تشابہ امراض، انسان جس قسم کے وبائی اور متعدی امراض میں مبتلا ہوتا ہے عموماً اور حیوانات بھی ان میں مبتلا ہوتے ہیں، مثلاً چیچک، ہیضہ، وغیرہ متعدی بیماریاں جیوانوں میں بھی پیدا ہوتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان حیوانات کے بالکل مشابہ ہے، خصوصاً بندر سے، یہ سن کر تعجب ہوگا، کہ انسان کی طرح بندروں کو بھی زکام، بخار، مرگی، آنتوں کی سوزش ہوتی ہے۔ اور ان امراض میں جو دوائیں انسان کو مفید ہیں، وہی بندروں کو بھی مفید پڑتی ہیں،

(۳) تشابہ ذوق، بندروں کا ذوق بالکل انسانوں کی طرح ہے، چائے، قہوہ،

اشیائے مسکرات بندروں کے مرغوبِ طبع ہیں، اور ان مسکرات سے انہیں بھی انسانوں کی طرح نشہ ہوتا ہے، یہ اتحاد ذوق اتحادِ فطرت کی خبر دیتا ہے، ..

(۴) تشابہ طبعی، انسان اور ان تمام حیوانات میں جو دودھ دیتے ہیں، بہت سے طبعی اور فطری اشتراکات بھی ہیں مثلاً قانون تناسل، حمل و وضع حمل وغیرہ میں،

(۵) تشابہ جنین، مسئلہ ارتقاء کے مثبت دلائل میں تشابہ جنین کی دلیل سب سے زیادہ مستحکم سمجھی جاتی ہے، تشابہ جنین کی تفصیل یہ ہے کہ انسان اور کل حیوانات کی پیدائش دراصل نہایت چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے ہوتی ہے، یہ کیڑے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں، کہ ان کا قطر ایک انچ کے ایک سو پچیسویں حصہ سے زائد نہیں ہوتا، اس حالت میں بھی انسانی جنین کے کیڑے حیوانی جنین کے کیڑوں کے بالکل مشابہ ہوتے ہیں، جنین انسان اپنے ابتدائی مراحل میں اُن حیوانات کے بالکل مشابہ ہوتا ہے جن کی پیٹھ میں ریڑھ کی ہڈیاں ہوتی ہیں، یہاں پہنچ کر انسان اور عام حیوانات کے جنین میں امتیاز شروع ہوتا ہے، اور ہاتھ پانوں یا پرندوں کے بازو یعنی اطراف کے اعضا کی تکوین ہوتی ہے، مگر ابتدائً انسان اور حیوان کے اعضائے اطراف میں بھی ایک ذرہ اختلاف نہیں ہوتا، مگر پھر اختلاف شروع ہو جاتا ہے، انسان کا جنین کتے سے اپنے آخری مراحل میں ممتاز ہوتا ہے، اور سب کے بعد بندر سے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ انسان اور تمام حیوانات پہلے ایک تھے، مگر ترقی کے مختلف مدارج نے مختلف نوعیں پیدا کر دیں،

(۶) غیر مفید اعضاء مسئلۂ ارتقاء کی بحث میں یہ بھی ایک عروۃ الوثقیٰ دلیل ہے، کوئی جیوان خواہ وہ انسان ہو، یا کتّا، بعض غیر مفید اعضاء سے خالی نہیں، مثلاً مردوں کی چھاتی کے نشان، کان کا ظاہری حصہ، سر کی کھال کے عضلات، کان کے عضلات وغیرہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اعضاء انسان کے پچھلے تاریک عہد کی یادگار ہیں، جن سے گو اس وقت انسان کو کوئی فائدہ نہیں، مگر یہ پہلے مفید ہوں گے، مثلاً جلد اور کان کے عضلات سے انسان کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا، نہ کان کے عضلات اس وقت کان کو ہلا سکتے ہیں، اور نہ جلد کے عضلات جلد میں کوئی حرکت پیدا کر سکتے ہیں، مگر جب انسان حیوان ہوگا، تو یہ عضلات کان اور جلد کو حرکت دیتے تھے۔ اور اب تک یہ غیر مفید عضلات انسان کے پاس بطور وراثت کے موجود ہیں،

یہ دلائل ہیں جن کی بنا پر مسئلۂ ارتقاء کے اعتقاد کے لیے ہم سے اصرار کیا جاتا ہے، ہر ایک دلیل کو غور سے پڑھو، اور دیکھو کہ کیا قلب کو اس سے اطمینان پیدا ہوتا ہے، اور شکوک و شبہات کے حملوں سے یہ محفوظ ہے، افسوس ہے کہ ہو گے، کہ "نہیں" پھر ایسے غلط مسئلہ کی قرآن کیونکر تائید کر سکتا ہے، لیکن بعض ہمارے نوجوان دوستوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ یورپ کی ہر آواز کو وحی سمجھتے ہیں، حالانکہ خود ڈارون اپنی تھیوری کو جس کو ۱۸۵۹ء میں اس نے ظاہر کیا تھا، ایک ظنی مسئلہ کہتا ہے،

اب ہم مسئلہ کے دوسرے پہلو کی طرف رخ کرتے ہیں، کہ اگر مسئلۂ ارتقاء صحیح

بھی ہو، تو قرآن اس کا منکر نہیں، بعض آیاتِ کریمہ کے مفہوم ایسے پائے جاتے ہیں، جن سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے،

"مسئلۂ ارتقاء اور حکمائے اسلام" کے مضمون سے لوگ یہ جان چکے ہیں، کہ بعض حکمائے اسلام بھی مسئلۂ ارتقاء کے قائل تھے، لیکن یہ سُن کر حیرت ہوگی، کہ امام راغب اصفہانی نے بھی جو پانچویں صدی کے ایک مشہور متکلم ہیں، اپنی رائے اسی کے قریب قریب ظاہر کی ہے، اور زیادہ حیرت اس سے ہوتی ہے، کہ انھوں نے اپنے اس خیال کو قرآن مجید سے مطابق کرنا چاہا ہے، گو وہ ٹھیک ٹھیک مسئلۂ ارتقاء تک نہیں پہنچے ہیں، مگر ان کی تحقیق میں اس مسئلہ کا شائبہ ضرور ہے، ان کی اصل عبارت ہم ان کی تصنیف تفصیل النشأتین سے نقل کرتے ہیں،

الباب الخامس	پانچواں باب
فی تکوین الانسان شیئاً فشیئاً	انسان کے تدریجاً پیدا کرنے میں یہانتک
حتیٰ یصیر انساناً کاملاً الانسان	کہ وہ انسان کامل ہوجائے، انسان پہلے
یکون اولاً جماداً میتاً قال اللہ	مردہ جماد ہوتا ہے، خدائے پاک فرماتا ہے،
تعالیٰ "وکنتم امواتاً فاحیاکم"	"تم مُردہ تھے تو خدا نے تم کو زندہ کیا، اور
وذالک حیث کان تراباً وطیناً	یہ اس طرح کہ وہ خاک، مٹی، ٹھیکری تھا،
وصلصالاً ونحوھا ثم یصیر	پھر نبات ہوتا ہے، خدائے پاک فرماتا ہے

نباتاً نامیاً کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ	"خدا نے تم کو زمین سے پیدا کیا،
"واللہ انبتکم من الارض نباتاً"	اور یہ اس طرح کہ انسان نطفہ اور
وذالک حیث ما کان نطفۃ	گوشت کی بوٹی تھا، پھر حیوان ہوتا ہے
ومضغۃ ونحوھا ثم یصیر حیواناً	اور یہ اس طرح کہ وہ مفید چیزوں کا اتباع
وذالک حیث ما یتبع بطبعہ بعض	کرتا ہے، اور مضر چیزوں سے بچتا ہے، پھر
ما ینفعہ ویحترز من بعض ما یضرہ"	وہ انسان ہوتا ہے، جو افعال انسانیہ کے
ثم یصیر انساناً مختصاً بالافعال	ساتھ مختص ہوتا ہے، خدا نے بہت سی جگہوں
الانسانیۃ وقد نبہ اللہ تعالیٰ	پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً خدا
علیٰ ذالک فی مواضع نحو قولہ	فرماتا ہے " اے لوگو! اگر قیامت میں تم کو
تعالیٰ "یا ایھا الناس ان کنتم	شک ہو، (تو یاد رکھو) کہ میں نے تم کو خاک سے
فی ریب من البعث فانا خلقناکم	پیدا کیا ہے، پھر نطفہ سے، پھر بستہ خون سے
من تراب ثم من نطفۃ ثم من علقۃ	پھر کامل اور غیر کامل گوشت کے لوتھڑوں
ثم من مضغۃ مخلقۃ وغیر مخلقۃ"[۱]	سے ..."

لیکن امام موصوف نے چونکہ بہت اختصار سے بحث کی ہے، بلکہ ناکافی بحث کی ہے، اس لیے ہم خود اس پر تفصیلاً بحث کرنا چاہتے ہیں، اور یہ دکھانا چاہتے ہیں، کہ مسئلۂ ارتقاء بالفرض اگر ناممکن الانکار ہے، تو قرآن اس کا

---

[۱] تفصیل النشأتین وتحصیل السعادتین ص ۲۰۲

مخالف نہیں ہے،

مسئلۂ ارتقاء کا پہلا حکم یہ ہے کہ انسان دفعۃً نہیں پیدا ہوا، بلکہ چند مرحلوں میں انسان اپنی اس آخری منزل تک پہنچا ہے، جماد سے نبات ہوا، نبات سے حیوان، حیوان سے انسان، قرآن مجید کی بہت سی آیتیں انسان کے چند دوروں میں پیدا ہونے کو ظاہر کرتی ہیں، سب سے بین آیت ہے،

مالکم لا ترجون للہ وقارا وقد خلقکم اطوارا۔ (نوح)

تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی عزت کا اعتقاد نہیں کرتے حالانکہ خدا نے تم کو چند دوروں میں پیدا کیا،

اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے، کہ قرآن مجید اس کا ناطق ہے کہ انسان چند دوروں میں پیدا ہوا ہے، قدیم مفسرین ان دوروں کو یوں بتاتے ہیں، کہ انسان پہلے ایک ناپاک شے تھا، پھر گوشت بنا، روح پھنکی، انسان بنا، ہم ان دوروں کا اور اس مطلب کا انکار نہیں کرتے گفتگو یہ ہے کہ جو معنی ہم قرار دیتے ہیں، وہ بھی صحیح ہو سکتا ہے یا نہیں، ظاہر ہے کہ صحیح ہو سکتا ہے اور یہی ہمارا مقصد ہے، کہ قرآن اس ارتقاء کا انکار نہیں کرتا۔

مسئلۂ ارتقاء کا دوسرا قانون یہ ہے کہ انسان کی ترقی جماد سے شروع ہوتی ہے، یعنی انسان پہلے جماد تھا، خدا نے قرآن مجید میں بیسیوں جگہ کہا ہے، کہ "تم مٹی تھے" "ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا" اور "انسان کی پیدائش

مٹی سے شروع کی"

الذی احسن کل شیئ خلقہ وبدأ	ایسا خدا جس نے اپنی ہر مخلوق کو خوبصورت
خلق الانسان من طین	بنایا، اور جس نے انسان کی پیدائش مٹی
(سجدہ)	(جماد) سے شروع کی،

اس آیت سے صرف اتنا ہی نہیں معلوم ہوا، کہ انسان پہلے جماد تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ انسانی پیدائش کی ابتدا بھی یہیں سے ہے، دوسری جگہ خدا فرماتا ہے۔

وکیف تکفرون باللہ وکنتم	تم خدا کا کیونکر انکار کرتے ہو، حالانکہ تم مردہ
امواتاً فاحیاکم۔ (بقرہ)	تھے، تو خدا نے تم کو زندہ کیا،

مردہ سے کنایہ جماد سے اور زندگی سے اشارہ اس بات کی طرف ہے، کہ تم کو نمو بخشا، حرکت یعنی ایک درجہ اوپر بڑھایا، نبات بنایا، یہ مسئلۂ ارتقاء کا دوسرا زینہ ہے، کہ انسان جماد سے نبات بنا، گویا اب اس نے ترقی کی دوسری منزل میں قدم رکھا، اس منزل کی طرف قرآن مجید نے بالکل تصریحی طور سے اشارہ کیا ہے،

واللہ انبتکم من الارض نباتا۔	خدا نے تم کو زمین سے اگایا، پھر زمین میں
ثم یعیدکم فیھا ویخرجکم اخراجا۔	لے جائے گا۔ اور زمین ہی سے
(نوح)	اٹھائے گا،

اس آیت پاک سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان پہلے نبات تھا، اسی دور کی طرف قرآن مجید میں دوسری جگہ اشارہ ہے،

هو اعلم بکم اذ انشأکم من الارض۔　　وہ تمہارا حال خوب جانتا ہے، اس نے زمین سے تم کو پیدا کیا تھا،

موسیو سٹن کی تھیوری کے رو سے ذی روح مخلوقات پانی میں پیدا ہوئی، اور یہیں بڑھی ہیں، غیر ذی روح انواع نے حیات حاصل کی، قرآن مجید اس کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے،

وجعلنا من الماء کل شئ حی افلا یومنون۔　　ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا وہ نہیں یقین کرتے،

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی پانی سے پیدا ہوئی ہے، اور یہیں سے ذی روح مخلوقات کا سلسلہ شروع ہوا ہے، ممکن ہے کہ بقول مفسرین مجازاً پانی سے مراد نطفہ ہو لیکن ہم نے آیت کا جو مطلب قرار دیا ہے، وہ بھی صحیح ہو سکتا ہے، بلکہ ہمارا پہلو کسی قدر راجح ہے، کیونکہ زندہ ایک ایسا عام لفظ ہے، جس کے تحت میں حشرات الارض اور نباتات داخل ہیں، حالانکہ نباتات اور بعض حشرات الارض نطفہ سے تو نہیں پیدا ہوتے، لیکن پانی سے ضرور پیدا ہوتے ہیں،

آگے چلو انسان حیوان تھا، پھر انسان بنا،

ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ　　اور ہم نے انسان کو خالص مٹی سے پیدا کیا،

من طین ثم جعلناہ نطفۃ فی	پھر اس کو ایک محفوظ مقام میں نطفہ بنایا،
قرار مکین ثم خلقنا النطفۃ	پھر نطفہ کو جما ہوا خون بنایا، پھر اس جمے
علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ	ہوئے خون کو گوشت کی بوٹی بنایا، پھر
فخلقنا المضغۃ عظاماً فکسونا	گوشت کی بوٹی کو ہڈی بنایا، اور ہڈیوں
العظام لحماً ثم انشاناہ خلقاً	کو گوشت پہنایا، پھر اس کو ایک دوسری
آخر فتبارک اللہ احسن الخالقین	مخلوق بنایا، پس برکت والا ہے وہ خدا
(مومنون: ۱۰)	جو بہترین خالق ہے۔

اس آیت پاک میں اجمالاً خلقت انسانی کے مدارج ذکر کیے گیے ہیں، انسان کی ابتدائی پیدائش مٹی سے بنائی گئی ہے، پھر بیچ کے منازل چھوڑ کر، اس منزل کا ذکر کیا گیا ہے، جہاں سے حیوانیت کی ابتدا ہے، اس میں جس نطفہ اور گوشت پوست کا ذکر کیا گیا ہے، وہ درجۂ انسانیت سے پہلے کی حیوانیت کا ذکر ہے، حیوانیت کے لیے گوشت پوست ہڈی جو لوازم تھے، ان کا تذکرہ کیا، یہی درجۂ حیوانیت ہے، جس کے بعد خدا نے فرمایا کہ پھر میں نے اس کو ایک دوسری مخلوق بنایا یعنی انسان!

مسئلۂ ارتقاء کے حامی یہ بھی کہتے ہیں، کہ جنین انسان رحم میں درجۂ حیوانیت میں بھی حیوانیت کی کئی شکلیں بدلتا ہے، جیسا کہ تم ابتدا میں پڑھ آئے ہو، قرآن مجید اس نکتہ کو اس طرح ادا کرتا ہے،

یخلقکم فی بطون امھاتکم خلقاً	وہ تمہیں تین تاریکیوں[۱] کے اندر بطن مادر
من بعد خلق فی ظلمت ثلاث	میں ایک خلقت کے بعد دوسری خلقت
(زمر)	پیدا کرتا ہے،

اس مسئلہ کے طے ہونے کے بعد ایک دوسری بحث حضرت آدمؑ کی ہے، مسئلۂ ارتقاء کے مخالفین کا عام خیال ہے، کہ حضرت آدمؑ اور مسئلۂ ارتقاء کی صحت دو متناقض چیزیں ہیں، جو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے جو شخص کہ عقل و نقل میں تطبیق دینا چاہتا ہے، وہ کہہ سکتا ہے کہ اس تدریجی ترقی کے رُو سے جو سب سے پہلا انسان ہوا، وہی ابوالبشر آدم تھا،

خاتمۂ بحث پر فلاسفۂ حال کو مخاطب کرکے ہم پھر کہتے ہیں، کہ اگر مسئلۂ ارتقاء صحیح ہے تو قرآن اس کا منکر نہیں، بلکہ ہم مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ قرآن مجید کبھی صحیح علوم کے مخالف نہیں ہو سکتا،

علماء کی خدمت میں گذارش ہے کہ ہم نے مذکورۂ بالا آیتوں کے جو معنی قرار دیے ہیں، ان کا مقصد صرف فلسفیانہ مذاق والوں کو خاموش کر دینا ہے، گو مفسرین ان آیتوں کے اور معنی سمجھے ہیں، اور مجھے ان کی بھی صحت سے انکار نہیں لیکن عقل و نقل کی تطبیق کی غرض سے ہم نے جو معنی لیے ہیں، وہ بھی غلط نہیں، قرآن مجید کے الفاظ دونوں معانی کے متحمل ہیں،

(الندوہ، جنوری ۱۹۰۶ء)

---

[۱] تین تاریکیوں سے مراد شکم، رحم، اور وہ جھلی ہے جس میں جنین لپٹا ہوتا ہے،

ایمان بالغیب

قرآن مجید میں اتقاے صادق کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے، کہ ایمان بالغیب ہو،

ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ ۔　　قرآن پاک اُن پرہیز گاروں کی ہدایت کرتا ہے، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، اور نماز پڑھتے ہیں،　　(بقرہ ۱۰)

سب سے پہلے ہم کو یومنون بالغیب (وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں) کی تفسیر کے لیے غیب کے معنی پر غور کرنا چاہیے، مفسرین اس کی توضیح میں نہایت مختلف الاقوال ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے،

۱۔ غیب سے مراد خدا ہے کیونکہ وہ نظروں سے غائب ہے،

۲۔ غیب سے مراد قضا و قدر ہے،

۳۔ غیب سے مقصد قرآن مجید ہے، اور قرآن مجید میں جو غیب کی باتیں بتائی گئی ہیں،

۴۔ غیب دل کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ متقی وہ ہیں، جو دل سے ایمان لائے

ہیں۔

۵۔ اسلام کے وہ احکام جو بظاہر خلافِ عقل معلوم ہوتے ہیں، وہ غیب ہے، کیونکہ ان کی حقیقت انسان کی عقل سے غائب اور مخفی ہے،

۶۔ اسلام کا ایک فرقہ کہتا ہے کہ غیب سے مراد مہدی ہیں، جو ابھی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں،

۷۔ امام ابومسلم اصفہانی کہتے ہیں، غیب مصدر بمعنی فاعل ہے، اور ترکیب میں حال ہے، یعنی متقی وہ لوگ ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سامنے بھی ایمان کا اعتراف کرتے ہیں، اور پیچھے بھی، یعنی وہ منافق نہیں ہیں، جن کی نسبت آگے چل کر خدا خود فرماتا ہے، کہ مسلمانوں کے سامنے تو وہ ایمان کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں، اور ان کے پیچھے اپنے لوگوں میں بیٹھ کر انکار کرتے ہیں،

۸۔ جمہور مفسرین کہتے ہیں، غیب سے مطلب بن دیکھے ہوئے، یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو خدا یا رسول پر بن دیکھے ایمان لاتے ہیں،

۹۔ اکثر صحابہؓ سے مروی ہے کہ غیب سے مراد جنت، دوزخ، حشر، نشر، حیات بعد الموت، عذاب قبر، میزان، صراط وغیرہ ہے،

لیکن ان اقوال پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ غیب سے قضا و قدر، قرآن مجید، دل، مہدی مراد لینا تاویل کی حدود سے نکل جاتا ہے، اصفہانی کی تفسیر میں بھی تکلف ہے، بقیہ اقوال کم و بیش تفاوت کے ساتھ

متحد المقصد ہیں، اور ایک ہی خیال ہے، جو مختلف تعبیروں سے ادا کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر مذہب میں دو قسم کی باتیں پائی جاتی ہیں،

(۱) اول وہ جن کا تجربہ یا مشاہدہ حواس سے ممکن ہے، اور برابر ہوتا رہتا ہے، یا یہ کہو کہ جن کا تعلق طبیعیات یا مادیات سے ہے،

(۲) دوم وہ امور جن کا تجربہ یا مشاہدہ ہمارے موجودہ حواس کے دسترس سے باہر ہے، یا یہ کہو، کہ جن کا تعلق مابعد الطبیعیات یا روحانیات سے ہے،

قرآن مجید کی اصطلاح میں مذہب کی اسی دوسری قسم کو غیب کہتے ہیں، یہاں پر یہ نکتہ بھی خاص غور کے قابل ہے، کہ ایمان بالغیب کو قرآن مجید نے کیوں اتنے شدومد سے بیان کیا ہے؟

اصل یہ ہے کہ ہر شخص کو جو اپنے مذہب کو صحیح اور حق سمجھتا ہے، اپنے مذہب کے روحانی اور مادی دونوں اجزا پر ایمان کامل ہے، لیکن مذہب کے پہلے ٹکڑے کا یعنی وہ امور جن کا ہم تجربہ یا مشاہدہ کر سکتے ہیں، ان کی صحت کا اذعان اور یقین (ایمان) ہم صرف اپنے حواس کے مشاہدہ کے ساتھ کر لیتے ہیں، اس لیے انکی صحت پر یقین رکھنا اور ایمان لانا ہماری قوتِ ایمانی کے کمال پر دال نہیں ہے بلکہ وہ صرف ہماری ظاہر پرستی کا ایک اثر اور نتیجہ ہے، لیکن مذہب کے اس دوسرے حصہ کی صحت پر یقین رکھنا اور ایمان لانا جس کو قرآن مجید غیب اور تم روحانیات کہتے ہو، البتہ کمالِ ایمان کی ایک روشن دلیل ہے،

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا، کہ مذہب کے اس دوسرے جزء کا وجود کیا اسی مادی عالم میں ہے، جہاں ہم رہتے ہیں، اور اگر یہ صحیح ہے تو ہمارے حواس اس کا مشاہدہ کیوں نہیں کرتے، اس کا جواب ہم تفصیل سے دینا چاہتے ہیں، ..

تمام مذاہب میں عموماً بعض ایسے امور کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، جن کا احساس انسان کے ظاہری حواس سے بالاتر ہے، مثلاً جنت، دوزخ، عذاب قبر، شیاطین، قوائے روحانی، فرشتے، روح وغیرہ، قرآن مجید کی اصطلاح میں ان چیزوں کو غیب کہتے ہیں اور ہم زیادہ وسعت دیکر اس کو عالم غیب کہتے ہیں کیونکہ بظاہر یہ چیزیں ہمارے حواس کے مادی عالم سے ماوراء ایک دوسرے عالم میں معلوم ہوتی ہیں، قرآن مجید میں ہے، ۔

هو عالم الغيب والشهادة۔ خدا غیب اور شہادت (حاضر) دونوں کی خبر رکھنے والا ہے،

اس آیت کا بظاہر یہ مطلب، مفہوم ہوتا ہے، کہ جو انسان کے سامنے حاضر ہے، اور انسان سے غائب ہے، دونوں باتوں کو خدا جانتا ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ انسان کے سامنے جو چیز حاضر ہے، اور جو چیز حاضر ہو سکتی ہے، اس میں ہر مادی شے داخل ہے، اس لیے شہادت میں وہ امور داخل ہیں، جن کا ہم احساس اور مشاہدہ کر سکتے ہیں، اور جو مذہب کا پہلا جزء ہیں، اور غیب سے وہی امور مراد ہیں، جو عام حواس سے بالاتر ہیں، اس لیے قرآن مجید کی اصطلاح میں عالم شہادت مادیات اور عالم غیب روحانیات کو کہتے ہیں، اور خدا ان دونوں عالموں کے

ایک ایک ذرے سے خبر رکھتا ہے،

عالمِ شہادت چونکہ ہمارے موجودہ حواس اور مشاہدات کے تحت واقع ہے، اس لیے حکمائے سفسطیہ کے سوا کوئی اور اس کے وجود کا منکر نہیں ہے، عالم غیب کے تسلیم کرنے میں قدیم فلسفہ کو تو تامل نہیں ہے، مگر جدید فلسفہ کو البتہ تامل ہوگا، کیونکہ ظاہر ہے کہ افلاطون اس مادی عالم کے سوا ایک اور روحانی عالم کا قائل ہے، جس کو وہ عالمِ مثل کہتا تھا، اور اب افلاطون کے انتساب سے اس کو مثل افلاطونیہ کہتے ہیں، اس لیے پلاٹونزم عالم غیب کا کسی طرح انکار نہیں کر سکتا، ارسطو گو عالم مثل کا قائل نہ تھا، مگر وہ تدبیر عالم کے لیے ان رُوحانی قوتوں کا قائل تھا، جس کو اصطلاحِ فلسفہ میں عقول عشرہ کہتے ہیں، اور وہ ہر وجود کے لیے ایک روحانی نفس کا قائل تھا، جس کی تعداد غیر منتہی حد تک پہنچ جاتی ہے، تدبیر افلاک کے لیے وہ اٹھارہ روحانی نفوس مانتا تھا، اور فلسفۂ ارسطو کے جاندادہ اب تک تسلیم کرتے ہیں، یہ نفوس اور عقول ہمارے مشاہدہ اور حواسِ موجودہ کے اقتدار سے خارج ہیں، اس لیے وہ عالم غیب کی کائنات ہیں،

امام غزالی اسی عالم غیب کو وجود عقلی وخیالی وغیرہ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، امام رازی اور عبدالکریم شہرستانی اور تمام حکمائے اسلام اس کو عالم عقلی کہتے ہیں، شیخ الاشراق، افلاطون کے اتباع سے اس کو عالم مثل کہتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب اسی عالم کو، عالمِ مثال کہتے ہیں، غرض یہ ایک مفہوم ہے، جس کی علمار

مختلف تعبیریں کرتے ہیں، علامہ ابن تیمیہ نے کتاب العقل والنقل میں عالم عقلی کا انکار کیا ہے، اور امام رازی اور شہرستانی پر بہت سے اعتراضات کیے ہیں لیکن علامہ ابن تیمیہ کے سارے اعتراضات صرف ایک لفظی گرفت تک محدود ہیں، چونکہ اُن کا اعتراض یہ ہے کہ فلاسفہ عالم عقلی، ان اشیاء کو کہتے ہیں، جن کا وجود محض عقل میں ہوتا ہے، جس طرح عالم ذہنی ان اشیاء کو کہتے ہیں، جن کا وجود ذہن میں ہوتا ہے، اس لیے اگر جنت، دوزخ، ملائکہ، قوائے روحانی نفوس وغیرہ کا وجود عالم عقلی میں ہے، تو لازم یہ آتا ہے، کہ عقل سے خارج ان کا وجود نہ ہو، اور یہ بالکل تصریحات اسلام کے خلاف ہے، لیکن یہ اعتراض صرف ایک لفظی اصطلاح کی بنا پر ہے، کہ اس کو عالم عقلی نہ کہنا چاہیے، ورنہ اصل واقعہ سے علامہ ابن تیمیہ بھی انکار نہیں کرتے، آگے چل کر ہم علامۂ موصوف کی ایک عبارت نقل کریں گے، جس سے یہ مسئلہ اور زیادہ واضح ہو جائے گا۔

افلاطون اور شیخ الاشراق نے عالم غیب (جس کو وہ عالم مثل کہتے ہیں) کے وجود پر یہ دلیل قائم کی ہے، کہ ہم خواب میں اپنے کو چلتے پھرتے اور دنیا کے سارے کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، اپنے مردہ احباب سے ملاقات کرتے ہیں، کبھی کبھی ہم مستقبل کے امور کا بھی مطالعہ کر لیتے ہیں، بیداری کی حالت میں بھی کبھی کبھی جب ہم محوِ خیال ہو جاتے ہیں، تو اس موجودہ دنیا سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ جب ہم سوچتے ہیں، تو ہمارے چھوٹے سے ذہن میں دریا، پہاڑ، آسمان، زمین ساری

دنیا کا نقشہ سما جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ باتیں اس مادی عالم میں نہیں ہوتیں، اور نہ اس چھوٹے سے ظرف ذہن میں تمام دنیا سما سکتی ہے، اس لیے یہ تسلیم کر لینے سے چارہ نہیں، کہ اس مادی عالم کے سوا ایک اور عالم بھی ہے، جہاں ہمارا نفس کبھی کبھی اس عالم سے گھبرا کر سیر کو نکل جاتا ہے،

شاہ صاحب نے عقلی طور سے عالم غیب (جس کو وہ عالم مثال کہتے ہیں) کے وجود پر کوئی دلیل نہیں قائم کی ہے، ان کی تقریر کا حاصل یہ ہے، کہ قرآن مجید اور احادیث صحاح میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جو ہمارے حواس سے بالاتر ہیں اور کسی طرح ان کا وجود اس عالم میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا، مثلاً یہ کہ گنہگار مردوں پر عذاب ہوتا ہے، سانپ، بچھو، فرشتے ان کو تکلیف دیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں عجیب وغریب چیزیں دیکھیں، انبیاء فرشتوں سے ملتے ہیں، ان کو دیکھتے ہیں، ان سے باتیں کرتے ہیں، نماز استسقاء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوزخ وجنت پیش کی گئی، اور رسول اللہؐ نے ان کو دیکھا، ان کے سوا اس قسم کی اور بیسیوں باتیں ہیں، جو قرآن مجید اور صحیح احادیث سے ثابت ہیں، اس لیے ان چیزوں کے وجود کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں،

۱۔ یہ چیزیں واقعی ہیں، لیکن اس مادی عالم میں نہیں، بلکہ دوسرے عالم میں،

۲۔ واقع میں ایسا نہیں ہے، بلکہ پراگندگی حواس سے ہم کو یہ چیزیں نظر آتی ہیں۔

۳۔ صرف تمثیل کے طور پر، ان باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان سے ان کے ظاہری معنی

مراد نہیں ہیں،

یہ کہہ کر شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں پہلی شق اختیار کرتا ہوں، اور یہی شق محدثین کے مذاق کے موافق ہے، تیسری شق کے معتقدین کو میں اہلِ حق نہیں سمجھتا، دوسری شق کی نسبت شاہ صاحب نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، لیکن اصل یہ ہے کہ اسرار شریعت کو تشوش حواس کا نتیجہ یا محض تمثیل سمجھنا قرآن مجید اور احادیث صحیح کا بلطائف الحیل انکار کرنا ہے ورنہ یہ چیزیں واقعۃً موجود ہیں، اور ہم ان کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، علامہ ابن تیمیہ نے کتاب العقل والنقل میں لکھا ہے،

اما ما اخبرت بہ الرسل صلوات الله علیھم من الغیب فھو امور موجودۃ ثابتۃ اکمل واعظم مما نشاھدہ نحن فی ھذہ الدار وتلک امور محسوسۃ تشاھد وتحس ولکن بعد الموت وفی الدار الآخرۃ ویمکن ان یشھدھا فی ھذہ الدار من یخصہ اللہ بذالک۔	لیکن انبیاء نے غیب کی جن باتوں سے خبر دی ہے، وہ ایسے امور ہیں، جو موجود ہیں، اور ثابت ہیں، زیادہ کامل اور زیادہ عظیم الشان ان چیزوں سے جن کا ہم اس دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں، اور ایسے امور ہیں، جو محسوس ہوتے ہیں، اور ان کا مشاہدہ اور احساس ہوتا ہے، لیکن مرنے کے بعد اور آخرت میں اور اس عالم میں بھی ان لوگوں کے لیے ان کا مشاہدہ ممکن ہے، جن کو خدا اس شرف سے ممتاز کرے۔

اس بیان پر یہ اعتراض ہوگا، کہ اس سے یہ لازم آتا ہے، کہ عالمِ غیب کا

عام طور پر مشاہدہ ہو سکے، لیکن اس کا احساس اور مشاہدہ نہیں ہوتا، اس لیے مذہب نے جن خلاف مشاہدہ اور حواس سے بالاتر امور کا ذکر کیا ہے، وہ خود موجود نہیں ہیں، کیونکہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے، کہ انبیاء کو نظر آئے، اور عام انسانوں کو نظر نہ آئے،

اس اعتراض کے دفع کرنے کے لیے اور اصل واقعہ سمجھنے کے لیے چند مقامات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے:

(۱) ہمارے ذرائع علم صرف حواس ہیں،

ہمارے ادراکات، علوم، تصورات صرف حواس سے حاصل ہوتے ہیں، اگر ہمارے پاس حاسۂ سمع نہ ہو، تو ہم کچھ نہ سن سکیں، اور نہ تو آواز کا کوئی تصور ہمارے ذہن میں آسکے، اور نہ نغمہ، ترنم اور بدآوازی میں کوئی فرق پیدا کر سکیں، اسی طرح اگر آنکھیں نہ ہوں، اور حاسۂ بصارت معدوم ہو، تو ہم کچھ نہ دیکھ سکیں، اور نہ خوش رنگ و بدرنگ میں کوئی تمیز پیدا کر سکیں، اور اگر حاسۂ ذوق جاتا رہے تو ہم مزے کا علم نہیں حاصل کر سکتے، اور اگر حاسۂ شم نہ رہے، تو ہم بو کا تصور نہیں کر سکتے، اور اگر کسی انسان کے یہ تمام حواس خلقۃً معدوم ہیں، تو وہ دنیا میں آکر کسی چیز کا علم حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ ہمارے علوم کے ذرائع محض حواس ہیں، ان ہی حواس کے ذریعہ سے ہم خاص خاص جزئی چیزوں کا علم حاصل کرتے ہیں، جو ذہن میں آکر قضایائے کلیہ کی حیثیت پیدا کر لیتی ہیں، اور جب ذرائع علم مسدود ہو جائیں گے، تو ہمارے ذہن میں نہ جزئی اور نہ کلی کسی قسم

کا کوئی تصور نہیں آسکتا، اس لیے اگر کسی انسان سے کوئی حاسہ معدوم ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں، کہ اس حاسہ کے ذریعہ سے جو چیزیں معلوم کی جاتی ہیں، ان کا علم اور تصور اس وقت تک اس کے ذہن سے معدوم ہوگا، جب تک کوئی دوسرا اس کو نہ بتائے، اور اس وقت بھی اس کا تصور ناقص ہوگا،

(۲) حواس کی کوئی تحدید نہیں کی جاسکتی،

عام طور پر یہ خیال ہے، کہ حواس ظاہری پانچ ہیں، باصرہ، سامعہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ اسی طرح حواس باطنی بھی پانچ ہیں، حس مشترک، خیال، واہمہ، متخیلہ، حافظہ، لیکن دراصل حواس کے صرف انہی پانچ میں محدود ہونے پر استقرار کے سوا کوئی دلیل نہیں قائم کی جاسکتی، چونکہ عام طور پر انسان کے موجودہ عام حواس صرف یہی پانچ قسم کے ہیں، اس لیے ہم سمجھتے ہیں، کہ ان کے سوا اور کسی حاسہ کا وجود نہیں ہوسکتا، حالانکہ خود فلسفۂ جدیدہ حواس خمسہ کی تحدید کو قبول نہیں کرتا، بعض جانوروں میں ایسے حاسے پائے گئے ہیں جو حواس خمسہ سے زائد ہیں، بعض قسم کے کتوں میں ایک ایسا حاسہ دریافت ہوا ہے، جس سے وہ ہمیشہ اپنے مالک کو پہچان لیتے ہیں، چاہے وہ کسی حالت، کسی ہیئت، اور کسی لباس میں ہو، اور وہ کسی طرح چھپانے کے لیے اپنا رنگ بدلے، اکثر علمائے طبیعیت کی یہ رائے ہے، کہ ان کتوں کا یہ احساس کسی خاص حاسہ کے ذریعہ سے پیدا ہوا ہے، جو عام انسانوں اور حیوانوں میں موجود نہیں ہے، ہم خود جب کسی

چیز کو اٹھاتے ہو، تو اس کا ثقل یا ہلکا پن محسوس کرتے ہو، یہ وزن تم نے کس حاسہ سے دریافت کیا، ممکن ہے کہ قوتِ لامسہ کہو، لیکن اس احساس میں اگر قوتِ لامسہ کو دخل ہوتا تو چاہیے کہ ہات لگنے کے ساتھ ہی ہم کو شے کا وزن معلوم ہو جائے، حالانکہ جب تک ہم اٹھاتے نہیں ہم کو وزن کا احساس نہیں ہوتا، ہم اشیاء کے طول و عرض اور مقدار کا احساس کرتے ہیں، کس حاسہ سے؟ ممکن ہے کہ قوتِ باصرہ کہو، لیکن یہ ثابت ہے کہ آلتِ باصرہ صرف رنگ اور روشنی کا احساس کرتی ہے، اور چونکہ ہم جزئی مقدار اور جزئی وزن کا احساس کرتے ہیں، اس لیے کسی زائد حاسہ کا وجود ضرور ہے، کیونکہ جزئی اور خاص خاص چیزوں کا ادراک بغیر کسی حاسہ کے نہیں ہو سکتا،

ممکن ہے، کہ انبیاءؑ میں جو نوعِ انسان کی ایک خاص صنف ہے، عام اصناف انسان سے کوئی زائد حاسہ موجود ہو جس سے وہ عالم غیب کا مشاہدہ کر سکتے ہوں،

پہلے مقدمہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے، کہ جو حاسہ ہم سے معدوم ہوگا، اس حاسہ سے جو تصورات اور علوم متعلق ہوں گے، ہم ان کا کسی طرح احساس یا ادراک نہیں کر سکتے، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ زائد حاسہ جو عالمِ غیب کے لیے ضروری ہے ہم میں بالفعل موجود نہیں ہے، اس لیے ہم خود عالم غیب کا اس وقت تک نہ احساس کر سکتے ہیں، اور نہ مشاہدہ کر سکتے ہیں، جب تک وہ زائد حاسہ ہم نہ حاصل کر لیں،

اور جس طرح نوعِ انسانی کی بعض اصناف نے بعض خاص خاص اوصاف

میں ممتاز ہوتے ہیں، اور اسی طرح دوسرے مقدمہ کی بنا پر، یہ ممکن ہے کہ انبیاءؑ میں جو نوع انسان کی ایک خاص صنف ہے، معمولی حواس سے کوئی زائد حاسہ ہو۔ جس سے وہ عالم غیب کا مشاہدہ کر سکتے ہوں، اس لیے جس طرح ایک معدوم البصارت نابینا رنگوں کے متعلق آنکھ والوں کی تکذیب نہیں کر سکتا، اور نہ اس کے متعلق وہ اس سے زیادہ جان سکتا ہے، جو آنکھ والوں سے اس نے سنا ہے، اسی طرح عام انسان انبیاءؑ کی تکذیب کی جرأت نہیں کر سکتے، اور نہ اس سے زیادہ وہ عالمِ غیب کے متعلق کچھ کہہ سکتے ہیں، جو انھوں نے انبیاء سے سنا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو کسی زائد حاسہ کے تسلیم کرنے میں تامل ہو، اس لیے حسب ذیل مقدمات سے بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے،

(۱) افراد انسان میں حواس متفاوت ہیں،

ایک انسان جس قدر دیکھ سکتا ہے، دوسرا انسان اس سے زیادہ دیکھ سکتا اور سن سکتا ہے، جو لوگ کم نظر ہوتے ہیں وہ کم دیکھتے ہیں، لیکن دوسرا شخص جو تیز نظر ہوتا ہے، وہ ان سے زیادہ دیکھتا ہے، بعض انسان دور کی چیزیں نہیں دیکھ سکتے، لیکن ایسے انسان بھی موجود ہیں، جو دور سے دور اور باریک سے باریک چیزوں کو نہایت آسانی سے دیکھ سکتے ہیں، ضعیف القویٰ انسان کے حواس کمزور ہوتے ہیں، بچے اور بوڑھے زیادہ نہیں دیکھ سکتے، جوان بہت زیادہ دیکھتے ہیں،

یہ تفاوت اور کمی و بیشی تمام حواس میں ممکن ہے، بلکہ موجود ہے، زرقا، عرب میں ایک ایسی عورت تھی، جو تین منزل کی مسافت سے چیزوں کو دیکھ لیتی تھی، چیونٹی میں قوت شامہ، کبوتروں میں قوت باصرہ، کتے میں قوت تمیز، معمولی قوت سے بہت زیادہ ہوتی ہے، شہد کی مکھیوں میں ایک عجیب و غریب قوت دریافت ہوئی ہے، جس سے عام انسان اور حیوان محروم ہیں، اگر شہد کی مکھیوں کو کسی ایسی محفوظ چیز میں بند کردیں، جس سے باہر کی کوئی چیز نہ معلوم ہو سکے، اور ان کو سیکڑوں میل دور پیچ در پیچ راستوں سے لے جائیں، اور وہاں ان کو کھول دیں، تو وہ نہایت آسانی سے اپنے اصلی مرکز پر واپس آجاتی ہیں،

خود انسان کے حواس کس قدر متفاوت اور مختلف الدرجہ ہیں، ایک انسان دور سے ایک آواز سنتا ہے، دور کی ایک چیز اس کو نظر آتی ہے، دور کی نہایت نازک خوشبو وہ محسوس کرلیتا ہے، لیکن کمزور حواس کے انسان ان کا مطلق احساس نہیں کرسکتے، لیکن اگر کسی وجہ سے ان کے حواس زیادہ قوی اور تیز ہوسکیں، تو وہ بھی اسی طرح دیکھ سکتے ہیں، سن سکتے ہیں، سونگھ سکتے ہیں،

(۲) ہمارے حواس کی قوت بڑھ سکتی ہے،

مقدمۂ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کم نظر انسان جس قدر دیکھ سکتا ہے، اگر اس کی قوتِ بصارت تیز ہوجائے، تو اور زیادہ دیکھ سکتا ہے، بلکہ بصارت کی جس حد تک قوت بڑھتی جائے گی، اس کا احساس بڑھتا جائے گا، ہمارے

ہاتھ میں پانی کا گلاس ہے، اور ہم اس کو پینا چاہتے ہیں، اس میں گرد وغبار کا ہم کو ایک ذرہ نظر نہیں آتا، لیکن اگر ہم خوردبین اٹھالیں، تو گرد تو گرد ہمیں ایک ایک قطرے میں سیکڑوں کیڑے نظر آئیں گے، ذرہ ذرہ میں ہم کو کیڑوں کی بستی کی بستی نظر آئے گی، خالی آنکھوں سے ہمیں صرف آفتاب، ماہتاب اور معمولی ستارے نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ بطلیموس اور ارسطو کو ثوابت کی حرکت تک معلوم نہ ہوئی، اور اس وقت تک صرف تین سو ثوابت دریافت ہوئے تھے، مسلمانوں نے جب آلات ایجاد کیے، تو چند ستارے اور دریافت ہوئے، اور اب ارجلانڈر کی تحقیق کے موافق صرف ساتویں درجہ کے ستارے تیرہ ہزار ہیں؛ اور آٹھویں درجہ کے چالیس ہزار اور نویں درجہ کے ایک لاکھ بیالیس ہزار ہیں، اور تمام ستارے جو ہرشل کی دوربین سے نظر آتے ہیں، دو کرور تک ہیں، اور چنانچہ دوربینوں کی طاقت جتنی بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر قوتِ بصارت میں ترقی ہورہی ہے، واشنگٹن کی دوربین سے آسمان کے ایک خاص حصہ میں ۶۳ ستارے نظر آتے تھے، جب سیکی کی دوربین ایجاد ہوئی، تو اسی حصہ میں ایک سو اکسٹھ ستارے دریافت ہوئے، اس کے بعد واکیلسٹف کی دوربین سے اسی خاص حصہ میں ایک سو بہتر[۱۷۲] ستارے نظر آئے؛ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ٹیلسکوپ اور میکرسکوپ وغیرہ کی جتنی قوت بڑھتی جائے گی، قوتِ بصارت میں حیرت انگیز ترقی ہوتی جائے گی؛ آلاتِ سمع کی قوت اور ترقی کا بھی یہی حال ہے،

(۳) اس لیے ممکن ہے کہ انبیاءؑ کی قوت حواس عام افراد انسان کی قوتِ حواس سے بالاتر ہو، اور وہ عالم غیب کے وہ اسرار دیکھتے ہوں، جو معمولی حواس سے نظر نہیں آسکتے، اور جس طرح ایک کمزور بصارت کا انسان ایک تیز نظر انسان کے محسوسات کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتا، کہ جو کچھ تم کو محسوس ہوتا ہے، اور تم دیکھ رہے ہو وہ اس لیے غلط اور ناقابل اعتبار ہیں، کہ ہم نہیں دیکھتے، اسی طرح ہم انبیاءؑ کے محسوسات غیب کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے، کہ وہ اس لیے غلط ہیں، کہ ہم ان کا مشاہدہ نہیں کرتے، اس لیے ممکن ہے کہ موت کے بعد یا بعض لوگوں کو خود زندگی میں جب مادی حجابات اور کثافتوں سے روح پاک ہو جائے، اور قوائے حواس زیادہ تیز ہو جائیں، تو ان کا مشاہدہ ہو سکے،

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ عالم غیب کی جن باتوں کا مشاہدہ انبیاءؑ کرتے ہیں، اور جن کی وہ اپنے پیرووں کو اطلاع دیتے ہیں، وہ بالکل ممکن ہے، اور کوئی خلاف امر نہیں ہے، کہ وہ ان کا اپنے ان ظاہری حواس سے مشاہدہ کرتے ہوں، اور ہم ان کا بالفعل مشاہدہ نہیں کر سکتے، اور خود ان انبیاءؑ کی اخلاقی زندگی اور اپنے محسوسات و معتقدات پر غیر معمولی استحکام اور استقلال اس بات کی دلیل ہے، کہ جو وہ کہتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں،

یہاں پر ایک اور امر بھی لحاظ کے قابل ہے، جس طرح انسان کے ظاہری حواس متفاوت اور کم و بیش ہیں، اسی طرح انسان کے باطنی حواس بھی کم و بیش اور

مختلف المدارج ہیں، ایک شخص ذراسی بات بہت دیر میں سمجھتا ہے، اور دوسرا مشکل سے مشکل مسئلہ نہایت آسانی سے اور بہت جلد سمجھ جاتا ہے، مشق و غور سے باطنی قویٰ میں ہمیشہ ترقی ہوتی رہتی ہے، ایک جاہل آدمی کے سامنے مثلاً اقلیدس کا یہ مسئلہ کہ مثلث کے تینوں زاویے مل کر، دو زاویہ قائمہ کے برابر ہوتے ہیں، پیش کیا جائے، تو وہ اس سے انکار کردے گا، لیکن ایک ماہر اقلیدس اس مسئلہ کو بلا دلیل مان لے گا، مکسائل جو ایک بہت بڑا ریاضی داں تھا وہ مشکل سے مشکل حساب کو ایک نظر دیکھ کر حل کر دیتا تھا، اسحاق نیوٹن نے علم ہیئت کے بعض ایسے مقدمات ترتیب دیے ہیں، جو صحیح ہیں، اور اب تک سمجھ میں نہیں آتے، محقق طوسی نے اقلیدس کے تمام اشکال پر، خود اپنی طرف سے بیسیوں دلائل قائم کر دیئے، علاف جو علم کلام کا موجد اور واصل جو اصولِ فقہ کا موجد ابن حیان جو علم کیمیا کا مجدد ہے، کیا اُن کے باطنی حواس معمولی انسان سے بہتر نہیں تھے۔ اور انھوں نے ایسے مسائل اور نتائج نہیں مستنبط کیے، جن کو معمولی فہم و دماغ کا آدمی نہیں سمجھ سکتا،

اسی طرح انبیاءؑ نے اخلاقی، روحانی اور علم غیب کے وہ اسرار و مکنونات دریافت کیے، جو معمولی انسانوں کے دسترس اور قوت سے بالاتر ہیں، اس لیے ہم کو انبیاءؑ کی تصدیق کرنی چاہیے، اور عالم کی جن باتوں کی وہ ہمیں اطلاع دیتے ہیں، ہم کو ان پر ایمان لانا چاہیے، لیکن یہاں پر ایک اور غلطی بھی ہے، وہ یہ ہے کہ اس

خوش اعتقادی اور ممکن خیال کو اس قدر وسعت دی جاتی ہے، کہ ہر واقعہ اس کے اندر داخل کر دیا جاتا ہے، اس لیے سب سے پہلے خلاف مشاہدہ اور روحانی واقعات کے لیے ہم کو یہ تحقیق کرنا چاہیے، کہ ان واقعات کی جو شخص خبر دیتا ہے اس کی اخلاقی حالت کیسی تھی، وہ جھوٹ کبھی نہیں بولتا، اور نیز ان واقعات کی صحت پر خود اس کے اعتقاد کو کس قدر استحکام تھا، اور تیسرے یہ کہ جس سلسلہ سے ان واقعات کی خبر ہم تک پہنچی ہے، وہ سلسلہ کس قدر مضبوط اور غیر متہم ہے، ان منازل کے طے کرنے کے بعد مادہ پرستوں کے عالم غیب سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے،

میٹریلسٹ اب خود یورپ میں اسپریچولسٹ کے مقابلہ میں شکست کھا رہے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ ہماری جدید جماعت بھی اپنی موجودہ غلطی سے متنبہ ہو۔

ربنا اهد قومی فانهم لا یعلمون

(الندوہ، دسمبر ۱۹۰۸ء)

قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات

آغاز

آج مدارس اور خانقاہوں میں غوغا ہے کہ سائنس نے مذہب کے ایوان میں تزلزل ڈال دیا ہے، لیکن شاید یہ خبر نہ ہو کہ نہ صرف سائنس اور علوم عقلی کی موجوں نے زورقِ ایمان کو تلاطم میں مبتلا کر رکھا ہے، بلکہ یورپ کا ہر علم وفن منافعِ عامہ کے ساتھ کچھ نہ کچھ اپنی تہ میں زہر کی آمیزش ضرور رکھتا ہے، تاریخ اب سے پہلے ایک معصوم علم تھا لیکن اب وہ ہر قسم کے جرائم کا مجموعہ ہوگئی ہے۔

تاریخ کی اب دو قسمیں ہوگئی ہیں، جدید تاریخ (ماڈرن ہسٹری) اور قدیم تاریخ (اینشنٹ ہسٹری) قرآن مجید میں جن اشخاص اور قوموں کا ذکر ہے، ان کا تعلق زیادہ تر دنیا کی قدیم تاریخ سے ہے، قدیم تاریخ کا ابتدائی حصہ عموماً افسانہ مذہبی (میتھالوجی) سمجھا جاتا ہے، قرآن میں قومِ نوحؑ، عادؑ، ثمودؑ، کے متعلق جو واقعات عبرت انگیز مذکور ہیں، عموماً اب انگریزی علمائے تاریخ میتھالوجی اور افسانۂ کہن سمجھتے ہیں، ہم نے اس موضوع پر ارض القرآن کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں بدلائل تاریخ و آثار اقوام کی حقیقت و اصلیت اور قرآن میں، ان کے متعلق جو کچھ

مذکور ہے، یورپ کے مسلّم تحقیقات اور علم الآثار سے اس کا ثبوت بہم پہنچایا ہے،

اس مضمون میں اسی قسم کے ایک اور سلسلۂ اعتراضات کی طرف ہم کو توجہ کرنا ہے، یورپ کے علمائے مشرقیات اور مسیحیت کے حامیانِ دین نے قرآن مجید کے متعلق ایک عجیب و غریب اصول موضوعہ بنالیا ہے جن کے مطابق قرآن مجید کا کوئی نقطہ بھی اپنی جگہ پر صحیح نہیں، اصول مذکورہ یہ ہے، کہ قرآن کا ہر واقعہ تاریخی یا تو کسی دوسری مذہبی کتاب میں مذکور ہے، یا وہ اس سے خاموش ہے، صورت اوّل میں قرآن کا سرقہ ثابت اور وہ حکایت اس سے ماخوذ اور اگر وہ بدقسمتی سے تنہا قرآن کی روایت ہو تو وہ افسانہ محض اور میتھالوجی، لیکن اس اصول کے مطابق تو دنیا کی کوئی مذہبی تاریخ جملۂ ایراد سے محفوظ نہیں،

نہ من دل زدہ از دستِ تو خونیں جگرم ازغم عشق تو پُر خوں جگرے نیست کہ نیست

ان ہی اصنافِ اعتراضات میں سے قرآن مجید کی تاریخی غلطیوں (نعوذ باللہ) کا مسئلہ بھی ہے، ان غلطیوں کا مدار زیادہ تر چند ناموں کا توراۃ و انجیل اور قرآن میں اختلاف ہے، سب سے پہلا سوال یہ ہے، کہ ان اختلافات کے موقع پر توراۃ و انجیل کو صحت کا معیار قرار دیا گیا ہے، حالانکہ تاریخ جس بلند آہنگی سے اس دعویٰ کی تکذیب کرتی ہے، شاید کسی اور صحیفۂ آسمانی کو وہ عزت نصیب نہ ہو، بہر حال حریف کے مسلّمات کو مان کر بھی کیا اسلام کی صفِ دفاعی میں ان لوگوں سے کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے،

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام آزر مذکور ہے،

اذقال ابراہیمُ لابیہ آزر　　ابراہیمؑ نے جب اپنے باپ آزر سے کہا،

بائبل میں تارح اور ترح مذکور ہے، اس اختلاف نے بہت سے علمی جاہلوں کے لیے اعتراض کا موقع پیدا کر دیا ہے، سب سے اول یہ جاننا چاہیے کہ توراۃ اور قرآن میں کم از کم دو ہزار برس کا فصل ہے، اصل توراۃ کی زبان عبری تھی، یہودیوں کے سیاسی انقلابات کے ساتھ ان کے مذہب کی زبان بھی بدلتی رہی، موجودہ عبرانی توراۃ اصل عبری نہیں، آرامی یا یونانی کا ترجمہ ہے، ان حالات کے ساتھ اس فصل زمانہ کے باوجود اس اختلاف السنہ کے الٹ پھیر میں اگر نام مختلف قوموں اور زبانوں میں کچھ سے کچھ ہو جائیں، تو کیا کوئی محل اعتراض ہے، انگریزی بائبل کے ناموں کا تلفظ بالکل یونانی اور لاطینی ہے، جو اصل عبرانی سے بمراحل دُور ہے، لیکن کیا یہ اختلاف حرف گیری کا مرکز بن سکتا ہے،

حکمائے اسلام پر ابھی دس صدیاں بھی نہیں گذری ہیں، عربی تصنیفات کے تراجم کے ذریعہ سے ان کا نام مدت تک یورپ کے ایک ایک طالب العلم کی زبان پر رہا ہے، ابوعلی بن سینا، الوالقاسم زہراوی، ابن رشد، ابن ہیثم کو ہم سب جانتے ہیں لیکن اوسنا، ابیقاسیس اور س، الہزین کو ہم میں سے کون جانتا ہے؟ اور یہ کون تسلیم کرے گا، کہ یہ مشرقی فلاسفر کے عربی نام ہیں،

مسیحؑ یورپ کا خدا ہے، تاہم اس کا جو نام یورپ کی زبانوں میں مستعمل ہے، وہ

اصل سے کہاں تک مطابق ہے، اصل عبری نام ایشوع ہے، جو مخفف ہو کر "یشوع" ہوگیا ہے، یونانی میں یونانی طریق تلفظ پر "جیسیوس" ہوگیا، لاطینی میں یہ صرف "جیزس" رہ گیا، اور اب تمام یورپ میں یہی حضرت مسیحؑ کا نام ہے، اکبر کے زمانہ میں جب پرتگالی پادریوں نے انجیل کا فارسی میں ترجمہ کیا تو جیزس ژژد ہوگیا، ع

اے نام تو ژژد کرستو

یہ مغربی انقلابات ہیں، عرب میں یہی نام عیسیٰ کی شکل میں بدل گیا تھا، سوال یہ ہے کہ یسوع، جیسیوس، جیزس ژژد، اور پھر عیسیٰ کیا ایک ہی چیز ہے، اور ایک ہی شخصیت کے نام ہیں، مسیح کے استاد کا نام عبرانی میں یحنّا، لاطینی میں جان اور عربی میں یحییٰ ہے، کیا یحییٰ، یوحنا اور جان تین چیزیں ہیں، اسی طرح تمام عبرانی پیغمبروں کے ناموں کا مختلف زبانوں میں یہی حال ہے،

اس اعتراض سے ہمارے مفسرین بھی واقف تھے، امام طبری، قاضی بیضاوی، زمخشری اور رازی نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں، ان جوابات کا تمام تر دار مدار سدی اور مجاہد کے اقوال ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے،

۱۔ آزر، حضرت ابراہیمؑ کے باپ تارح کا دوسرا نام تھا جس طرح حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام اسرائیل تھا،

۲۔ آزر تارح کا نام نہیں لقب یا وصف تھا،

۴۔ آزر، تارح کے بُت کا نام تھا،

ان جوابات کا دوسرا اور تیسرا نمبر تقریباً صحیح ہے، تارح بابل کا باشندہ تھا، ایرانی مذہب، ایرانی زبان، ایرانی حکومت اسی بابل کی یادگار ہے، اور خود اہلِ عجم کو اس کا دعویٰ ہے، آزر قدیم ایرانی زبان میں آگ کو کہتے ہیں، آگ ستارۂ مریخ کا مظہر ہے، اس بنا پر مریخ کو بھی آزر کہتے ہیں، آگ اور ستارۂ مریخ ایرانیوں کا مسجود ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ بابل کے قدیم بت پرستوں میں بھی اس کی پرستش جاری ہوگی، اور اسی سے منتقل ہوکر، آذر گسپ ایک فرشتہ موکل کا نام قرار پایا، عجب نہیں، اگر قدیم بابل میں موبدیعنی پرستارِ آتشخانہ کا آزر کے انتساب سے کوئی نام یا لقب قرار پایا ہو اور عربی میں آکر وہ صرف آزر رہ گیا ہو،

بہرحال یہ قیاس ہے، اب اس کے متعلق ایک اور تازہ تحقیق پیشِ نظر ہے، اصل عبرانی توراۃ میں یہ نام "ترح" ہے، ترگوم (توراۃ کے آرامی ترجمہ میں) تارح اور تاراح ہے، تالمود میں جو یہودیوں کے ہاں حدیث کا درجہ رکھتی ہے، زاراح[1] ہے، بائبل کا ایک نہایت قدیم ترجمہ عربی میں اصل عبرانی سے پندرھویں صدی میں رومہ میں ہوا تھا، اس کے بعد وہی ترجمہ دوبارہ انگلینڈ سے شائع ہوا، اس ترجمہ میں لوقا کی انجیل میں (نسب نامۂ مسیح) ثارا ہے، ہر زبان میں اجنبی الفاظ کو

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور جوئش انسائیکلوپیڈیا بلفظ ابراہیم،

اپنے ذخیرہ لغت میں ضم کرنے کے لیے اس کو صورۃً اور وزناً اپنے الفاظ کے مطابق کرنا پڑتا ہے، اسی کا نام تعریب وتفریس وغیرہ ہے، اردو میں انگریزی کے سیکڑوں الفاظ مستعمل ہیں، ان میں سے کن میں اب انگریزی لب ولہجہ باقی ہے، عربی زبان میں فارسی، یونانی، لاطینی وغیرہ کے ہزاروں الفاظ آکر مل گئے ہیں، مگر اس اختلاط اور دفع بیگانگی کے لیے اپنی اصلی ہیئت چھوڑ کر ان کو پہلے ٹھیٹھ عرب بن جانا پڑا ہے، موسیٰ دراصل موشے ہے، عیسیٰ یشوع ہے، یحییٰ یوحنا ہے، ایوب اوب ہے یونس یوناہ ہے، اسی طرح زاراح اور زارا عربی وزن وتلفظ میں آزر ہوگیا ہے،

آزر کے متعلق قرآن مجید میں مذکور ہے، کہ وہ بت پرست تھا، تفسیروں میں ہے کہ بت تراشی اس کا پیشہ تھا، حضرت ابراہیمؑ نے جس بت خانہ کو ویران کیا تھا، وہ خود آزر کا تھا، لیکن توراۃ کی سفر تکوین میں بلکہ موسیٰ کی پانچوں کتابوں میں سے کسی میں بھی، جہاں آزر کا ذکر ہے، ان واقعات کا مطلق ذکر نہیں، اس بنا پر کوتاہ نظروں کے لیے اعتراض کا موقع ہے۔

سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ قرآن مجید میں صرف اسی قدر مذکور ہے، کہ آزر اور آزر کا خاندان بت پرست تھا، آزر کی بت تراشی کا ذکر قرآن میں مطلق نہیں ہے، اس واقعہ کے متعلق قرآن کی حسب ذیل آیتیں ہیں،

۱ اذ قال ابراهيم لابيه آزر — جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ

أتتخذ أصناماً الهة (انعام) کیا تم بتوں کو خدا ٹھہراتے ہو۔

اس آیت میں صرف آزر کا ذکر ہے لیکن دوسری آیتوں میں خاندان کا ذکر بھی ہے،

اذ قال ابراھیم لابیہ وقومہ ماھذہ التماثیل التی انتم عاکفون۔ (انبیاء) جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا، کیا یہ مورتیں ہیں جن کو تم گھیرے بیٹھے رہتے ہو،

ایک اور آیت میں یہ تصریح ہے،

وابراھیم اذ قال لقومہ اعبدوا اللہ واتقوہ ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون انما تعبدون من دون اللہ اوثاناً وتخلقون افکا۔ (عنکبوت) اور ابراہیمؑ جب اس نے اپنی قوم سے کہا، خدا کو پوجو، اور اس سے ڈرا کرو، اگر تم کو علم ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، تم خدا کو چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہو، اور جھوٹی بات گھڑتے ہو۔

اس امر کا ثبوت کہ آزر اور آزر کی قوم بت پرست تھی، دو طریقہ سے بہم پہنچایا جاسکتا ہے، توراۃ کے دوسرے صحیفوں میں جو معترضین کے نزدیک صحت میں، موسیٰ کی پانچ کتابوں کے برابر ہے، اور بائبل یعنی کتب الٰہی کا جز رہے، مذکور ہو، دوسری صورت یہ ہے، کہ جس ملک میں یہ سکونت پذیر تھے، وہاں کی مذہبی تاریخ سند میں پیش کی جائے،

آزر کا خاندان نہر (فرات) پار (یشوع ۲۴-۲) کلدانیوں کے ملک (اورکسیدیم) میں رہتا تھا، (تکوین ۱۱-۱) کلدانی ستارہ پرست تھے، ستاروں کے نام کا ہیکل بناتے تھے، ان میں ستاروں کے خیالی بت نصب کرتے تھے، ان پر نذریں چڑھائی جاتی تھیں، قربانیاں کی جاتی تھیں، دانیال کے زمانہ میں جو غالباً مسیح سے چھ سو برس پہلے تھے، اور جب کلدانیوں میں دبنوخذ ندر (بخت نصر) کا خاندان فرماں روا تھا، اسی قسم کی پرستش جاری تھی، سونے کے بُت ہوتے تھے۔ ان کو لوگ سجدہ کرتے تھے، (دانیال ۳-۱۱) علم آلاثار کی روشنی نے اس ملک کے تمام مذہبی رسوم، بتوں کے نام، پرستش گاہیں، ایک ایک چیز آئینہ کردی ہے، جس کو زیادہ تفصیل منظور ہو، وہ انسائیکلو پیڈیا آف رلیجس اینڈ اتھکس میں لفظ بیلونیا (بابل) دیکھے،

حران و بابل میں اور خود اسی خاندان میں حضرت ابراہیمؑ کے بعد بھی بت پرستی کا اس قدر رواج تھا، کہ حضرت ابراہیمؑ کے بھائی کا گھرانا بت پوجتا تھا، حضرت یعقوبؑ جو حضرت ابراہیمؑ کی دوسری پشت میں تھے، یعنی پوتے تھے، جب کنعان (شام) کے ملک سے حران (بابل) میں اپنے خاندان میں اپنے ماموں کی لڑکی سے بیاہ کرنے گئے، تو یہ بُت ایسی نادر چیز تھی، کہ صاحبزادی جب بیاہ کر گھر سے رخصت ہوئیں تو باپ کے بُت بھی چپکے سے چرالائیں، (تکوین ۳۱-۳۲-۳۳-۳۴) ایسی بیش قیمت چیز کے ہاتھ سے چلے جانے پر باپ سے صبر نہ ہوسکا، بیٹی اور داماد کے تعاقب میں گھوڑے کر دوڑے، آخر صلح ہوئی، حضرت یعقوبؑ کو بیت ایل کے قریب پہنچ کر

جب ان بتوں کا حال معلوم ہوا، تو ان سب کو خیمہ کے باہر پھینکوا دیا۔ (تکوین ۲-۳۵)

اب ان دور دور کے استدلالات کو چھوڑ کر، ہم خود تورات کے اس سفر کا حوالہ دیتے ہیں، جو حضرت موسیٰؑ کے خلیفۂ اول یوشع کا نتیجۂ الہام ہے حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد سکیم کے مقام میں بنی اسرائیل کے سامنے جو سب سے پہلا خطبۂ خلافت انھوں نے دیا ہے، اس میں وہ کہتے ہیں،

تمہارے باپ دادے تارح (آزر) ابراہیم کا باپ اور ناحور (حضرت ابراہیمؑ کے دادا کا نام) قدیم زمانہ میں نہر (فرات) کے پار رہتے تھے، اور غیر معبودوں کی بندگی کرتے تھے۔ (۲۴-۲:۲) —

کیا ہمارے دوستوں کو اس مقدمہ میں اس سے بھی واضح تر شہادت مطلوب ہے،

تفسیر کی کتابوں میں آزر کے متعلق مذکور ہے، کہ وہ بت بنا کر بیچا کرتا تھا، ایک دفعہ وہ حضرت ابراہیمؑ کو دکان میں بٹھا کر کسی ضرورت سے باہر گیا، اتنے میں ایک گاہک آیا، حضرت ابراہیمؑ نے اس کو توحید کی دعوت دی، اور بت پرستی کے معائب بیان کیے، اور دکان میں جتنے بت اور دیوتاؤں کے مجسمے بنے ہوئے رکھے تھے، سب توڑ پھوڑ کر رکھ دیئے، یہ واقعہ اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ تالمود میں مذکور ہے، قرآن مجید میں صرف حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی کا ذکر ہے،

تالمود کی تفصیل جزئیات سے وہ خالی ہے، اور اس لیے ہم کو اس کے لیے مزید ثبوت پہنچانے کی ضرورت نہیں،

مریم بنت عمران، اخت ہارون | مریم، قرآن مجید کے دیگر مقدس ناموں کی طرح عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنی "ستارۂ سحر" کے ہیں، بائبل میں یہ دو عورتوں کا نام ہے، حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ بن عمران کی بہن کا نام بھی مریم تھا، اور حضرت عیسیٰؑ کی ماں کا نام بھی مریم ہے، پرستارانِ مریم کا بیان ہے، کہ قرآن نے ان دونوں شخصیتوں کو ایک سمجھ کر دونوں کے نام و نسب باہم مختلط کر دیئے ہیں، قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کی ماں مریم کو عمران کی بیٹی، اور ہارون کی بہن قرار دیا ہے، جیسا کہ اس کی حسب ذیل آیتیں ظاہر کرتی ہیں،

ومریم بنت عمران التی احصنت فرجها. (تحریم)	عمران کی بیٹی مریم جو پاک دامن اور عفیف تھی،
اذ قالت امرءۃ عمران انی نذرت لک مافی بطنی محررًا (آل عمران)	عمران کی بیوی نے جب کہا کہ جو کچھ میرے شکم میں ہے، میں خدا کے نام پر اس کو چڑھاتی ہوں،
یا اخت ھارون ماکان ابوک امرأ سوء وما کانت امک بغیاً۔	اے ہارونؑ کی بہن تیرا باپ برا اور تیری ماں بدکردار تو نہ تھی،

تحقیقی جواب تو الگ ہے، لیکن ہم اپنے معترضین سے دست بستہ عرض کریں گے، کہ خدارا جو جی چاہے، کہیے مگر اسلام پر "دو کو ایک اور ایک کو دو"

کہنے کا الزام تونہ قائم کیجئے، اس لاینحل فلسفۂ اعداد کو اپنے ہی تک محدود رکھیے، تو بہتر ہے، مؤرخین اسلام میں ایک مصنف کا نام حمزہ ہے، جس کی تاریخ ملوک الارض ہے، یورپ کا مایۂ ناز مشرقی محقق دی ہاربیلاٹ جانتے ہو، اس کو کیا سمجھتا ہے، حمزہ ابن عبدالمطلب سید الشہداء،

بہر سوئے متاعِ عقل و دانش ابتر افتادہ است

بہ غارت برد باز آں چشمِ پُرفن کاردانے را

ہم کو یہ تسلیم ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کی بہن کا نام بھی مریم تھا، اور ان کے باپ کا نام عمران (عبری عمرام[1] تھا) لیکن یہ کیونکر معلوم ہو سکا، کہ حضرت مسیحؑ کی ماں مریم کے باپ کا نام عمران اور ان کے بھائی کا نام ہارون نہ تھا، حضرت مریمؑ کے خاندانی حالات کے متعلق انجیلوں میں ایک حرف مذکور نہیں[2]، ان کے متعلق صرف اسی قدر معلوم ہے، کہ "وہ خداوند کی ماں" تھیں، پھر وہ کونسی شہادتیں ہیں جن کی بناپر قرآن مجید کے دعوے کی تردید کی جاتی ہے، اگر مسیح سے ۳۰۰ برس پہلے ایک مقدونیہ کا الگزنڈر تھا، جس کے باپ کا نام فلیپ تھا، تو کیا اس واقعہ سے اس کی تکذیب کرنا چاہتے ہو، کہ بیسویں صدی کے لندن میں اب کوئی الگزنڈر نامی شخص ایسا نہیں ہو سکتا، جس کے باپ کا نام فلیپ ہو، تاریخ میں ایسے بیسیوں

---

[1] توراۃ سفر العدد ۲۶-۵۹ [2] انسا ئیکلو پیڈیا برٹانیکا آرٹیکل میری۔

خاندانوں کا ہم پتہ دے سکتے ہیں، جو گذشتہ تاریخی اور مذہبی اکابر کے نام تبرکاً استعمال کرتے ہیں،

اسلام پر آج جتنے اعتراضات کیے جاتے ہیں، عجیب بات یہ ہے، کہ گو الفاظ کسی قدر بدل جائیں، تعبیر اور طرزِ ادا میں کتنا ہی فرق آجائے، لیکن مفہوم اور مغزِ سخن کے لحاظ سے وہ وہی ہیں، جو تیرہ صدی پہلے خود انہی برادرانِ ملت کی زبانی بارہا دہرایا جا چکا ہے، چھٹی صدی مسیحی میں نجران جو یمن کا ایک ضلع ہے خالص عیسائی آبادی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہؓ بن شعبہ کو وہاں دعوتِ اسلام کے لیے بھیجا تھا، وہ بیان کرتے ہیں،

بعثنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی نجران فقالوا لی الستم تقرؤن یا اخت ھارون وقد کان بین موسیٰ و عیسیٰ ما کان فلم ادر ما اجیبھم فرجعت الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرتہ فقال الا اخبرتھم انھم کانوا یسمون با نبیائھم و الصالحین قبلھم۔[1]	مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران بھیجا، ان لوگوں نے کہا کہ تم لوگ یہ آیت نہیں پڑھتے، کہ "اے ہارون کی بہن" اور حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے درمیان کتنا زمانہ حائل ہے، میں نہ سمجھ سکا کہ اُن کو کیا جواب دوں، جب لوٹ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ان کا اعتراض عرض کیا، فرمایا تم نے یہ نہیں کہا کہ یہ لوگ اپنے پیغمبروں اور گذشتہ بزرگوں کے نام پر

[1] صحیح ترمذی تفسیر سورۂ مریم۔

نام رکھا کرتے تھے،

اور آج بھی ہم یہی جواب دیتے ہیں' اور یہی کافی ہے'

مزید تفصیل کے لیے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں، کہ قرآن اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہے، اس نے ہر جگہ حضرت عیسیٰؑ کا نام حضرت موسیٰؑ کے بعد اور انجیل کا ذکر توراۃ کے بعد کیا ہے، سورۂ مائدہ کے پانچویں رکوع میں بہ تصریح اس نے بتایا ہے، کہ حضرت موسیٰؑ کے ایک مدت کے بعد حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے، ثم قفینا علی آثارھم بعیسی بن مریم' اسی قسم کی تصریح سورۂ صف سے بھی جاتی ہے،

اس عام بحث و نزاع کے بعد' اب ہم اعتراض کے الگ الگ ٹکڑوں پر گفتگو کرتے ہیں،

مریم بنت عمران | قرآن مجید نے سورۂ مریم اور سورۂ تحریم' دو مقام پر حضرت مریمؑ کے باپ کا نام عمران بتایا ہے' یہ واقعہ ہے' اس واقعہ کے خلاف تمام عالم امکان میں کیا شہادت موجود ہے، کیا دنیا کی عظیم الشان لائبریریوں' وسیع کتب خانوں' غیر محدود کتابوں اور لا متناہی اوراق کا ایک حرف بھی اس کی تردید کے لیے پیدا ہے، سعدیؒ کا دعویٰ جھوٹا نہیں،

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست کتب خانۂ چند ملت بہ شست

اناجیل' اعمال' خطوط' عیسائیت کے بے پایاں دفتر کے یہی تین اصول ہیں'

لیکن ان میں یہ کہیں مذکور ہے، کہ مریم کے باپ کا نام کیا تھا، بلکہ ہم اور آگے بڑھتے ہیں، کیا ان میں یہ بھی مذکور ہے، کہ ان کا باپ کون تھا، ہمارے چیلنج کا ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے، کیا ان میں یہ بھی مذکور ہے، کہ ان کا کوئی باپ بھی تھا، اور حق بھی یہ ہے کہ "خداوند کی ماں" کا کوئی باپ نہ ہو،

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مصنفین لکھتے ہیں:

"پہلی صدی مسیحی کی کسی تاریخی یادداشت میں ان کے والدین کے متعلق کچھ مذکور نہیں ہے"

ان حالات کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ لوگ اپنی اولاد کا نام عموماً والدین کے نام سے کسی تناسب کی بنا پر رکھتے ہیں، تو اگر بیٹی کا نام مریم تھا، تو قرینہ دلالت کرتا ہے، کہ گذشتہ مقدس مریم کے باپ عمران کی مناسبت سے ان مریم کے باپ کا نام بھی عمران ہو، اور عجب نہیں کہ اسی تاریخی تناسب کی بنا پر حضرت مریمؑ کے باپ عمران نے اپنی بیٹی کا نام مریم رکھا ہو،

اختِ ہارون گذشتہ ثبوت نام کی طرح، اس نام کے متعلق بھی ہماری تحدی اور چیلنج کا صور اسی زور اور شدت کے ساتھ بلند ہے، اگر قرآن میں اس موقع پر "اخت" سے واقعاً بہن مراد ہے، تو تمام انجیل میں اس کے خلاف ایک حرف بھی موجود نہیں ہے، لیکن اصل یہ ہے، کہ "یہاں "اخت" سے بہن کا رشتہ مراد نہیں ہے" چنانچہ آل عمران میں حضرت مریمؑ کی جو دعا مذکور ہے کہ "خداوند میرے شکم میں

جو اولاد ہے، اس کو تیری خدمت کے لیے نذر کرتی ہوں، جب وضع حمل ہوا تو لڑکی (مریم) پیدا ہوئی، بولیں کہ خداوند لڑکی پیدا ہوئی، اور لڑکی لڑکے کے برابر نہیں"
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے کوئی بھائی نہ تھا، ورنہ وہی قربان گاہ پر نذر کیا جاتا، اصل یہ ہے کہ "اخت ہارون" کی حقیقت سمجھنے میں لوگوں نے غلطیاں کی ہیں، استعمالِ عرب کے مطابق "ہارون" سے مراد خاندان و قبیلہ ہارون ہے، بکر، سعد، وائل، اسد، نزار سے مقصود اشخاص نہیں، قبائل وخاندان ہیں، قبائل کی طرف عموماً اہلِ عرب جب "اخ" یا "اخت" کا لفظ مضاف کرتے ہیں تو اس سے مقصود اس قبیلہ کا ایک فرد ہوتا ہے، یا اخا قریش جب عرب بولے گا تو شخص قریش کا بھائی مراد نہ ہوگا، بلکہ قبیلۂ قریش کے ایک ممبر کو خطاب سمجھا جائے گا، حدیث میں ہے" ابن اخت القوم منہم قبیلہ کی بہن کے بیٹے کا شمار اسی قبیلہ میں ہوگا" وہ کون طرفۃ العجائب عورت ہوگی جو کل قبیلہ کے قبیلہ کی بہن ہو، اس سے مقصود قبیلہ کی ایک عورت ہے اور بس! یہ استعمال عرب میں اس قدر شائع و ذائع ہے، کہ ذی روح سے نکل کر غیر ذی روح تک کے لیے استعمال ہوتا ہے، مثلاً اخا العلم اخا الجہل وغیرہ،

لوقا کی انجیل (۱-۳۶) میں ہے کہ الزبتھ حضرت یحییٰؑ کی ماں اور حضرت مریمؑ رشتہ دار تھیں، (۵) میں ہے کہ وہ ہارون کی بیٹی تھیں، اس سے واضح ہوگا، کہ حضرت مریمؑ بھی خاندان ہارون سے تھیں، دیکھو انجیل کی اس اصطلاح میں بھی بیٹی سے حقیقی بیٹی مراد نہیں، ورنہ کہا جا سکتا ہے کہ انجیل مریمؑ اور حضرت ہارونؑ کو ہم عہد قرار دیتی ہے (معارف اگست، ستمبر ۱۹۱۶ء)

اساطیر الاوّلین

یورپ جس طرح علم کا مخزن ہے، وہ جہل کا بھی مرکز ہے، جس ذرہ سے اس کو اپنے ادعا میں کچھ بھی فائدہ کی توقع ہوتی ہے، اس کو وہ پتھر کی چٹان نظر آتا ہے اور جس پتھر کی چٹان سے اس کے شیشۂ ادعا کو ذرہ بھی ٹھیس لگنے کا خطرہ ہوتا ہے وہ اس کو ذرہ سے بھی کم نظر آتا ہے، اس کے نزدیک صحتِ واقعہ کا معیار دلائل کا ضعف و قوت نہیں ہے، بلکہ یہ ہے، کہ اس واقعہ کی تسلیم و انکار سے اس پر یا اس کے حریف پر کیا فوائد اور نقصانات مترتب ہوں گے۔

سر ولیم میور کو ینابیع القرآن (سورسز آف قرآن) کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے اس ثبوت سے ایک خوشی محسوس ہوتی ہے، کہ "قرآن مختلف ادیان و مذاہب کے خیالات و اعتقادات کا مجموعہ ہے" لیکن اس واقعہ کو اگر ہم یوں دہراتے ہیں، کہ اوقاتِ مختلفہ میں دنیا کے ہر گوشہ میں خدا کا ایک منادی اور داعی آیا و ان من امۃ الا خلا فیہا نذیر، اور قرآن ان تمام منادیوں اور دعوتوں کا مجموعہ ہے۔ وانہ لفی زبر الاولین۔ تو ہم دفعۃً دیکھتے ہیں کہ یورپین نصرانی کا سُرخ و سفید چہرہ زرد پڑ جاتا ہے کہ کہیں اس چٹان سے اس کے نازک شیشۂ اعتقاد کو

ٹھیس نہ لگ جائے،

مشہور مؤرخ گبن نے ایک موقع پر لکھا تھا:

"محمدؐ کا مذہب شک و شبہ سے پاک ہے، اور قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک شاندار شہادت ہے، پیغمبر نے بتوں کی، آدمیوں کی، ستاروں کی، اور سیاروں کی پرستش اس دلیل سے رد کر دی، کہ جو طلوع ہوگا، وہ غروب ہوگا، اور جو پیدا ہوگا وہ مرے گا، اور جو حادث ہوگا، وہ فانی ہوگا، ..... عقل کے اصولِ اول یعنی توحید کی تائید میں محمدؐ کی آواز بلند ہوئی، اور اس کے پیرو مراکش سے ہندوستان تک موحدین کے لقب سے ممتاز ہیں اور بت پرستی کا خوف اب محمدؐ کے پیروؤں سے بالکل دور ہے"۔[۵] (خلاصہ)

ہمارے ایک نصرانی دوست اولیفنٹ سمیٹن ایم، اے (———— ————) جنھوں نے تاریخِ زوالِ روم کی تصحیح و تحشیہ کی تکلیف اٹھائی ہے، حقیقت و صداقت کے اس چٹان کو دیکھ کر کانپ اٹھے، اور چاہا کہ اس اساسِ محکم اور بنیادِ غیر متزلزل کو آلاتِ جہل و افترا سے منہدم کر دیں، وانّٰی لهم التناوش من مكان بعيد۔

ہمارا یورپین نصرانی محقق گبن کے ان منصفانہ الفاظ سے بے تاب ہو کر اس موقع پر حسب ذیل حاشیہ لکھتا ہے:

---

۵ تاریخ زوال روم، ج ۵ ص ۲۳۶

گبن کا بیان محمد (صلعم) کے نظام مذہب اور اس کی جدت کی نسبت نہایت مہربانہ ہے، حالانکہ محمد (صلعم) نے تو سادگی سے ایک نظام میں ان امور کو جمع کر دیا، جو اس کے چاروں طرف دماغوں میں پھیلے ہوئے تھے، قریش خود محمد (صلعم) کو الزام دیتے تھے، کہ ان کی تمام تعلیمات ایک کتاب سے ماخوذ ہیں، جس کا نام "اساطیر الاولین" ہے، جس کا چند مقامات میں قرآن میں بھی ذکر آیا ہے، اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حشر و نشر کے واقعات پر مشتمل ہے"

اس غریب نصرانی کو کیا معلوم کہ اس کے قلم سے جو حرف نکل رہا ہے، وہ جہل و نامعلومی کا ایک دفتر ہے،

قرآن میں بے شک لفظ "اساطیر الاولین" متعدد مقامات پر آیا ہے، لیکن تم کو کس نے بتایا کہ یہ ایک کتاب کا نام ہے؟ اگر یہ استدلال صحیح ہے، کہ قرآن میں کسی لفظ کا متعدد بار استعمال اس بات کی دلیل ہے، کہ وہ کسی قدیم کتاب کا نام ہے، تو خود لفظ اسلام، رسول اللہ، اور صلوٰۃ کو کسی قدیم کتاب کا نام کیوں نہیں قرار دیتے، کہ لفظ اساطیر سے زیادہ تو یہ الفاظ قرآن میں بار بار آئے ہیں،

اساطیر الاولین کی لفظی تشریح "اساطیر الاولین" دو لفظوں سے مرکب ہے، اساطیر اور اولین،

اساطیر اسطور کی جمع ہے، جس کے معنی داستان اور قصہ کے ہیں، "اولین" اول کی جمع ہے، جس کے معنی گذشتہ پہلے اور اگلے کے ہیں، دونوں لفظوں کے

مرکب معنی ہیں، اگلوں کے قصے، پہلوں کی کہانیاں، گذشتہ اقوام و اشخاص کی داستانیں،

قال الراغب اسطر الاولون فی الکتاب من القصص و الاحادیث قال الجوھری الاساطیر الاباطیل الترھات قال السدی اساجیع اولین، قال ابن عباس احادیث الاولین وقال قتادہ کذب الاولین و باطلہم

امام راغب اصفہانی اساطیر کے معنے لکھتے ہیں۔ پہلوں نے کتابوں میں جو قصے کہانیاں لکھیں، امام لغت جوہری کہتا ہے اساطیر کے معنی "بیہودہ اور خرافات باتیں" سدی کہتا ہے کہ اس کے معنی "اگلوں کے قوافی" ہیں، ابن عباسؓ فرماتے ہیں اگلوں کی باتیں اور قتادہؒ کہتے ہیں کہ "اگلوں کے جھوٹ اور کذب" اس کے معنی ہیں۔

اور تعجب ہے کہ اسطور جو اساطیر کا واحد ہے کوئی ایسا لفظ نہیں، جس سے ایک یورپین محقق ناآشنا ہو، کیا اس نے اسی لفظ کو انہی معانی کے ساتھ لاطینی اور جرمن میں ہسٹوری (History انگریزی میں ہسٹری اور سٹوری Story) کی صورت میں نہیں پڑھا ہے، اور اگر پڑھا ہے اور یقیناً پڑھا ہے، تو کیا تعصب و عداوت ہے کہ قرآن کے اس لفظ کو اس معنی میں نہیں لیتے۔

اساطیر الاولین کی معنوی تشریح انسان کی فطرت یہ ہے کہ واقعاتِ ماضیہ کی تاریخ، اقوامِ فانیہ کی سرگذشت اور اشخاصِ گذشتہ کی داستانِ زندگی سے نہایت

دلچسپی لیتا ہے اور اس سے عبرت و نصیحت حاصل کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ دنیا میں جس کثرت سے تاریخ اقوام اور سرگذشت اشخاص کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں، کسی دوسرے علم و فن کی کتابیں نہیں پڑھی جاتی ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں بغرض اعتبار و استبصار نہایت کثرت سے اقوام ماضیہ کے اخبار تاریخی، اشخاص گذشتہ کے واقعات زندگی اور ممالک فانیہ کے حالات بقاء و فنا بیان ہوئے ہیں، کفار و ملحدین جو چشم بصیرت اور گوش اعتبار سے محروم تھے، کہتے تھے کہ قرآن میں قصص پارینہ اور افسانہائے کہنہ کے سوا اور کیا دھرا ہے؟ قیامت، معاد، اور حالات ماورائے مادہ کو بعید از عقل سمجھ کر ان کو "داستان کہن" کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ بہ ترتیب قرآن سب سے پہلی آیت جس میں "اساطیر الاولین" کا لفظ ہے، سورۂ انعام کی آیت ہے، جس کی شان نزول میں مذکور ہے،

قال ابن عباس حضر عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان والولید بن المغیرہ والنضر ابن الحارث وعقبہ وعتبہ وشیبہ ابناء ربیعۃ وامیہ وابی ابنا خلف والحارث بن عامر فاستمعوا	ابن عباسؓ فرماتے ہیں، (شدید ترین کفار مکہ) ابوسفیان، ولید، نضر، عقبہ، عتبہ، شیبہ، امیہ، ابی اور حارث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپؐ کا کلام سنا، لوگوں نے نضر سے پوچھا، کہ محمدؐ کیا کہتا ہے، اس نے جواب دیا، کہ یہ تو میں

الی حدیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا للنضر ما یقول محمد فقال لا ادری ما یقول لکنی اراہ یحرک شفتیہ ویتکلم باساطیر الاولین کالذی کنت احدثکم بہ عن اخبار القرون الاولی قال ابوسفیان انی لا اری بعض ما یقول حقا فقال ابوجہل کلا۔ فانزل اللہ تعالٰی تلک الآیہ۔	نہیں جانتا، کہ وہ کیا کہتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ لب ہلاتا ہے، اور اگلوں کے قصے کہتا ہے، جس طرح میں تم کو گزشتوں کے قصے بیان کیا کرتا تھا، ابوسفیان نے کہا کہ محمدؐ جو کہتا ہے اس میں سے بعض باتیں تو سچی معلوم ہوتی ہیں، ابوجہل نے کہا ہرگز نہیں"۔ اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی،

خود ان آیات پر غور کرنا چاہیے جن میں یہ الفاظ آئے ہیں،

اساطیر الاولین کے مواقع قرآن مجید میں یہ لفظ نو جگہ آیا ہے، لیکن ہر جگہ ان معانی کے سوا جو ہم نے بیان کیے ہیں، کوئی اور معنی نہیں بن سکتے، چہ جائیکہ کسی کتاب کے نام کی طرف اشارہ ہو، ہم ان تمام آیتوں کو نقل کرتے ہیں،

(۱) یقول الذین کفروا ان ھذا الا اساطیر الاولین۔	(۱) کافر کہتے ہیں، کہ یہ (قرآن) تو صرف اگلوں کی کہانی ہے،
(۲) واذا تتلی علیھم ایاتنا قالوا	(۲) جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی

قد سمعنا لو نشاء لقلنا مثل هذا ان هذا الا اساطير الاولين۔

جاتی ہیں، تو کہتے ہیں، ہم سُن چکے، اگر ہم چاہتے تو ہم بھی ایسا کہہ سکتے، یہ تو صرف اگلوں کی کہانی ہے،

(۳) واذا قيل لهم ماذا انزل ربكم قالوا اساطير الاولين۔

(۳) ان منافقین سے جب پوچھا جاتا ہے، کہ تمہارے خدا نے کیا نازل کیا تو کہتے ہیں، وہی اگلوں کی کہانیاں،

(۴) قالوا اذا متنا وكنا ترابا وعظاما انا لمبعوثون لقد وعدنا نحن واباءنا هذا من قبل ان هذا الا اساطير الاولين۔

(۴) حیرت سے کہتے ہیں، کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مرکر صرف مٹی اور ہڈی رہ جائیں گے، تو کیا ہم پھر اُٹھائے جائیں گے، یہ تو ہم سے اور اس سے پہلے ہمارے بزرگوں سے بھی کہا گیا تھا، یہ کچھ نہیں، یہ خیالات تو صرف پُرانے لوگوں کی قصہ کہانی کی باتیں ہیں،

(۵) قال الذين كفروا ان هذا الا افك افتراه واعانه عليه قوم آخرون وقالوا اساطير الاولين اكتتبها فهي تملى عليه بكرة واصيلا۔ (فرقان ۔ ۱)

(۵) کافر کہتے ہیں، کہ یہ قرآن اختراع ہے، خدا کی طرف سے نہیں، محمدؐ نے خود گڑھا ہے، اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کو مدد دی ہے، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں، کہ یہ تو پہلوں کی کہانی ہے، جس کو محمدؐ نے لکھا لیا ہے، اور صبح و شام اس کو

پڑھ کر سنایا جاتا ہے،

(۶) وقال الذین کفروا ءاذا کنا ترابا وءاباؤنا ائنا لمخرجون لقد وعدنا ھذا نحن وءاباؤنا من قبل ان ھذا الا اساطیر الاولین۔

(۶) کافر کہتے ہیں، کہ کیا جب ہم اور ہمارے اسلاف مٹی ہو جائیں گے، ہم پھر قبر سے نکالے جائیں گے؟ یہ تو ہم سے اور ہم سے پہلوں سے بھی وعدے کیے گئے تھے کچھ نہیں یہ تو صرف اگلوں کی کہانی ہے،

(۷) والذی قال لوالدیه اف لکما اتعداننی ان اخرج وقد خلت القرون من قبلی وھما یستغیثان اللہ ویلک اٰمن ان وعد اللہ حق فیقول ما ھذا الا اساطیر الاولین اولئک الذین حق علیھم القول

(احقاف - ۲)

(۷) جس کافر بیٹے نے اپنے مسلمان ماں باپ کو جھڑک کر کہا کیا تم دونوں اس کا مجھ سے وعدہ کرتے ہو، کہ قبر سے اٹھایا جاؤں گا، مجھ سے پہلے کتنی قومیں گذر گئیں (اور ان کا نشان بھی نہیں) اس کے ماں باپ نے اس کو خدا کا واسطہ دے کر کہا کہ اے بدبخت ایمان لا! خدا کا وعدہ سچا ہے، بیٹا کہتا ہے کہ یہ صرف پرانے لوگوں کی کہانی ہے، یہی وہ لوگ ہیں، جن پر خدا کا عذاب واجب ہو چکا۔

(۸) ولا تطع کل حلاف مھین ھماز مشاء بنمیم، مناع للخیر معتد اثیم عتل

(۸) تو ان کی اطاعت نہ کر جو ذلیل ہیں، اور قسمیں بہت کھایا کرتے ہیں، جو عیب جو

بعد ذالک زنیم، ان کان ذا مال وبنین اذا تتلی علیه ایاتنا قال اساطیر الاولین۔	اور غماز ہیں، جو اس لیے کہ صاحب فرزند و مال ہیں نیکی سے لوگوں کو روکتے ہیں، جو حد سے متجاوز ہیں، جو گنہگار ہیں، اور جو بدنہاد و بداصل ہیں، ان کو جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو (بے پروائی سے) کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کی کہانیاں ہیں،
(ن - ۱)	
(۹) وما یکذب به الا کل معتد اثیم اذا تتلی علیه ایاتنا قال اساطیر الاولین۔	(۹) قرآن کی تکذیب وہی کرتے ہیں، جو ظالم اور گنہ گار ہیں، ان کو جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو کہتے ہیں، کہ اگلوں کی کہانیاں ہیں۔

خلاصہ | قرآن مجید کی ان آیاتِ کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ اساطیر کسی کتاب دینی کا نام نہیں ہے، جس سے قرآن ماخوذ ہو، بلکہ کفار کا اس سے مقصود کہیں تو یہ ہے کہ اس میں قصے اور کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں، اور کہیں یہ مقصود ہے کہ قیامت، معاد اور حیات مابعد الموت کچھ معقول بات نہیں، صرف اگلوں کی بیہودہ کہانی ہے، جس پر پرانے لوگ اپنی بیوقوفی سے یقین رکھتے تھے۔

بدقسمتی دیکھو کہ یہ بعینہٖ وہی اعتقاد فاسد ہے، جو کبھی کفار کا تھا، اور آج ان مسلمان متفرنجین کا ہے، جو قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتے۔ جو خدا کے

ظہور و جلال کے منکر ہیں، جو اعمال کے مواخذہ سے بے پروا ہیں، مرنے والو! کیا موت تمہیں کبھی نہ آئے گی، ہاں! ایک بار آئے گی، جس کے بعد تم کو زندہ چھوڑ کر کبھی نہ آئے گی،

قد خسر الذین کذبوا بلقآء اللہ	جو قیامت کے منکر ہیں، وہ یقیناً نقصان
حتیٰ اذا جآءتھم الساعۃ بغتۃ	اٹھائیں گے، جب ناگہاں وہ گھڑی آجائیگی
قالوا یاحسرتنا علیٰ ما فرطنا فیھا وھم	تو حسرت سے کہیں گے اس گھڑی کی نسبت
یحملون اوزارھم علیٰ ظھورھم الا	ہماری سست اعتقادی پر افسوس (خاموش!
سآء ما یزرون وما الحیٰوۃ الدنیا	کہ اب افسوس وحسرت کا وقت نہیں) آج
الا لعب ولھو وللدار الاٰخرۃ	ان کی پشت گناہ کے بوجھ سے گراں ہے، کیا
خیر للذین یتقون افلا تعقلون۔	برا بوجھ ہے، مغرورو! تم جس دنیا کی زندگی پر
(انعام - ۹)	مغرور ہو، اس میں لہو ولعب کے سوا اور کیا
	دھرا ہے، دار آخرت نیک لوگوں کے لیے
	بہترین محل اقامت ہے، نادانو! کیا نہیں سمجھ
	سکتے؟

(الہلال کلکتہ، ۱۵ اپریل ۱۹۱۴ء)

تذکار نزول القرآن

اُسوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

شھر رمضان الذی انزل
فیہ القرآن

یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ (بقرہ)

مسلمانو! تم پر روزے اسی طرح لکھے گئے، جس طرح تم سے پہلی امتوں اور قوموں پر اس سے پہلے لکھے گئے تھے، تاکہ تقویٰ تم میں پیدا ہو۔

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینات من الھدی والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ ومن کان مریضاً او علی سفر فعدۃ من ایام اخر یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر

ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اترا، جو لوگوں کے لیے سرتاپا ہدایت ہے، جو ہدایت وتمیز حق و باطل کی نشانی ہے، پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود رہے، وہ روزہ رکھے، اور جو مریض یا مسافر ہو، وہ ان کے بدلے دوسرے دنوں میں پھر روزے رکھ لے۔ خدا آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا،

ولتکملوا العدۃ ولتکبروا اللہ	تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو، اور
علی ماھداکم ولعلکم تشکرون۔	روزے اس لیے فرض ہوئے کہ تم اس عطائے
(بقرہ ۲۳)	ہدایت پر خدا کی بڑائی کرو اور شکر بجا لاؤ۔

مکّہ سے تین میل کی مسافت پر کوہ حرا واقع ہے، آج سے ۱۳۴۴ برس پہلے ماہ رمضان میں جب سخت گرمی کے دن تھے[1] اور شدتِ حرارت سے ریگستانِ بطحاء کا ذرہ ذرہ تنور بن رہا تھا، اسی کوہ حرا کے ایک تیرہ و تاریک غار میں مادیاتِ عالم سے ایک کنارہ کش انسان سر بزانو تھا،

وہ بھوکا تھا، لیکن بھوکا نہ تھا، کہ اس کے پاس کھانے کی وہ چیز تھی، جس کو کھا کر پھر انسان کبھی بھوکا نہیں ہوتا، وہ پیاسا تھا، لیکن پیاسا نہ تھا، کہ اس کے پاس پینے کی وہ چیز تھی، جس کو پی کر، پھر انسان کبھی پیاسا نہیں ہوتا، وہ تین تین، چار چار دن کھانا پینا چھوڑ دیتا تھا[2]، اس کے جان نثار بھی اس کی محبت میں کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے، لیکن وہ ان کو منع کرتا تھا، کہ

ایکم مثلی ابیت یطعمنی ربی	تم میں کون میری طرح ہے، میں بھوکا ہوتا

---

(۱) رمضان کے معنی شدتِ حرارت کے ہیں، اس سے اور دیگر اسمائے مشہورہ کے قرینے سے مستنبط ہوتا ہے، کہ عرب میں قبل اسلام ناقص طور سے شمسی مہینے جاری تھے، اس لیے رمضان گرمی کا مہینہ ہوگا، (۲) صوم وصال،

ویسقینی۔	ہوں، تو میرا آقا مجھ کو کھلاتا ہے، میں پیاسا
(رواہ البخاری ومسلم فی صحیحہا)	ہوتا ہوں تو میرا آقا مجھکو پلاتا ہے،

کوہِ حرا کا مقدس عزلت نشین اسی طرح بھوکا پیاسا سربزانو تھا کہ ایک نور[1] بے کیف نے تیرہ و تار غار کو روشن کر دیا، وہ نورِ بے کیف کیا تھا، ہدایت و فرقان کا ایک آفتاب تھا، جو مطلعِ خطیرۃ القدس سے طلوع ہو کر اس کے سینہ میں غروب ہو گیا، فانہ نزلہ علی قلبک۔ (بقرہ) اور پھر اس کے سینہ سے نکل کر تمام عالم کو اس کی شعاعوں نے روشن کر دیا، وما ارسلناک الا رحمۃ للعلمین (بقرہ)

صیام رمضان | وہ آفتاب جس کا مطلع خطیرۃ القدس تھا، وہ آفتاب جس کا مغرب سینۂ نبویؐ تھا، وہ آفتاب جس نے عالم کو منور کیا، قرآن مجید تھا، جو ماہِ مقدس کی شبِ مبارک میں آسمان سے زمین پر نازل ہونا شروع ہوا، وہ کون سا ماہ مقدس تھا، جس میں خدا کا کلام بندوں کو پہنچنا شروع ہوا؟ وہ ماہ رمضان تھا،[2]

شھر رمضان الذی انزل فیہ	رمضان کا مہینہ وہ ہے، جس میں قرآن اترا،
القرآن ھدی للناس وبینات	جو لوگوں کے لیے سرتاپا ہدایت ہے، جو ہدایت
من الھدی والفرقان۔	وتمیز حق و باطل کی نشانی ہے،

پس ان ایام میں ہماری بھوک، ہماری پیاس، ہمارا مادیاتِ عالم سے اجتناب

---

[1] وحی قرآن۔ [2] نزول قرآن کی ابتدا رمضان میں ہوئی، کما سیاتی،

اس یادگار میں ہے کہ ہم تک جو خدا کا پیغام لایا، وہ ان دنوں بھوکا اور پیاسا تھا، اور وہ تمام لذاتِ مادی سے مجتنب تھا،[1]

فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ۔ پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود ہو، وہ روزے رکھے۔

(بقرہ ۲)

یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم۔ مسلمانو! تم پر روزہ اسی طرح لکھا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا تھا،

پس رمضان کی حقیقت کیا ہے، وہ ماہِ مقدس جس میں داعیٔ اسلام حسبِ

---

[1] یہ اس کا حال تھا، جو کوہ فاران (کوہ حرا) کی چوٹی سے جلوہ گر ہوا تھا۔ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) لیکن وہ جو سینا سے آیا (موسیٰ علیہ السلام) وہ بھی تورات لینے کے لیے جب پہاڑ پر چڑھا تھا، وہاں چالیس روز بدلی کے درمیان خداوند کے حضور رہا تھا (خروج ۳۰ - ۱۸) اسی طرح وہ بھی جو کوہ سعیر (کوہ زیتون) سے طلوع ہوا تھا، (مسیح علیہ السلام) اس سے پہلے کہ وہ خدا کی منادی شروع کرے، جنگل میں چالیس روز دن رات بھوکا اور پیاسا رہا تھا، (متی ۴ - ۲) پس ضرور تھا کہ وہ جو کوہ فاران سے جلوہ گر ہونے والا تھا، وہ بھی اس سے پہلے کے دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ وہ آئے، اور اس کے داہنے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہو، وہ خداوند کے حضور بھوکا اور پیاسا رہے، تاکہ جو لکھا گیا ہے، وہ پورا ہو:

※ ※ ※

اتباعِ نوامیسِ نبوت، تحمل نزولِ قرآن کے لیے عالم کی مادی ضرورتوں سے مستغنی رہا، اور اس لیے ضروری ہوا، کہ پیروانِ ملتِ اسلامیہ اور متبعین طریقتِ محمدیہ ان ایام میں ضروریاتِ مادیۂ عالم سے مستغنی رہیں، کہ اس توفیق و ہدایت کا شکریہ و ممنونیت اور اظہارِ اطاعت و عبودیت ہو جو ان کو اس ماہ مقدس میں عطا ہوئی،

شھر رمضان الذی انزل فیہ القراٰن، ھدی للناس وبینات من الھدیٰ والفرقان، فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ و من کان مریضاً او علیٰ سفر فعدۃ من ایام اُخر، یرید اللّٰہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ولتکملوا العدۃ ولتکبروا اللّٰہ علیٰ ما ھداکم ولعلکم تشکرون۔ (بقرہ)	ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اترا، جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے، جو ہدایت و تمیز حق و باطل کی نشانی ہے، پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود ہو وہ روزے رکھے، جو بیمار یا مسافر ہو، وہ اُن کے بدلے اور دنوں میں روزے رکھ لے، خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو، اور روزے کیوں فرض ہوئے؟ اس لیے کہ تم خدا کی ہدایت پر اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو،

ان آیات میں صاف بتا دیا گیا، کہ مفروضیتِ صیامِ رمضان صرف اس لیے ہے کہ ہم اس عطائے ناموس فرقان و ھدیٰ (قرآن) پر خدا کا شکر بجالائیں، اور اس کے نام کی تقدیس کریں، پس کون مسلم ہے جو خدا کے اس احسانِ اکبر اور نعمتِ عظمیٰ کے شکر

کے لیے تیار، اور اس کی تقدیس کے لیے آمادہ نہیں؟ اس کی تقدیس و تمجید میں خود کو فراموش کردو، اس کے کلام کی عظمت کو یاد کرو، جس نے تم جیسی زار و نزار کمزور قوم کو اپنی تسلی سے قوی کیا، جو پھر کبھی کمزور نہ ہوگی، جس نے ۱۳۴۴ برس ہوئے کہ توحید کی آگ تمہارے سینوں میں روشن کی، جو پھر کبھی نہیں بجھیگی، جس نے تمہارے سر پر تاجِ خیر الامم رکھا، جو کبھی نہیں اتر سکتا۔

شبِ قدر | وہ کون سی شب مبارک تھی، جس میں خدا کا کلام روح پرور ایک انسان کے منہ میں ڈالا گیا، وہ لیلۃ القدر یعنی عزت و حرمت کی رات تھی، بیشک وہ عزت و حرمت کی رات تھی، وہ رات تھی جو ہزار مہینہ سے بہتر تھی، کہ اس میں خداوند گویا ہوا، وہ فرشتوں کی آمد کی رات تھی، کہ آسمان کی باتیں زمین والوں کو سنائیں، وہ امن و سلامتی کی رات تھی، کہ اس میں دنیا کے لیے امن و سلامتی کا پیغام اترا۔

انا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر، وما ادرٰک ما لیلۃ القدر، لیلۃ القدر خیر من الف شھر، تنزل الملٰئکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر، سلام ھی حتی مطلع الفجر۔ (القدر)	ہم نے قرآن کو عزت و حرمت والی رات میں نازل کیا، اور ہاں تمہیں کس نے بتایا کہ عزت و حرمت والی رات کیا ہے؟ وہ رات جو ہزار مہینہ سے بہتر ہے، جس میں ارواحِ مقدسہ اور فرشتے حکم خدا سے احکام لے کر نازل ہوتے ہیں، اس رات میں طلوع صبح تک سلامتی ہے،

وہ شب کیا عجیب شب تھی، دنیا عصیان و ناحق شناسی کی تاریکی میں مبتلا

تھی، دیو یا طلسم کا تمام عالم پر استیلا تھا، توحید کا چہرۂ نورانی، کفر و شرک کی ظلمت میں محجوب تھا، نیکیاں بدیوں سے شکست کھا چکی تھیں، دنیا کی تمام متمدن اور زبردست قومیں قوتِ الٰہی سے بغاوت کا اعلان کر چکی تھیں، ایک نحیف و ضعیف قوم بحر احمر کے کنارے کے ریگستانوں پر، غفلت و جہالت کے بستروں پر پڑی سو رہی تھی، لیکن اس ظلمت کدۂ عالم میں صرف ایک گوشہ تھا، جو روشن تھا، وہ گوشہ غار حرا، کا گوشہ تھا، اس بغاوت و طغیان عالم میں ایک شے تھی، جو قوتِ الٰہی کے آگے اطاعت و تسلیم کے ساتھ سر بسجود تھی، وہ عزلت نشینِ حراؑ کی جبین مبارک تھی، اور ایک ہی قلب تھا جو بیدار تھا، اور وہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم) کا قلبِ اقدس تھا،

یہ کیا عجیب و غریب شب تھی۔ جب کہ قوموں کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا، جب جبابرۂ عالم کی تنبیہ و تادیب کے لیے ایک نحیف و ضعیف قوم کا انتخاب ہو رہا تھا، جب نیکیوں کا لشکر دوبارہ مقابلہ کے لیے آراستہ کیا جا رہا تھا، اور اُس کی سرعسکری کے لیے وہ وجودِ اقدس منتخب ہو رہا تھا، جو حرا، کے غیر مصنوع حجرہ میں بیدار اور سر بسجود تھا، اور رحمت کے محافظ فرشتے اس کے گرد صف بستہ تھے،

انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ انا کنا منذرین فیھا یفرق کل	ہم نے اس کتاب مبین کو ایک مبارک شب میں اتارا کہ ہمیں انسانوں کو ڈرانا تھا، وہ

امراً حکیم، امراً من عندنا اناکنا مرسلین، رحمۃ من ربك انہ هوالسمیع العلیم۔	مبارک شب جس میں ہر راز حکمت امور کا ہمارے حکم سے فیصلہ کیا جاتا ہے، انسانوں کے پاس اپنی رحمت سے ایک رہنما بھیجنا تھا کیونکہ ہم پکارنے والوں کی دعائیں سنتے ہیں، اور دُنیا کے ذرہ ذرہ کا حال جانتے ہیں،

پس یہ وہ شب ہے، جس میں اقوامِ عالم کی قسمتوں کا فیصلہ ہو، یہ وہ شب ہے، جس میں برکاتِ ربانی کی ہم پر سب سے پہلی بارش ہوئی، یہ وہ شب ہے جب اس سینہ میں جو خزینۂ نبوت تھا، کلام الٰہی کے اسرار سب سے پہلے منکشف ہوئے، اور آسمانی رحمتوں نے زمین میں نزول کیا، پس ہر مسلم کا فرض ہے، کہ وہ اس لیلۃ مبارکہ میں رحمتوں کا طالب ہو، اور اس رحمان و رحیم ہستی کے آگے سرنیاز خم کرے، جبین پُر معاصی کو زمین پر عجز و خاکساری سے رکھے، اور بصد خضوع و خشوع دستِ تضرع دراز کرے، کہ خدایا۔

اٰمن الرسول بما انزل علیہ من ربہ والمومنون کل اٰمن باللّٰہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ، لانفرق بین احد من رسلہ وقالوا: سمعنا واطعنا غفرانک ربنا	رسول جو کچھ اس پر نازل ہوا، اس پر ایمان لایا، اور اہل ایمان بھی، ایمان لائے، سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اور پکار اٹھے، اے پروردگار! تیری باتیں سنیں،

والیک المصیر لا یکلف اللہ نفساً	تیری اطاعت کا عہد کیا، اب تیری مغفرت
الا وسعہا، لہا ما کسبت وعلیہا	کے طالب ہیں، اور تو ہی ہمارا مرجع ہے،
ما اکتسبت ربنا لا تواخذنا	کسی کو تو اس کی قوت سے زیادہ حکم نہیں
ان نسینا او اخطانا ربنا ولا تحمل	دیتا، اور خیر وشر سب انسان کی کمائی ہے
علینا اصراً کما حملتہ علی الذین	پس اے پروردگار! اگر ہم سے بھول ہو،
من قبلنا ربنا ولا تحملنا ما لا	یا کوئی خطا ہو، تو مواخذہ نہ کر، پروردگار!
طاقۃ لنا بہ واعف عنا	ہم سے پہلوں کی طرح ہم کو گرانبار نہ بنا،
واغفر لنا وارحمنا انت مولانا	پروردگار! ہماری طاقت سے زیادہ
فانصرنا علی القوم الکافرین۔	ہم کو بوجھ نہ دے، ہمیں معاف کر، ہمارے
	گناہ بخش، ہم پیارے ہمارے آقا! رحم فرما،
(بقرہ - ۴۰)	اور کفار پر ہمیں غلبہ نصیب کر،

اعتکاف: مسلمان ان ایام میں مساجد کے گوشوں میں عزلت نشین (معتکف) ہوتے ہیں، کہ غارِ حرار کا گوشہ نشین بھی ان دنوں عزلت نشین تھا، مسلمان ایام اعتکاف میں اس متکلمِ ازلی کے سوا جوان راتوں میں معتکفِ حرار سے گویا ہوا تھا، کسی سے نہیں بولتے کہ ایسا ہی اس نے بھی کیا تھا، جس کے منہ میں اس متکلمِ ازلی نے اپنی بولی ڈالی، جب وہ حرار کے ایک گوشہ میں بسر بزانو معتکف تھا،

پس ہر مسلم آبادی میں چند نفوس مسلم کے لیے ضروری ہے، کہ اواخرِ عشرۂ رمضان

میں مسجد کے ایک گوشہ میں شب و روز محویت اتباع نبوی، تلاوت کتاب عزیز، تفکر خلق سماوات و ارض، ذکر نعم الٰہی، تذکر اسمائے حسنیٰ اور تحیت و تسلیم و ادائے صلوٰت میں اس طرح بسر کریں، کہ ان اوقات محدودہ کا کوئی لمحہ تذکر و تفکر سے خالی نہ ہوتا کہ ان اشخاص مقدسہ کا جلوہ اس کی آنکھوں میں پھر جائے،

الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علی جنوبھم (آل عمران)	جو ہمیشہ اٹھتے بیٹھتے لیٹتے خدا کو یاد کرتے ہیں،
الذین اذا ذکروا بھا خروا سجداً و سبحوا بحمد ربھم وھم لا یستکبرون تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاً و طمعاً (سجدہ)	وہ جو قرآن کی آیتیں جب ان کو یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے ہیں، ان کے پہلو راتوں کو بستر سے الگ رہتے ہیں، اور وہ امید و بیم کے ساتھ خدا سے دعائیں کرتے ہیں،
رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ۔	جن کو خرید و فروخت وغیرہ دنیاوی اشغال ذکر خدا سے غافل نہیں کرتے۔

اسماعیل و ابراہیم (علیہما السلام) کی سب سے پہلی مسجد جن اغراض کے لیے تعمیر ہوئی تھی، اُن میں ایک غرض یہ بھی تھی، کہ وہ عزلت گزینان عبادت گذار کا مسکن ہو،

وعهدنا الی ابراھیم واسماعیل	ہم نے ابراہیم واسماعیل سے عہد لیا، کہ وہ
ان طھرا بیتی للطائفین والعاکفین	میرے گھر کو طواف، اعتکاف، رکوع اور
والرکع السجود ۔ ۔ ۔	سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھیں،

پس اے فرزندانِ اسماعیل وابراہیم، اپنے باپ کے عہد کو یاد کرو، اور جس گھر کو رکوع وسجود کے لیے پاک رکھتے ہو، اسے اعتکاف کے لیے بھی پاک رکھو، کہ تمہارے باپ اسماعیل وابراہیم کا عہد خداوند کے حضور جھوٹا نہ ہو،

قیام رمضان کیا عجیب وہ جوش محویت ہے، جب سلمان دن بھر کی بھوک اور پیاس کے بعد رات کو خدا کی یاد کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، اللہ اللہ! وہ تکلیف جو راحتِ قلبی کا باعث ہو، معتکفِ حرا بھی، اسی طرح خدا کی یاد کے لیے رات بھر کھڑا رہتا تھا، یہاں تک کہ اس کے پانوں میں ورم آجاتا تھا، کہ خدا کی ہدایت کا شکریہ بجا لائے،

پس شب کو جب عالم سنسان ہے، اور دُنیا کا ذرہ ذرہ خاموش اور محوِ خواب شیریں ہے، آؤ شیفتگان سنت محمدیہ! کہ ماہِ مقدس آیا، ہم اپنے بستروں کو خالی کریں، خدا کی تقدیس میں مشغول ہوں اور اس کی حمد وثنا کریں، جس نے اس ظلمتکدہ عالم میں صرف ہم کو ایک ایسا چراغ دیا، جس سے ہمارے قلوب منور ہو گئے۔

سبحان ذی الملک والملکوت	تقدیس ہو حکومت وشہنشاہی والے کی،
سبحان ذی العزۃ والعظمۃ	تقدیس ہو عزت وعظمت، ہیبت
والھیبۃ والقدرۃ والکبریاء	قدرت، کبریائی اور جبروت والے کی،

والجبروت سبحان الملک والحی	تقدیس ہو اس زندہ بادشاہ کی جو
الذی لاینام ولا یموت۔	نہ کبھی سوتا ہے، اور نہ کبھی مرتا،
ابدا ابداً سبوح قدوس	پاک، قدوس، ہمارا آقا، اور تمام
ربنا رب الملائکۃ والروح،	فرشتوں اور روحوں کا آقا،

حقیقتِ صوم

ہم نے مقالۂ سابقہ میں بتایا ہے کہ ماہِ صیام کی اصل حقیقت نزولِ قرآن کی یادگار اور حاملِ قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ اور سنتِ مستحسنہ کی اتباع وتقلید ہے، کہ ان ایام میں آپؐ اسی طرح غار حرا میں قیام فرماتے تھے، اور اسی اثنائے قیام میں وہ نامۂ خیر و برکت اور دستور ہدایت و قرآن ہمیں عنایت ہوا جس سے ہم نے جسم کی زندگی اور روح کی تسلی پائی، پس یہ یوم اکبر یعنی نزولِ قرآن جو لیلۃ القدر ہے، اسلام کی عید اکبر ہے، اور حق ہے کہ تمام بندگانِ اسلام اور شیفتگانِ اسوۂ محمدیہ ان ایامِ مقدسہ میں وہ زندگی بسر کریں، جو قرآن کا مطلوب تھا اور حاملِ قرآن کا نمونہ ہو،

قرآن مجید نے حکم صیام کے موقع پر جیسا کہ آیاتِ سرعنوان مقالۂ سابقہ میں مذکور ہے، ہم کو صوم کے تین نتائج کی اطلاع دی ہے،

لعلکم تتقون — تاکہ تم متقی ہو،

لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم — تاکہ تم اس عطائے ہدایت پر خدا کی تکبیر و تقدیس کرو،

ولعلکم تشکرون — تاکہ تم اس نزول خیر و برکت اور اس عطائے فرقان پر خدا کا شکر بجالاؤ۔

اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ صوم کی حقیقت تین اجزاء سے مرکب ہے، اتقا، تکبیر و تقدیس، اور حمد و شکر، پس جس طرح حقیقت مرکبہ کا وجود عین اجزاء کا وجود ہے، کہ بغیر وجود اجزاء حقیقت معدوم اسی طرح صوم بغیر وجود اجزائے ثلاثہ مذکورہ معدوم و مفقود ہے،

اعمال انسانیہ کا وجود حقیقی ان کے نتائج و آثار کا وجود ہے، اگر نتائج و آثار وجود پذیر نہ ہوئے، تو یہ نہ کہو کہ ان اعمال کا وجود تھا، اگر ہم دوڑتے ہیں، کہ مسافت قطع اور منزل قریب ہو، لیکن ہم بھٹک کر دوسرے راستہ پہ جا پڑتے ہیں، جس سے ہماری مسافت دور تر اور منزل بعید تر ہوتی جاتی ہے، تو ہماری سعی لاحاصل اور ہماری تگاپو عبث ہے، اگر ایک طبیب مریض کے لیے ایک دوا تجویز کرتا ہے، لیکن جس فائدہ کے مترتب ہونے کی امید کرتا ہے، وہ مترتب نہیں ہوتا، تو یہ سمجھنا چاہیے کہ دوا کا استعمال صحیح نہیں کیا گیا۔

پس صیام جو ہمارا علاج روحانی ہے، اگر اس سے شفائے روحانی نہ حاصل ہو، تو حقیقت میں وہ صیام نہیں فاقہ ہے، اور ایسے صائم اور روزہ دار جن کے صوم میں اتقاء، تقدیس، اور شکر کے عناصر ثلثہ نہیں، وہ فاقہ کش ہیں، جن کی بھوک پیاس ایک پھول ہے، جس میں رنگ و بو نہیں، ایک گوہر ہے، جس میں

آب نہیں، ایک آئینہ ہے، جس میں جوہر نہیں، اور ایک جسم ہے جس میں روح نہیں، اور کون نہیں جانتا، کہ ایک گل بے رنگ و بو، ایک گوہر بے آب، ایک آئینہ بے جوہر، ایک جسم بے روح بے حقیقت ہستیاں ہیں، جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جہاں فرمایا ہے۔

رب صائم لیس له من صیامه الا الجوع ورب قائم لیس له من قیامه الا السهر (رواہ ابن ماجہ)

کتنے روزہ دار ہیں، جن کو روزہ سے بجز گرسنگی کچھ حاصل نہیں، اور کتنے تہجد گذار ہیں، جن کی نماز تہجد سے بیداری کے سوا کچھ فائدہ نہیں،

یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے جسم نے روزہ رکھا، لیکن دل نے روزہ نہیں رکھا، ان کی زبان پیاسی تھی، لیکن دل پیاسا نہ تھا، پس رحمت کا کوثر ان کے لیے نہیں کہ پیاسے نہ تھے۔

ہمارے اوقاتِ زندگی کی سب سے بڑی اور طویل تقسیم خود ہماری عمر ہے، اس کے ہر لحظہ میں ایمان باللہ بناجیاز الرسول، ہر دن میں پانچ بار سجدۂ نیاز، ہر ہفتہ میں نماز جمعہ، ہر سال میں صیام رمضان و زکوٰۃ اور ساری عمر میں ایک بار زیارت مسجد خلیل اور ادائے نماز ابراہیمی فرض ہے،

ہمارے سالانہ فرض دو ہیں، ایک جسمانی اور ایک مالی، فریضۂ مالی زکوٰۃ

محدود باوقات مخصوصہ نہیں ہے، لیکن فریضۂ جسمانی محدود بہ اوقات ہے تاکہ پہلے سے خدا کی مسکین مخلوق ہر ساعت اور ہر حالت میں متمتع ہوتی رہے، اور دوسرے وہ تمام یکرنگی اور اظہار اجتماع و وحدت قلوب و اجسام متصور ہے، جو ہر روز مساجد میں اور ہر سال ہر شہر کے کوچہ و بازار اور گھروں میں اور عمر میں ایک بار کوہ فاران کے دامن میں نظر آتی ہے؛

پس ہمارے سال کا ایک مہینہ ہماری زندگی کا ایک ایسا حصہ ہونا چاہیے جو تنزہ جسم اور طہارت قلب کا کامل نمونہ ہو، تاکہ ہمارا کامل سال منزہ اور طاہر ہو، اور اس طرح ہماری کامل زندگی منزہ اور طاہر ہو، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے؛

من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ :-	جس نے رمضان کے روزے ایمان اور احتساب (نیکی) کے ساتھ رکھے، اس کے
(رواہ البخاری)	اگلے گناہ معاف ہوئے،

گناہوں کی معافی اور مغفرت کا حصول، تمام اعمال انسانیہ کا مقصود وحید اور تمام نیکیوں اور برکتوں کی اساس کار ہے، لیکن کیا جس نے حصول مغفرت اور گناہوں کی معافی کی امید دلائی، اس نے یہ نہیں بتایا ہے، کہ وہ مشروط بہ ایمان واحتساب ہے؛

ایمان واحتساب کیا شے ہے؟ حقیقت صوم کے وہی عناصر ثلثہ ہیں،

جن کی طرف کتاب عزیز نے اشارہ کیا ہے، یعنی اتقاء، تقدیس و تکبیر اور حمد و شکر،
اتقا کے لغوی معنی کسی چیز سے بچنے کے ہیں، لیکن اسلام کی اصطلاح میں اتقا کے
کیا معنی ہیں ؟ "تمام دنیاوی آلائشوں سے، تمام انسانی کمزوریوں سے، تمام جسمانی
خواہشوں سے اور تمام انسانی نجاستوں سے جسم و روح کا محفوظ رکھنا" یہی حقیقت
و ماہیت صوم ہے، جس کے ساتھ دل سے تقدیس و تکبیر کی صدائے غیر محسوس
اور زبان سے حمد و شکر کی آواز بلند ہونی چاہیے تاکہ معتکف غار حرا کے اسوۂ
حسنہ کا کامل اتباع ہو،

تم سمجھتے ہو کہ آلودگی گناہ، آلائش ہوی اور ارتکاب عصیان و نجاسات
نفسانی ناقض صوم نہیں، ممکن ہے کہ جسم کا روزہ نہ ٹوٹتا ہو لیکن دل کا روزہ تو
ضرور ٹوٹ جاتا ہے، اور جب دل ٹوٹتا ہو، تو جسم میں کیا رکھا ہے،

الصائم فی عبادۃ من حین یصبح	روزہ دار صبح سے شام تک عبادت خدا میں
الی ان یمسی ما لم یغتب فاذا	ہے، جب تک کسی کی برائی نہ کرے، اور جب
اغتاب خرق صومہ (رواہ الدیلمی)	وہ برائی کرتا ہے، تو اپنے روزہ کو پھاڑ ڈالتا ہے،

تم سمجھتے ہو، کہ بغاوت نفس، اطاعت ہوی اور عمل شر منافی صوم نہیں، لیکن
میں تمہیں سچا سمجھوں یا اس کو (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو) جو کہتا ہے،

لیس الصیام من الاکل والشرب	روزہ کھانے پینے سے پرہیز کا نام
انما الصیام من اللغو والرفث	نہیں ہے، بلکہ لغو و عمل بد سے پرہیز کا نام

(رواہ الحاکم فی المستدرک والبیہقی فی السنن) ہے،

کیا تم یہ سمجھتے ہو، کہ قول زور، عمل بد، اور طغیان قلب مضر صحت صوم نہیں لیکن میں کیا کروں کہ مخبر صادق کی وہ آواز سنتا ہوں جس کی میں تکذیب نہیں کر سکتا۔

من لم یدع قول الزور والعمل به والجہل فلیس لله حاجة ان یدع طعامه وشرابه جو حالت صوم میں کذب و زور اور جہالت کے کام کو نہیں چھوڑتا، تو خدا کو کوئی ضرورت نہیں کہ روزہ دار اس کے لیے اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

(رواہ البخاری والترمذی والنسائی وابن ماجة واللفظ له)

پس اچھی طرح سمجھ لو کہ صوم کی حقیقت کیا ہے، وہ ایک حالت ملکوتی کے ظہور کا نام ہے، صائم کا جسم انسان ہوتا ہے، لیکن اس کی روح فرشتوں کی زندگی بسر کرتی ہے، جو نہ کھاتے اور نہ پیتے ہیں، وہ تمام مادیات عالم سے پاک اور ضروریات دنیاوی سے منزہ ہیں، ان کی زندگی کا فقط ایک مقصد ہوتا ہے، اطاعت اوامر الٰہی اس لیے صائم نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، وہ مادیات سے پاک اور ضروریات دنیاوی سے منزہ رہنے کی جہاں تک اس کی خلقت و فطرت اجازت دیتی ہے، کوشش کرتا ہے،

صائم مجسم نیکی ہے، وہ کسی کی غیبت نہیں کرتا، وہ کسی کو برا نہیں کہتا، وہ اس سے جہالت نہیں کرتا، وہ بدی کا بدلہ نیکی سے دیتا ہے، وہ اس کا امتثال امر کرتا

ہے، جو کہتا ہے (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)

اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب فان سابہ احد او قاتلہ فلیقل انی امرء صائم۔	تم میں سے جب کسی کے روزے کا دن ہو، تو نہ بدگوئی کرے، نہ شور و غل کرے، اگر کوئی اسے برا کہے یا اس سے آمادۂ شمشیرزنی ہو، تو کہدے کہ میں روزے سے ہوں،

اللہ اکبر وہ ہستیاں کہاں ہیں، جو تلوار کا وار روزہ کی سپر پر روکتی ہیں، روزہ سپر ہے، بے شبہ سپر ہے، وہ آخرت میں حملۂ جہنم سے بچاتا ہے، اور دنیا میں بغاوتِ نفس سے بچاتا ہے، طغیان ہونے سے بچاتا ہے، اور خبثِ عمل سے بچاتا ہے، کیونکہ روزہ کی جزا خود خدا ہے اور وہ خیرِ محض اور نیکیٔ خالص ہے،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قال اللہ تعالٰی کل عمل ابن آدم لہ الا الصیام فانہ لی، وانا اجزی بہ والصیام جنۃ (رواہ البخاری)	حدیث قدسی ہے کہ خدا نے فرمایا انسان کا تمام عمل اسی کے لیے ہے لیکن روزہ میرے لیے ہے، میں اس کی جزا ہوں اور روزہ سپر ہے۔

پس مبارک ہے وہ جو اس سپر کو لیکر کارزارِ اعمال میں آتا ہے کہ وہ حملۂ نفس سے زخمی نہ ہوگا، مبارک ہے وہ جوان ایام میں بھوکا رہتا ہے، کہ وہ آسودہ ہوگا، مبارک ہے وہ جوان ایام میں پیاسا رہتا ہے، کہ وہ سیراب ہوگا۔

سبوح قدوس ربنا ورب الملٰئکۃ والروح۔ (الہلال ۲ اگست ۱۹۱۳ء)

روزہ

روزہ، رمضان المبارک، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت

روزہ اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے، آج جب یہ رسالہ ناظرین کے ہاتھوں میں ہوگا، تمام دنیائے اسلام صرف خدا کے نام پر بھوکی اور پیاسی ہوگی،

روزہ کی ابتدائی تاریخ نامعلوم ہے، اور اس کی حقیقت کے متعلق بھی دانایانِ فرنگ نے کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا ہے، ہربرٹ اسپنسر اپنی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی (اصول معاشرت) میں چند وحشی قبائل کی تمثیل اور استقرار کی بنا پر لکھتا ہے، کہ " روزہ کی ابتدا، اصل میں اس طرح ہوئی ہوگی، کہ لوگ وحشت کے زمانے میں خود بھوکے رہتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے، کہ ہمارے بدلے ہمارا کھانا اس طرح ہمارے مردوں کو پہنچ جاتا ہے، الحمد للہ کہ ہم کو اس خیال کی غلطی ثابت کرنے کے لیے کسی مزید کوشش کی ضرورت نہیں، یورپ میں اس نظریہ کا عدم قبول خود اس کی بے بنیادی کی دلیل ہے[1]،

بہرحال دیگر مذاہب میں روزہ کی ابتدا، اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں،

لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتدا و غایت کی تشریح میں اپنے پیرووں کی وکالت کا محتاج نہیں، وہ باواز بلند مدعی ہے،

یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ (بقرہ ۲۳)	مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا، جس طرح تم سے پہلے قوموں پر فرض کیا گیا، تاکہ تم پرہیزگار ہو،
شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینت من الھدی والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ ومن کان مریضا او علی سفر فعدۃ من ایام اخر یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ولتکملوا العدۃ ولتکبروا اللہ علی ما ھدکم ولعلکم تشکرون،	ماہ رمضان وہ مہینہ ہے، جس میں قرآن اتارا گیا، جو انسانوں کے لیے سرتاپا ہدایت ہے اور ہدایت کی نشانیاں ہیں، جو اس رمضان کو پائے چاہیے کہ وہ اس میں روزہ رکھے، اور اگر کوئی بیمار ہو، یا مسافر ہو، تو اس کے بدلہ وہ دوسرے دنوں میں روزہ رکھ لے، خدا آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو اور یہ روزہ اس لیے فرض ہوا تاکہ تم خدا کی اس عطائے ہدایت پر اس کی بڑائی کرو، اور شکر بجالاؤ۔

ان آیاتِ پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام بیان کیے گئے، بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ماہیت، روزہ پر اعتراض کا جواب، یہ تمام امور مفصل

بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں،

روزہ کی تاریخ | قرآن نے گذشتہ آیت میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ تمام مذاہب کے مجموعۂ احکام کا ایک حصہ رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبر امی جو بقول مخالفین عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا، وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ مفروض عبادت رہا ہے، اگر یہ دعویٰ تمامتر صحت پر مبنی ہے، تو اس کے مافوق ذرائع علم اور اعلیٰ ترین انسان ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے، اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) پر لکھتا ہے۔

> روزوں کے اصول و طرق گو باختلاف آب و ہوا، قومیت تہذیب اور حالات گرد و پیش بہت زیادہ مختلف ہیں، لیکن بمشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں، جس کے نظام مذہبی میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو"

آگے چل کر لکھتا ہے:۔

> گو کہ روزہ بحیثیت ایک مذہبی رسم کے تقریباً ہر جگہ موجود ہے۔

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے، لیکن برت یعنی روزہ کی بندش سے وہ بھی آزاد نہیں، ہر ہندی مہینہ کی گیارہویں تاریخ کو برہمنوں پر اکادشی کا روزہ ہے، اس حساب سے سال میں چوبیس ۲۴ روزے ہوئے، بعض برہمن کاتک کے مہینہ میں ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہیں، ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں، یعنی چالیس

دن اکل وشرب سے احتراز کرتے ہیں، ہندوستان کے تمام مذاہب میں جینی دھرم میں سب سے زیادہ روزہ کے سخت شرائط ہیں، چالیس چالیس دن تک کا ان کے ہاں روزہ ہوتا ہے، گجرات و دکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں، قدیم مصریوں کے یہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے، یونان میں صرف عورتیں تھسموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھیں، پارسی مذہب میں عام پیروں پر عملاً روزہ فرض نہیں، لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے یہاں موجود تھا، خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لیے تو پنج سالہ روزہ ضروری تھا۔[1]

یہودیوں میں بھی روزہ فریضۂ الٰہی ہے، حضرت موسیٰؑ نے کوہِ طور پر چالیس دن بھوکے اور پیاسے گذارے، (خروج ۳۴-۲۸) یہودی قانون کی رُو سے سال میں روزے کے لیے متعدد تاریخیں مخصوص ہیں، ساتویں مہینہ کا دسواں دن، عام مفروض روزہ کی تاریخ ہے،[2] اس کے علاوہ اور روزوں کے احکام تورات کے مختلف صحیفوں میں بہ تصریح مذکور ہیں،[3] عیسائی مذہب میں بھی آکر ہم کو روزہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے،

---

[1] ان تمام حوالوں کے لیے دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۱۰ ص ۱۹۳، ۱۹۴ طبع یازدہم۔

[2] دیکھو تورات سفر الاحبار ۱۶-۲۹، ۲۳، ۲۴، ۲۷، ۳۲، سفر العدد ۲۹، ۱۱۔

[3] اول سموایل ۷، ۶، یرمیا ۳۶-۶

حضرت عیسیٰ نے چالیس دن جنگل میں روزہ رکھا۔ (متی ۴۔۲) حضرت یحییٰ جو حضرت عیسیٰ کے گویا استاد تھے، وہ بھی روزہ رکھتے تھے، اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی،[1] اسی آیت میں مذکور ہے، کہ یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰ پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد روزہ کیوں نہیں رکھتے" اس سے مقصود یہودیوں کے رسمی اور مبتدع روزے ہیں، حضرت عیسیٰ خود اپنے شاگردوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

"پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکاروں کے مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں، کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تم روزہ رکھو، اپنے سر میں تیل لگاؤ، اور منہ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھکو آشکارا بدلہ دے" (متی ۶۔ ۶۔۷)

ایک دوسرے مقام پر شاگرد حضرت عیسیٰ سے پوچھتے ہیں، کہ ہم پلید روحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں، آپ اس کے جواب میں فرماتے ہیں،

"یہ جنس سوائے دعا، نماز اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی"

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ	مسلمانو! تم پر روزہ اسی طرح لکھا گیا، جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا،

[1] مرقس ۱۸۔

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے،

روزہ کی حقیقت | انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیوں اور ناکامیوں کے علل و اسباب کی اگر تحلیل کی جائے، تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے، وہ مختلف اغراض کا پابند ہے، اس کے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں، اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے، اگر تحقیق کی جائے تو اس کی بنیاد بھی کسی ضرورت یا غرض نفسانی پر مبنی نظر آئے گی، اس لیے اصل میں ہماری ہر قسم کی بدبختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں، ضرورت اور غرض اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے، تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے،

قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں کا اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کتنی ہے، ہمارے دل میں آرزوؤں کا ایک مدفن ہے، تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے، خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے، لیکن کیا خوشنما کپڑوں، عالیشان عمارتوں، لذیذ غذاؤں، تیز رفتار سواریوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے، فرزند و عیال، زر و مال، خدم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کے کسی لمحہ کو بھی یاس انگیز ساعت کا انتظار ہوگا، بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی ہے، اور زندہ رہے ہیں، قارون دم بھر میں ابراہیم ادھم بن گیے اور جیتے رہے،

خود ساختہ ضرورتوں کی نفی و تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دو لفظوں میں محدود ہو کر رہ جائے اور وہ "مایۂ قوت و غذا" ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، بقائے روح اور تحفظ جان، سدِ رمق پر موقوف ہے، اور سدِ رمق اکل و شرب پر موقوف ہے، اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد و منشا یہی قوت و غذا اور اکل و شرب کا سرمایہ ہے، اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ میں عالم ملکوت اور عالم ناسوت کے دو باشندوں میں اگر فصل و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے، تو صرف یہی ایک چیز تمام فصول و امتیازات کو محیط ہوگی،

اسی بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں جو زمانہ کے کسی دور میں بھی پیدا ہوئے ہیں، مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لیے اکل و شرب سے امتناع سب سے پہلی شرط قرار دی گئی ہے، جس سے اصل مقصود یہ تھا، کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کر دے، اور آخر یہ کہ قوت و غذا کی طلب و حرص سے بھی بے نیازی کے لیے متواتر کوشش جاری رکھے، کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم نفسانی صرف اسی ایک قوت کے نتائجِ مابعد ہیں، اگر یہ طلب و ضرورت فنا ہو جائے، تو ہم کو دفعۃً عالمِ ناسوت میں عالمِ ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے، لیکن جب تک انسان، انسان ہے، اس کو غذا سے قطعی بے نیاز ہونا ناممکن ہے، اس بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے، اس مدت کے

اندر انسان کو تمام انسانی ضروریات جن سے استغنا کسی زمانہ تک ممکن نہیں ہے، مجتنب ہوکر تھوڑی دیر کے لیے ملأ اعلیٰ کی مخلوقاتِ مقدسہ میں داخل ہو جانا چاہیے،

اور چونکہ ان مخلوقات کا محض خدائے پاک کی اطاعت و عبادت فرضِ زندگی ہے اس لیے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے،

قرآن مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ تقویٰ سے بے نقاب کر دیا ہے، اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی، اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃً اس حقیقت میں شریک کر لیا ہے،

كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون - مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں پر لکھا گیا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

لیکن آگے چل کر قرآن پاک روزۂ اسلام کی دو اور مخصوص حقیقتوں کو واضح کرتا ہے،

لتكبروا الله على ما هداكم ولعلكم تشكرون - تاکہ خدا کی اس عطائے ہدایت پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو،

اس مفہوم کی توضیح کے لیے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا،

رمضان اور لیلۃ القدر | یہ مادی عالم جس طرح نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالم روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام قانون اور سلسلۂ علل و اسباب قائم کر رکھا ہے، جس یقین کے ساتھ تم دعویٰ کر سکتے ہو، کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے،

اسی یقین کے ساتھ طبِ روحانی کا واقف کار کہتا ہے، کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے، پیغمبر فیضانِ نبوت کے قبول کے لیے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے، دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے، معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے، وہ اپنے دعویٰ کو کس طرح پیش کرتا ہے، انکار و مزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرت الی اللہ کرتا ہے، پھر کیونکر منکرینِ دعوت ناکام و خاسر اور اہلِ ایمان کامیاب اور مفلح ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک درجہ اور مرتبہ منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور پذیر ہوتا ہے، قرآن مجید میں جا بجا تیرہ[۱۳] مقامات پر سنۃ اللہ کا جو لفظ آیا ہے حقیقت میں اس سے زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفۂ تاریخ، سیاسی واقعات کی تکرار اور بار بار کے اعادۂ حوادث سے جس طرح اصولی نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے، بعینہٖ اسی طرح تاریخِ نبوت اپنے بار بار کے اعادۂ واقعات سے اصولی قانون ہمارے لیے قرار دیتی ہے،

پیغمبر دنیا میں ناسوت و ملکوت کی ایک مجموعی قوت اور متحد وجود ہوتا ہے، وہ اپنے کمالِ انسانیت کو پہنچ کر جب فیضانِ نبوت کے قبول و استعداد کا انتظار کرتا ہے، تو ایک مدت تک کے لیے عالمِ انسانی سے بلند ہو کر، ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے، اس مقام پر پہنچ کر وہ انسانیت کی تمام ممکن الاحتراز ضروریات سے پاک ہو جاتا ہے، اور پھر اسی ساعت سے اس کے دل و دہن میں وحیِ الٰہی کا

سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے، کوہ سینا کا پُر جلال پیغمبر (حضرت موسیٰؑ) جب تورات لینے کو جاتا ہے، تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے[1]، کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰؑ) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز و شب جنگل میں بھوکا اور پیاسا رہا[2]، فاران کا آتشیں شریعت لانے والا پیغمبر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نزولِ قرآن سے پہلے حراء کے غار میں ایک ماہ کامل "متحنث" رہتا ہے، اور بالآخر اسی اثناء میں ناموسِ اکبر "اقرء باسم ربک الذی خلق کا مژدۂ جانفزا لیکر نمودار ہوتا ہے[3]،

یہ واقعہ کس ماہِ مبارک کا تھا؟

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن، رمضان وہ مہینہ ہے، جس میں قرآن اُترا۔

یہ کس شبِ اقدس کی داستان ہے،

انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ (دخان) ہم نے قرآن کو ایک مبارک شب میں اتارا،

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر (القدر) ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا۔

ان آیات کے استقصاء سے یہ بخوبی ثابت ہوگیا کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے، جس میں قرآن نے سب سے پہلی بار دنیا میں نزول کیا، اور پیغمبر امی علیہ الصلوٰۃ والسلام

---

[1] خروج ۳۴-۲۰ [2] متی ۴-۲ [3] صحیح بخاری حدیث بدء الوحی،

کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لیے سب سے پہلی بار دستور نامۂ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا، قرآن کا حامل اور اس وحیِ الٰہی کا مہبط آخر میں ان دنوں ایک غار کے پردے میں یکہ و تنہا بھوکا اور پیاسا سربزانو تھا، اس بنا پر اس ماہِ مقدس میں بھوکا پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ میں یکہ و تنہا رہنا (اعتکاف) شبِ نزولِ وحی میں بیدار و سربسجود رہنا (عبادتِ لیلۃ القدر) تمام پیروانِ محمدی کے لیے لازم و فرض تھا؛ اسی لیے اس نے کہا،

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی۔ اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو، تو میری پیروی
یحببکم اللہ کرو، خدا تمہیں پیار کرے گا،

اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے، اور روزوں کے لیے رمضان کی تخصیص کس بنا پر ہے۔

ہم نے پہلے بیان کیا تھا، کہ حصول تقویٰ کے علاوہ جو تمام مذاہب کے روزوں کی مشترک بنیاد ہے، اسلامی روزوں کے دو اور اساس ہیں، تکبیر اور شکر؛ خدائے پاک روزوں کی غایت تقویٰ کے علاوہ حسب ذیل بیان فرماتی ہے۔

لتکبروا اللہ علیٰ ماھدٰکم و روزہ اس لیے فرض ہوا کہ تم اس عطائے
لعلکم تشکرون۔ ہدایت پر خدا کی بڑائی کرو، اور شکر ادا کرو۔

اس بنا پر دیگر مذاہب سے زائد اسلامی روزہ کی یہ بھی غایت ہے، کہ اس ماہ مقدس میں بقدر امکان ان ہی حالات و جذبات میں متکیف ہوں جن میں وہ حاملِ

قرآن منکشف ہوا، کہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار کی تاریخ ہو، یہ جذبات و حالات جن کو مبلغ قرآن کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، یہی اس محسن اعظم کی اس عطائے ہدایت پر بڑائی اور شکر گذاری ہے۔

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب

علم و فطرت شناسی کے اکثر مدعی جو عام عبادت و پرستش کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہیں، کہ وحشی انسان کا تخیل یہ ہے، کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے؛ وہ روزہ کی حقیقت بھی اسی قدر سمجھتے ہیں، کہ خدا کی طلب و خوشنودی کے لیے جسمانی زحمت کشی ہے، ان غلط فہمیوں کے لیے دیگر مذاہب میں لغزش گاہیں موجود ہیں، اس وقت ہم کو روزہ سے بحث ہے جوگیوں اور جینیوں میں روزہ کی متعذر الامکان مدت اسی معنی کی طرف اشارہ کر سکتی ہے، یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لیے "نفس کو دکھ دینے" کی اصطلاح جاری ہے، توراۃ میں روزہ کے مفہوم کے لیے اکثر یہی فقرہ مستعمل ہے:

اور یہ تمہارے لیے قانونِ دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم میں سے ہر ایک، خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو، خواہ پردیسی جس کی بود و باش تم میں ہے اپنی جان کو دکھ دے" (احبار ۱۶-۲۹)

سفر العدد، آیت ۲۹-۷ میں ہے:

اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی، اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو اور کچھ کام نہ کرو۔

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ صوم ہے، صوم کے لغوی معنی، احتراز و اجتناب کے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے، کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، خدا نے قرآن پاک میں جہاں مسلمانوں کو روزہ کا حکم دیا ہے، وہاں یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیئے ہیں،

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر،	خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا۔

قرآن کا عام قانون ہے،

لا یکلف اللہ نفساً الا وسعها۔ (بقرہ)	خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے،

یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔ (اعراف)	اور وہ ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے، اور گندہ چیزوں کو حرام کرتا ہے اور اس طوق و زنجیر کو جو ان کے گلے میں پڑی تھی، ان کو ان سے علیحدہ کرتا ہے۔

اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا، اور اس میں جو سہولتیں پیدا

کیں، وہ حسب ذیل ہیں،

۱- سب سے اوّل یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے، اُن میں اکثر روزہ پیرووں کی خاص جماعت کے لیے مفروض تھا، مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کے لیے کوئی روزہ ضروری نہیں، پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کے لیے روزہ ہے، یونانیوں میں صرف عورتوں کے لیے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی مذہبی چیز ہے، تو تمام پیروانِ مذہب کے لیے یکساں ہونا چاہیے، اسلام میں پیشوا، غیر پیشوا، عورت مرد کی کوئی تخصیص نہیں، اس نے اپنے تمام پیرووں کو عام حکم دیا، اور اس میں کسی جنس کی کوئی تفریق نہیں کی،

فمن شھد منکم الشھر فلیصمه: اس مہینہ میں جو زندہ موجود ہو، روزہ رکھے،

۲- اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے، شمسی سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی، اُن میں تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر گرمی یا سردی کے موسم میں روزے پڑتے تو یا وہ ہمیشہ کے لیے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لیے آرام دہ ہو جاتے، اسلام کے روزوں کی تاریخیں ہر ملک میں ہر موسم میں آتی ہیں، اور اس بنا پر اُن کی سختی و نرمی ہر عہد میں بدلتی رہتی ہے۔

۳- جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید و حکم کے متعلق کسی حالتِ انسانی کی تخصیص اور استثنا نظر سے نہیں گذرا، تورات میں تو یقیناً مذکور نہیں، لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ

ہر قسم کے معذور و مجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا، بچے مستثنیٰ ہیں، عورتیں ایام حمل و رضاعت اور دیگر مخصوص ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں، بڈھے، بیمار، مسافر مستثنیٰ ہیں، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرۃً قادر نہیں مستثنیٰ ہیں،

فمن کان منکم مریضاً او علیٰ سفر فعدۃ من ایام اخر وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین۔ (بقرہ)

اگر تم میں کوئی بیمار ہو، یا مسافر وہ رمضان کے بعد اور دنوں میں روزہ رکھ لے، اور وہ لوگ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہوں ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے۔

ترمذی میں ہے،

عن انس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ وضع من الحامل والمرضع الصوم۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ کا بار اتار لیا۔

۴۔ اور مذہبوں میں روزہ کے شرائط نہایت غیر معتدل تھے، یا تو مسلسل چالیس چالیس روز کا فاقہ تھا، یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے ایک مخصوص مدت کے اندر کھانا پینا اور حیوانی اغراض سے اعتدال کے ساتھ روک دیا۔

۵۔ اسلام سے پہلے روزہ کی مدت نہایت غیر معتدل تھی، جینیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ

رکھتے تھے، یہودیوں کے یہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صرف صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا،

ثم اتموا الصیام الی اللیل — پھر روزہ کو رات تک پورا کرو،

۶۔ یہودیوں کے ہاں یہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے تھے، پھر نہیں کھاتے تھے، عرب میں رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے کھا لیتے، سو جانے کے بعد کھانا پھر ناجائز تھا، ابتدائے اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا، ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا نہیں تیار ہوا تھا، ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھیں، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک چکا، تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئیں، وہ سو چکے تھے، اس لیے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے روز پھر روزہ کا دن تھا، ان کو غش آ گیا، اس پر یہ آیت اتری

وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔ — اس وقت تک کھاؤ پیو، جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے۔

۷۔ ایام جاہلیت میں دستور تھا کہ ایام صیام میں میاں بیوی پوری مدت تک علیحدہ رہتے تھے، لیکن چونکہ یہ ممانعت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر مرتکب خیانت ہو جاتے تھے، اسلام نے صرف وقت صوم تک یہ ممانعت محدود کر دی۔

احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم ھن لباس لکم وانتم لباس لھن علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم فالآن باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم — روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت تمہارے لیے حلال کی گئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں، اور تم ان کی، خدا جانتا تھا کہ تم خیانت نفس کرتے تھے اس نے معاف کیا، اب بیویوں سے میل جول کرو، اور خدا نے تمہارے مقدر میں جو کچھ رکھا ہے اس کی تلاش کرو۔

۸۔ بھول چوک اور خطاو نسیان اسلام میں مغفور ہے، اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے، یا کوئی اور امر ناقض صوم اس سے سرزد ہو، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

عن ابی ھریرۃ: من اکل او شرب ناسیا فلا یفطر فانما ھو رزق اللہ (ترمذی) — حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے جو بھول کر کھائے یا پیے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، یہ تو خدا کی روزی تھی۔

۹۔ اسی طرح وہ افعال جو گو منافی صوم ہیں، لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوئے بلکہ مجبوراً اس سے صادر ہوئے اس سے بھی نقض صوم نہیں ہوتا۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یفطر من قاء ولا من احتلم — پیغمبر خدا نے فرمایا: جس کو قے ہو گئی یا غیر دانستہ غسل ہوئی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔

۱۰۔ سر میں تیل ڈالنا، سرمہ لگانا، بدن میں پچھنا اور نشتر لگانا پہلے منافی صوم تھا۔

اسلام نے یہ سختی کم کر دی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرورت ہوئی، کہ صریح الفاظ میں ان کے متعلق عام احکام دے دیں۔

احکام اسلام کی عام آسانیاں اور سہولتوں کے لیے اس تعلیم الٰہی سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے ؟

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا لہا ما اکتسبت وعلیہا ما اکتسبت ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین۔	خدا کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کسی بات کی تکلیف نہیں دیتا، انسان کا نتیجہ عمل خیر ہو یا شر، اسی کے نفع ونقصان کے لیے ہے، خداوندا! اگر ہم سے بھول چوک ہو تو ہم سے پرسش نہ کرنا، خداوندا! ان بندشوں کا بوجھ ہم پر نہ ڈالنا، جو ہم سے پہلوں پر تو ڈال چکا، خداوندا جس کی طاقت ہم میں نہ ہو، وہ بوجھ ہم پر نہ ڈالنا ہم سے درگذر کر، ہمارے گناہ معاف کر، ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا آقا ہے، اور اپنے منکروں پر ہمیں فتح عطا فرما۔

(بقرہ - ۴۰)

(معارف، جولائی ۱۹۱۶ء)

ایامِ صیام پر نظرِ ثانی[۱]

ایک غیر مولوی کا جواب تمام ہو چکا، جس کو پڑھ کر آپ کو حیرت ہوئی ہوگی، کہ وہ ایک "عربی حرف شناس تعلیم یافتہ ہو کر" کیونکر پرانے طرز کا مسلمان باقی رہ سکا، مگر ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم کہیں مخصوص و محدود نہیں، گو اس "غیر مولوی" نے کسی "عراقی خانساماں" سے عربی نہیں سیکھی، تاہم شملہ اور نئی دلی کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں موصوف نے جو عربی پڑھی ہے، وہ نتائج کے لحاظ سے مقبول احمد صاحب کے فارن ڈیپارٹمنٹ کی "عراقی عربی" سے زیادہ نتیجہ خیز ہے،

اس بحث میں ہمارے نزدیک اصل میں تین بحثیں ہیں،

---

[۱] ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر مقبول احمد صاحب نے جو کسی سرکاری خدمت کے سلسلہ میں کچھ دنوں عراق میں رہے تھے، اس لیے عربی کی شد بد سے بھی واقف ہو گئے تھے انھوں نے نگار میں ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا تھا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ صرف تین وقت کی نمازیں اور صرف چند دن کے روزے فرض ہیں، تیس روزے فرض نہیں ہیں، نماز والے مضمون کا جواب راقم نے لکھا تھا اور روزہ والے مضمون کا غلام احمد پرویز اور سید صاحب نے ان دونوں کے مضمون جنوری ۳۲ء کے پرچے میں شائع ہوئے تھے یہ سید صاحب کا وہی مضمون ہے۔ (معین الدین)

۱۔ کیا جمع قلت کا جو قاعدہ مدعی نے سمجھا ہے، وہ صحیح ہے؟

۲۔ کیا قرآن میں مہینہ بھر کے روزہ کا ذکر نہیں؟

۳۔ کیا احادیث میں ۲۹۔۳۰ روزوں کا ذکر نہیں؟

جمع قلت کے قواعد | یہ بالکل صحیح ہے کہ عربی میں جمع کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک جمع قلت جس کا اطلاق تین سے دس تک پر ہوتا ہے، دوسری جمع کثرت جس کا اطلاق گیارہ سے مافوق پر ہوتا ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ ایام جمع قلت ہے، لیکن قاعدہ صرف اسی قدر نہیں ہے، کہ اگر اسی قدر ہو تو حسب ذیل آیتوں میں وہ کون بے وقوف ہوگا جو ایام سے صرف تین سے لے کر نو تک (حسب علم مقبول احمد) یا دس تک (حسب قواعد نحو) سمجھے گا۔

تلك الايام نداولها بين الناس، یہ دن ہیں، جن کو ہم لوگوں کے درمیان (آل عمران) دست بدست الٹتے ہیں

کیا اشخاص اور قوموں کی صدیاں اور سالہا سال جن میں ہزاروں دن (ایام) داخل ہیں، صرف نو یا دس دنوں میں محدود ہیں؟

قیامت میں نیکوکاروں سے کہا جائے گا،

كلوا واشربوا هنيئا بما اسلفتم في الايام الخالية (حاقہ) خوش خوش کھاؤ پیو، اس کے بدلے میں جو تم گذشتہ دنوں (ایام) میں کرتے تھے۔

کیا یہ "ایام خالیہ" ہر جنتی کے دس ہی دن ہوں گے، خواہ اس کی عمر سو ہی

برس کی کیوں ہوئی ہو، یہ کیسی نادانی کا دعویٰ ہے، قرآن پاک میں ایک اور جگہ ہے،

وذکرھم بایام اللہ۔ (ابراہیم) : اور ان کو اللہ کے دنوں (ایام) کی یاد دلاؤ۔

اللہ کے دن سے مقصود وہ دن ہے جب اللہ تعالیٰ کی کسی عجیب قدرت کا اظہار ہوا ہو، تو کیا تاریخ میں اس قسم کے صرف تین سے دس تک دن گذرے ہیں، یا ان کی تعداد سینکڑوں ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

امید ہے کہ "عراقی خانساماں کا فاضل شاگرد" ان آیتوں پر نگاہ رکھ کر ابھی جمع قلت کے قواعد کو سمجھے گا،

آگے چلیے معرفہ کو چھوڑ کر تنکیر پر آئیے، یمن سے شام تک کی مسافت اب بھی موجود ہے، سبا کے عہد میں یہ پورا راستہ باغ و بہار بنا ہوا تھا، جو آخر ان کی بداعمالیوں کے سبب سے ویران ہو گیا، یہ راستہ پا پیادہ یا اونٹوں پر بہر حال ایک مہینہ سے کم کا نہ ہوگا، مگر اس کے متعلق قرآن پاک میں ہے،

سیروا فیھا لیالی وایاما اٰمنین۔ چلو ان میں راتوں اور دنوں (ایام) بے خوف و خطر۔ (سبا ۱)

کیا اللہ تعالیٰ کا یہ اظہار احسان تیس دنوں کے سفر میں سے صرف دس دن کے سفر کے ساتھ محدود ہے؟ پھر قاعدہ کیا ہے؟ قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی لفظ کی دو جمعیں آتی ہوں، ایک قلت کی اور دوسری کثرت کی، تو عموماً کمی دکھانے کے لیے جمع قلت اور کثرت دکھلانے کے لیے جمع کثرت لائیں گے، لیکن یہ قاعدہ ان الفاظ

کے لیے نہیں، جن کی ایک ہی جمع آتی ہو، ان الفاظ کے لیے یہ قلت وکثرت کی سرے سے کوئی تخصیص وتحدید ہی نہیں، ورنہ لازم آئے گا کہ عربی میں دس سے زیادہ دنوں کے لیے ہم کوئی لفظ ہی نہ بول سکیں، مثال یہ ہے کہ سیف (تلوار) کی جمع سیوف بھی آتی ہے، جو جمع کثرت ہے، اور اسیاف بھی آتی ہے، جو جمع قلت ہے، تو اکثر جہاں کمی دکھانی ہوگی، وہاں اسیاف اور جہاں کثرت دکھانی ہوگی، وہاں سیوف بولیں گے۔

مگر بایں ہمہ یہ قاعدہ بھی کلیہ نہیں، جاہلی شاعر فخریہ کہتا ہے۔

واسیافنا یقطرن من نجدۃ دما ... اور ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے،

ظاہر ہے کہ یہاں تلواروں کی قلت مراد نہیں ہوسکتی، اسی طرح عمرو بن کلثوم تغلبی (سبعہ معلقہ) فخریہ کہتا ہے

وایام لنا غر طوال ... اور ہمارے لیے روشن اور لمبے دن ہیں،

کیا اس سے مراد چند ہی دن ہوں گے، چند لگاکر دیکھو، کہ پھر شاعر کا فخر باقی رہتا ہے،

اسی طرح لفظ قرء (حیض یا طہر) اس کی جمع قلت اقراء آتی ہے، اور جمع کثرت قروء، اب قاعدہ کے مطابق ثلثۃ (تین) کے ساتھ اقراء آنا چاہیے، نہ کہ قروء، مگر قرآن پاک میں تین کے ساتھ قروء آیا ہے، کیونکہ رسمی قواعد پر عبارت کی شستگی اور توازن الفاظ کو فوقیت اور ترجیح حاصل ہے،

الغرض اس قاعدہ کا اگر تعلق بھی ہے، تو صرف اُن الفاظ سے جن کی دونوں

قسموں کی جمعیں آتی ہیں، ورنہ وہ الفاظ جن کی ایک ہی قسم کی جمع آتی ہے، صرف جمع قلت یا صرف جمع کثرت، ان میں یہ فرق کبھی ملحوظ نہیں ہوتا، مثلاً دیکھو کہ رجل (پانوں) کی جمع صرف ایک آتی ہے، اور وہ ارجل ہے، جو جمع قلت ہے، مگر اس کا اطلاق دس اور دس سے ہزار ہا زیادہ پانووں پر بھی ہوتا ہے، ورنہ لازم آئے گا، کہ وضو میں پانوں دھونے کا حکم صرف دس پانووں تک محدود ہو،

وارجلکم الی الکعبین۔	اور اپنے پانووں کو ٹخنوں تک،

اور اس کے برخلاف لفظ رَجُل (مرد) کہ اس کی جمع صرف رجال آتی ہے، جو جمع کثرت ہے تو اب چاہیے کہ ہم ثلثۃ رجال اور عشرۃ رجال نہ بول سکیں، کہ اس کا اطلاق دس سے زیادہ پر ہوگا، تین سے دس پر نہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ سرے سے یہ قاعدہ ہی نہیں، ورنہ چاہیے کہ ایسے الفاظ جن کی صرف جمع قلت آتی ہے، ان کے لیے دس سے زیادہ بول ہی نہ سکیں، اور جن کی صرف جمع کثرت آتی ہے، ان کی دس یا دس سے کم کی جمع بھی نہ بول سکیں، بھلا ایسی حماقت کا قاعدہ کسی زبان میں بھی ہوسکتا ہے،

اب ہم سند کے طور پر نحو کی سب سے مستند اور مشہور کتاب رضی شرح کافیہ پیش کرتے ہیں، مبحث جمع مکسر کے آخر میں ہے،

واعلم انہ اذا لم یات للاسم الا بناء جمع القلۃ کارجل او الا جمع	اور جاننا چاہیے کہ جب کسی اسم کی صرف جمع قلت آئے، جیسے رجل (پانوں) کی ارجل یا

الکثرۃ کرجال فی الرجل وکذا کل	صرف جمع کثرت آئے جیسے رجل (مرد) کی
جمع تکسیر للرباعی الاصلی وفیہ و	رجال اور نیز ہر وہ جمع مکسر جو ایسے چار حرفی
کمالا یجمع الا جمعہ کا جادل و	لفظ کی ہو، جس کے چاروں حروف اصلی ہوں،
مصانع فھو مشترک بین القلۃ	اور نیز وہ لفظ جس کی جمع صرف اجادل اور
والکثرۃ، وقد یستعار احدھما	مصانع کے وزن پر آتی ہے، تو وہ قلت اور
للآخر مع وجود ذالک الآخر	کثرت میں یکساں (مشترک) بولے جاتے ہیں،
کقولہ تعالیٰ ثلٰثۃ قروء مع وجود	اور کبھی دوسری جمع (قلت یا کثرت) موجود
اقراء۔	ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کے موقع پر
	مستعار بولتے ہیں، جیسے قرآن میں ثلٰثۃ قروء
(رضی جلد دوم ص ۱۵۵ مطبع نولکشور ۱۸۶۲ء)	ہے، حالانکہ اس کی جمع قلت اقراء موجود تھی،

امید ہے کہ ہمارے فاضل دوست کی عراقی سیاحت، رضی کی اس عبارت کے سمجھنے میں پوری مدد دے گی، اور عربی قواعد کی ناواقفیت سے جو احمقانہ قاعدہ تصنیف کیا گیا ہے، اور جس کی بنا پر قرآن کے مفہوم میں بھی ترمیم کی جرأت کی گئی ہے، اس کی اصلیت پوری طرح سمجھ میں آجائے گی۔

اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ ایام کے سوا یوم کی کوئی دوسری جمع آتی ہی نہیں، اس لیے اس میں کثرت وقلت کا سوال ہی لغو ہے، گو کہ اتنی واقفیت عربی کے ہر حرف شناس کو ہے، کہ وہ اس کو بے تامل تسلیم کرلے، کہ یوم کی جمع سوائے ایام

کے دوسری نہیں، مگر چونکہ ہمارا مخاطب وہ ہے، جس کو اہلِ زبان سے تلثین ایاما سننے کی بھی توقع تھی، حالانکہ اگر کسی اہلِ زبان سے سنتا بھی تو غلط ہوتا؛ اس لیے اس کی تشفی کے لیے عربی کے کسی مشہور لغت کو پیش کرنا ضروری ہے، چنانچہ لسان العرب اس موقع پر پیش ہے،

الیوم معروف مقدارہ من طلوع الشمس الی غروبها والجمع ایام لا یکسر الا علی ذالک ..... ولم یستعملوا فیه جمع الکثرۃ ـ	یوم کے معنی مشہور ہیں، اس کی مدت آفتاب نکلنے سے اس کے ڈوبنے تک ہے اور جمع ایام ہے، اس لفظ (یوم) کی جمع کسر نہیں آتی، لیکن اسی وزن (ایام) پر ..... اس یوم میں اہلِ عرب نے جمع کثرت نہیں استعمال کی ہے،
(ج ۱۶ ص ۱۳۷، مصر)	

اب تو غالباً ایاماً معدودات کی جمع قلت کا معاملہ حل ہو گیا ہوگا، کہ دس دن ہوں یا دس سے صدہا زیادہ، ہر حال میں ایام ہی بولیں گے، اور اس سے دس تک کی تخصیص سمجھنا قطعی ناممکن ہے،

سوال ہو سکتا ہے، کہ روزہ کے حکم میں قرآن نے پہلے ابہام کے ساتھ "کچھ دنوں" کا روزہ کہا اور پھر اس کے بعد ماہ رمضان کہہ کر، مہینہ بھر کی تخصیص بعد کو کیوں کی، تو اس کا جواب یہ ہے، کہ روزہ یوں بھی سخت حکم ہے، اور اہلِ عرب کے لیے وہ اور بھی نہایت سخت تھا، اس لیے مہینہ بھر کا یک بیک حکم ان پر نہایت گراں گذرتا، اس لیے بلاغت کا اقتضایہ تھا، کہ پہلے دنوں کا ابہام رکھا جائے، چنانچہ

فرمایا گیا۔

ایاماً معدودات (بقرہ) کچھ گنے ہوئے دنوں میں روزے فرض کیے گئے،

مگر دیکھیے کہ تنکیر کے ابہام کے باوجود معدود (گنے ہوئے دنوں) کہنے سے اتنا ابھی ثابت ہے، کہ وہ کتنے ہی دن بھی ہوں، مگر وہ گنے ہوئے اور مقرر و متعین دن ہیں، اب یہ سمجھنا چاہیے کہ "کچھ دن" اضافی الفاظ میں سے ہے، یعنی چند دن یا کچھ دن میں تنکیر کی وجہ سے جو قلت معلوم ہوتی ہے، وہ قلت کسی نسبت کے مقابلہ میں ہے، مثلاً اگر ایک شخص نے کسی مسئلہ پر ایک ہزار صفحوں کی کتاب لکھی ہے، تو اس کے مقابلہ میں اس کے حریف نے اگر پچاس صفحوں کا بھی رسالہ لکھا، تو وہ چند ہی صفحے کہلائیں گے، الغرض "ایاما معدودات" میں تنکیر کی وجہ سے جو قلت سمجھی جاتی ہے، وہ چار یا پانچ یا دس تک کی ہی ضروری نہیں، بلکہ صرف اس قدر ہے، کہ وہ دوسرے کے مقابلہ کے لحاظ سے نسبتہً کم ہے،

اب غور کیجئے کہ سال کے تین سو ساٹھ دنوں کے مقابلہ میں اگر تیس یا انتیس دنوں کے روزے ہوں تو وہ چند دن نہ کہلائیں گے، تو کیا کہلائیں گے، یا ایں ہمہ معدود ہونے کی وجہ سے وہ دن اپنی تعداد میں متعین ضرور ہیں، گو ابھی یہ تعیین مبہم ہے،

انگریزی داں اصحاب اس متعین تنکیر کے مفہوم کو انگریزی ترجمہ A certain number of Day. میں سمجھیں، کہ تنکیر کے باوجود اس کے اندر یہ بات موجود ہے، کہ وہ تعداد متعین ہے، گو ابھی معلوم نہیں،

کہ وہ تعداد کیا ہے؟

کیا قرآن میں مہینہ بھر کے روزہ کا حکم نہیں؟	قرآن پاک میں اس کے بعد روزہ کی چند آسانیوں کا ذکر کر کے ماہ رمضان کی اہمیت دکھا کر اس مہینہ کو

روزوں میں گذارنے کی تاکید اس طرح کی گئی ہے، جس سے وہ پہلا ابہام جاتا رہا، اور تعداد متعین ہوگئی، فرمایا:

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینات من الھدی والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ (بقرہ)

رمضان کا مہینہ وہ ہے، جس میں قرآن لوگوں کی رہنمائی اور حق و باطل کی تمیز کی روشن دلیلیں بنا کر اتارا گیا، تو جو کوئی اس مہینہ میں موجود رہے، تو چاہیے کہ وہ اس مہینہ بھر روزہ رکھے۔

بعض لوگوں کا فلیصمہ کا ترجمہ "اس مہینہ میں روزہ رکھے" کرنا ہمارے نادان دوست کی لغزش کا باعث ہوا ہے، اور اسی سے ان کو شبہ ہوا ہے، کہ رمضان میں چند روز بھی روزے رکھ لیں، تو یہ کہنا صحیح ہوگیا، کہ رمضان میں روزے رکھے، حالانکہ جن صاحبوں نے ایسا ترجمہ کیا ہے، انھوں نے حاشا یہ سمجھ کر نہیں کیا ہے، کہ بعد کے آنے والے ان کے الفاظ سے یہ غلط معنی سمجھیں گے، کیونکہ ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ نہیں آسکتا تھا، کہ اس سے کوئی رمضان کے چند دنوں کے روزے مراد لے گا۔

عربی میں قاعدہ یہ ہے، کہ فعل مستمر کا جو مفعول فیہ (ظرف زمانی مفعول) ہوتا ہے، وہ اپنے فعل کا اپنے ظرف زمانی میں پورا استیعاب چاہتا ہے، اور یہی وہ فرق ہے، جو مطلق ظرف جار زمانی اور ظرف زمانی مفعول میں امتیاز پیدا کرتا ہے، مثال کے لیے ان دو لفظوں پر غور کرو،

ظرف زمانی جار یقوم فی اللیل رات میں کھڑا ہوتا ہے

ظرف زمانی مفعول یقوم اللیل رات بھر کھڑا رہتا ہے،

اب اسی پر فعل صوم کو قیاس کرو،

ظرف زمانی جار فلیصم فی الشھر مہینہ میں روزہ رکھے

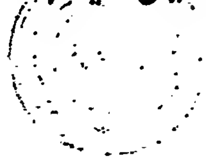
ظرف زمانی مفعول فلیصم الشھر مہینہ بھر روزہ رکھے

انگریزی خواں اس فرق کو ان دو ترجموں سے سمجھیں،

Fast in the same month

Fast the same month

ہر زبان کا ادا شناس اس فرق کو پوری طرح محسوس کرسکتا ہے، اب غور کیجئے، کہ قرآن میں روزہ کا حکم فی الشھر (مہینہ میں) کرکے نہیں ہے، بلکہ الشھر (مہینہ بھر) کرکے ہے، کیا اب بھی کسی کو اس میں شک ہوسکتا ہے، کہ قرآن میں مہینہ بھر کے روزے کا ذکر نہیں، قرآن نے انتیس ۲۹ اور تیس ۳۰ دنوں کے بجائے مہینہ کا لفظ اس لیے اختیار کیا، کہ قمری مہینہ میں دنوں کی تخصیص رویت ہلال کے بغیر نہیں ہوسکتی،



اس لیے مہینہ کا لفظ استعمال کیا، تاکہ بہترین اختصار کے ساتھ انتیس دنوں کا مہینہ ہو، یا تیس دنوں کا مہینہ ہو، ہر ایک پر مہینہ کا لفظ صادق آسکتا ہے،

اب کوئی بتائے، کہ ہم اس "فاضل اجل" کے فضل و کمال اور عقل و دانش کے خلاف کیونکر مظاہرہ کریں، جو کہتا ہے، کہ قرآن میں مہینہ بھر روزہ رکھنے کا حکم مذکور نہیں ہے۔

ہم نے اوپر جو قاعدہ بیان کیا ہے، گو زبان کا ہر ذوق شناس اس کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، تاہم مزید تشفی کے لیے ہم "ناقد بصیر" کو اصول فقہ میں بحث حروف جار پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں، مثلاً کشف الاسرار بزدوی جلد دوم ص ۱۰۵ قسطنطنیہ، التقریر والتحبیر علی البزدوی جلد دوم ص ۔۔ قسطنطنیہ والتوضیح والتلویح ص ۲۲۳، قسطنطنیہ: ان سب میں یہ مذکور ہے، کہ مفعول فیہ زمانی میں عموم واستیعاب واستغراق ہوتا ہے، نحو میں تھوڑی تفصیل مذکور ہے، جو حسب ذیل ہے،

ظرف الزمان علی ضربین، ما یصلح	ظرف زمان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو کتنے کے
جوابا لکم وھو ما یکون محدودًا	جواب میں آتی ہے، اور وہ گنا ہوا ہوتا ہے۔ عام
سواء کان معرفۃ او نکرۃ، فاذا	اس سے کہ وہ معرفہ ہو، یا نکرہ، تو جب ظرف
کان کذا استغرقہ الفعل الناصب	زمان ایسا ہو، تو وہ فعل جو اس ظرف کو نصب
لہ ان امکن کما اذا قیل لک کم سرت	دے رہا ہے، اگر ممکن ہوگا، تو اس پورے
فقلت شہرا، استغرق السیر جمیع الشہر	زمانہ کو محیط ہوگا، جیسے اگر۔ اگر تم سے کہا جائے

ليله ولها ... الا ان تقصد المبالغة — کہ تم کتنے دن چلے، تو تم نے جواب دیا، کہ

واليحوه وكذا اذا قلت شهر — "ایک مہینہ" تو تمہاری چال پورے مہینے کو

رمضان، فان لم يكن استغراق — محیط (؟) اور رات کے گھیرے گی، لیکن یہ کہ تم

الجميع استغراق ما امكن، كما تقول — (بطور واقعہ کے نہیں بلکہ) مبالغہ اور مجاز کے

ثم اتى جواب كم صمت اوكم سرت — طور پر پورا مہینہ کہہ دو، تو پہلا (یعنی روزہ)

فالاول يعم جميع ايامه والثاني — مہینہ کے دنوں سے متعلق ہوگا کہ روزے

جميع لياليه [illegible] — اسلام میں دن ہی میں رکھے جاتے ہیں)

[illegible] — اور دوسرا (یعنی چلنا) مہینہ کی راتوں سے مخصوص

(رضی جلد اول ص ۱۶۲) — ہوگا، (کہ عرب میں راتوں ہی کے چلنے کا رواج ہے)

اب غور سے قرآن پاک کی آیت مذکورہ پر ایک تامل کی نگاہ ڈالو، کہ وہ گنتی کے دنوں کو بتانے کے لیے ہے یا نہیں؟ اور وہ گنتی کے دنوں کی روزے کے جواب میں ہے، یا نہیں، اگر ایسا ہے، تو اس کا ترجمہ "رمضان بھر کا روزہ ہوگا" یا "رمضان میں روزہ" ظاہر ہے کہ مہینہ کے جتنے دن جو شخص پاتا جائے گا، اتنے دن بھر کا روزہ اس پر فرض ہوتا چلا جائے گا، اسی لیے فرضیت روزہ کے آغاز میں جس طرح قرآن نے:

اياماً معدودات — کچھ گنے ہوئے دنوں میں

کہا، اسی طرح آخر میں یہ کہا،

ولتكملوا العدة — اور تاکہ گنتی کو پورا کرو،

تو اگر سرے سے قرآن نے روزوں کی گنتی ہی مقرر نہیں کی، تو اس گنتی اور شمار پر اتنا زور ہی وہ کیوں دیتا، اس سے ثابت ہوا، کہ فلیصمہ کا ترجمہ یہ ہے، کہ "وہ اس مہینہ (رمضان) بھر روزہ رکھے" نہ یہ کہ اس مہینہ میں روزہ رکھے یا صرف روزہ رکھے۔

اب بحث یہ آئی کہ مہینہ بھر کے روزوں کا ذکر مان بھی لیا جائے، تو تیس اور انتس ۲۹ دنوں کے روزوں کا تو ذکر نہیں آیا؟ آپ اس اعتراض پر ہنستے ہوں گے کہ کیا کوئی اتنا بیوقوف بھی ہو سکتا ہے، جو مہینہ بھر اور تیس انتیس دنوں کو دو چیزیں سمجھتا ہے، تو ہم اپنے ناظرین کو تسکین دیں گے، کہ ہاں ہم کو خوش قسمتی سے ایسے ہی عقلمندوں سے واسطہ پڑا ہے اس لیے ہم کو ایسی حدیثیں نہیں، جن میں مہینہ بھر روزوں کا ذکر ہو، پیش کرنی ہیں، بلکہ ایسی حدیثیں پیش کرنی ہیں، جن میں تیس انتیس دنوں کے روزوں کا ذکر ہے، اور مجبوراً ہم کو اپنے "عقلمند حریف" کی خاطر یہ بھی کرگذرنا ہے، کیونکہ اس کا دعویٰ ہے، کہ ایسی کوئی حدیث اس کی نظر سے نہیں گذری جس میں انتیس یا تیس روزوں کا ذکر ہو،

تیس انتیس دنوں کے روزے حدیثوں میں | ۱۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے رمضان کا ذکر کیا، تو فرمایا روزہ رکھنا شروع نہ کرو، جب تک پہلی کا چاند (ہلال) نہ دیکھو، اور نہ روزہ ختم کرو، جب تک پہلی کا چاند نہ دیکھ لو، اور اگر بادل ہوں تو اندازہ کرلو۔ (بخاری، صوم)

اب ایک مہینہ کی پہلی کے چاند سے شروع ہوکر دوسرے مہینہ کی پہلی کے چاند پر رمضان کے روزے ختم نہ ہوئے، تو دوستو! حساب لگاکر، اپنے حریف دوست کو بتاؤ کہ کے روزے ہوئے۔

۲۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ مہینہ انتیس ۲۹ دنوں کا بھی ہوتا ہے، تو روزے نہ رکھو، یہاں تک کہ اس کو (پہلی کے چاند کو) دیکھو، تو اگر بادل چھائے ہوں تو گنتی تیس ۳۰ پوری کرلو۔ (بخاری، صوم)

دیکھ لیجیے کہ ابن عمرؓ کی روایت میں تیس ۳۰ روزوں کا ذکر ہے، یا نہیں،

۳۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب پہلی کا چاند (ہلال) دیکھو، تو روزہ شروع کرو، اور جب اس کو دیکھو تو روزہ ختم کرو، (مسلم، صوم)

حساب لگائیے، کہ ایک پہلی کے چاند سے دوسری پہلی کے چاند تک کے دن ہوتے ہیں، کبھی تیس ۳۰ اور کبھی انتیس ۲۹،

۴۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ پہلی کا چاند دیکھ کر روزہ شروع کرو، اور اس کو دیکھ کر ختم کرو، اور اگر ابر آجائے، تو تیس ۳۰ گنو۔ (مسلم، صوم)

۵۔ ایک تابعی امیر معاویہؓ کے زمانہ میں شام گئے، وہاں جمعہ کی رات کو چاند نکلا، اور آخر مہینہ میں وہ مدینہ آئے، تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان سے چاند کا حال پوچھا کہ تم نے کب دیکھا، انھوں نے کہا جمعہ کی رات کو، پوچھا کیا تم نے

خود دیکھا، کہا ہاں، میں نے بھی دیکھا، اور سب لوگوں نے دیکھا، اور سب نے روزہ رکھا، اور معاویہؓ نے بھی روزہ رکھا، ابن عباسؓ نے فرمایا ہم نے توسنیچر کی رات کو دیکھا تو ہم تو روزے رکھتے جائیں گے، یہاں تک کہ تیس ۳۰ پورے ہوجائیں، (مسلم صوم)

۶۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے سوا پورے مہینہ کا روزہ کبھی نہیں رکھا (بخاری صوم)

یعنی رمضان میں پورے مہینہ کا روزہ رکھتے تھے، (شہراً کاملاً)

۷۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مہینہ پورا روزہ نہیں رکھا، لیکن رمضان کا پورا مہینہ روزہ میں گذارتے تھے۔ (بخاری صوم)

استکمل شہر رمضان،

۸۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ آپ نے فرمایا پہلی کا چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور اسی کو دیکھ کر ختم کرو، اور اگر بادل چھا جائے تو تیس پورے کرو، (ترمذی صوم)

۹۔ عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں، کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تیس کے بجائے انتیس ۲۹ دن کے روزے رکھے، (ترمذی وابوداؤد، صوم)

۱۰۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے دنوں کے گننے میں بڑا اہتمام کرتے تھے، پھر اتنا ہی اہتمام رمضان کا چاند دیکھنے میں فرماتے تھے، تو اگر مطلع غبار آلود ہوتا تو تیس ۳۰ پورے کرتے۔ (ابوداؤد، صوم)

۱۱۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ آپ نے فرمایا کہ مہینہ سے ایک دو دن

پہلے روزہ نہ رکھو لیکن یہ کہ تمہاری عادت کے روزے کے دن ہوں اور رمضان کا روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ پہلی کا چاند دیکھ لو اور روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ اس کو دیکھ لو پھر اگر (شوال کی پہلی کے چاند کے) درمیان ابر حائل ہو جائے تو تیس کی گنتی پوری کرو، اور پھر روزہ نہ رکھو اور مہینہ انتیس ۲۹ کا بھی ہوتا ہے، (ابوداؤد، صوم)

۱۲۔ حذیفہ ابن یمانؓ صحابی سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مہینہ (رمضان) سے پہلے روزہ شروع نہ کرو یہاں تک کہ پہلی (رمضان) کا چاند دیکھو یا (شعبان کی) گنتی پوری کرو پھر روزہ رکھو اور روزہ نہ توڑو یہاں تک کہ پہلی (شوال) کا چاند دیکھو یا (رمضان کی) گنتی پوری کرو۔ (نسائی صوم)

۱۳۔ ربعی سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب پہلی کا چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب پھر اس کو دیکھو تو روزہ ختم کرو اور اگر ابر ہو تو شعبان کو تیس پورا کرو، لیکن یہ کہ پہلی کا چاند اس سے پہلے دیکھ لو، پھر رمضان کے تیس روزے رکھو لیکن یہ کہ اس سے پہلے ہی تم پہلی کا چاند دیکھ لو۔ (نسائی صوم)

ابھی حدیث کی اور بہت سی کتابیں باقی ہیں، استقصا مقصود نہیں صرف مضمون نگار کو یہ دکھانا تھا، کہ اس کا یہ کہنا کہ انتیس تیس روزوں کا ذکر، کتب حدیث میں اس کی نظر سے نہیں گذرا، کہاں تک سچ ہے؟ اور اگر سچ ہے، تو در حقیقت اس کی نظر سے حدیث کی کتابیں گذریں ہی نہیں،

چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش اس "محقق" نے ان حدیثوں کے اردو ترجموں کی کتابو

میں ہلال کا ترجمہ چاند دیکھ کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے، کہ رمضان کے آخری عشرہ میں چاند جب پچھلی پہر نکلے، تب اس چاند کو دیکھ کر، کھانا پینا، بند کرکے روزہ شروع کرنا چاہیے، مگر اس برخود غلط فاضل کو اپنی اس مضحکہ انگیز تحقیق پر بشرطیکہ ذرہ بھی عقل سلیم ہو، یہ سن کر خود ہنسی آئے گی، کہ ان حدیثوں میں سے کسی میں بھی چاند یعنی قمر کا لفظ نہیں، بلکہ ہلال کا لفظ ہے، جس کا اطلاق پہلی کے چاند پر یا زیادہ سے زیادہ تیسری تک کے سر شام کے چاند پر ہوتا ہے، پچھلی کے چاند پر نہیں، جو آخر شب میں پورا ہو کر نظر آتا ہے، اگر اس کے خلاف وہ لب کشائی کی ہمت کرتا ہے، تو حقیقت میں وہ فن لغت سے مذاق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس لیے ہمارے بازیگر محقق کا ان حدیثوں میں ہلال دیکھ کر روزہ رکھنے کا مطلب یہ سمجھنا کہ اکیسویں کی شب کو پچھلی کا چاند دیکھ کر روزہ شروع کیا جائے، جہالت نہیں جنون ہے،

اصل میں روزہ رکھنے سے مقصود ماہ صیام کے روزوں کا آغاز کرنا ہے، اگر وہ یہ سمجھ سکتا، تو اس کو اس مضحکہ انگیز غلطی میں مبتلا نہ ہونا پڑتا، کہ پچھلی پہر اٹھ کر، چاند جس وقت دیکھو، روزہ شروع کر دو۔

ان حدیثوں کے اردو ترجموں میں بعد کا ٹکڑا یہ ہے، کہ اور چاند دیکھ کر افطار کرو" یہ بیچارہ عراقی عربی کا حرف شناس افطار کے ایک ہی معنی جانتا تھا، کہ "دن بھر کا روزہ توڑنا"، اب اس کو یہ دقت پیش آئی، کہ روزہ تو بہرحال آغاز شب میں توڑا جائے گا،

مگر قمری مہینہ کے آخری عشرہ کی ابتدائی راتوں میں تو کوئی چاند ہی سرے سے نظر نہیں آتا، تو اس کو مجبوراً یہ مشکل یوں حل کرنی پڑی، کہ اس حدیث میں جو اس کے علم میں صرف ابوہریرہؓ سے منقول ہے، غلطی ہوئی ہے، ان کو چاند کی جگہ ستارہ کہنا چاہیے تھا، مگر جناب والا! یہ غلطی ایک ابوہریرہؓ ہی سے نہیں ہوئی ہے، بلکہ کم سے کم دس بارہ صحابیوں سے ہوئی ہے، کیا ایسی متفقہ غلطی آج تک کسی نے سنی ہے؟ تمام صحابہ نے بالاتفاق ہلال کا لفظ استعمال کیا ہے، چاند (قمر) کا نہیں، ستاروں (نجوم) کا نہیں، اب کون بیوقوف کہہ سکتا ہے کہ نعوذ باللہ یہ صحابہؓ ایسے کم عقل اور یہ اہل زبان ایسے نادان تھے، کہ ہلال (پہلی کے چاند) اور مطلق چاند اور ستاروں میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے تھے۔ اور ایسے عملی حسی مشاہدہ میں جو ہر سال انتیس تیس دن اُن کے سامنے گذرتا تھا، (بلکہ نوافل صیام کو ملا کر تعداد اور زیادہ بڑھ جائے گی) مگر پھر بھی اس کے بیان کرنے میں ایسی فاش غلطی کرتے تھے، کہ ستارہ کی جگہ اُن میں ہر شخص غلطی سے چاند ہی نہیں بلکہ ہلال بول دیتا تھا، اور اسی پر عمل کر دیتا تھا،

درحقیقت اس عراقی عربی کے حرف شناس سے جس طرح ہلال دیکھ کر، روزہ شروع کرنے کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی، ویسی ہی ہلال دیکھ کر، روزہ ختم کرنے کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی، اور بالآخر اس کو اس دلدل میں پھنسنا پڑا، افطار جس طرح ہر دن روزے توڑنے کو کہتے ہیں، اسی طرح پورے ماہِ صیام کے روزہ کے ختم کرنے کو بھی کہتے ہیں، اسی لیے روزوں کے بعد کی عید کو عید الفطر کہتے ہیں، یعنی "روزہ ختم کرنے کی خوشی کا دن"،

ان حدیثوں میں ہلال (پہلی کا چاند) دیکھ کر روزہ ختم کرنے کا جو بیان ہے اس سے مقصود ماہ صیام کو ختم کرنے کے ہیں،

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ پہلی کا چاند (یکم رمضان کی شب کا چاند) دیکھ کر رمضان کے روزے صبح سے شروع کرو، اور پھر دوسری پہلی (یعنی یکم شوال کی رات) کا چاند دیکھ کر رمضان کے روزے ختم کرو،

اگر مضمون نگار کی عقل کے مطابق، ان حدیثوں کا مطلب یہ سمجھا جائے، کہ ہر روز کے روزہ کو ہلال دیکھ کر شروع اور ہلال دیکھ کر ختم کرو، تو قباحت یہ لازم آئے گی، کہ اس محقق کو اواخر رمضان کے بجائے جیسا کہ وہ ثابت کرنا چاہتا ہے صرف پہلی یا حد سے حد دوسری اور تیسری رمضان کے روزے ماننے پڑیں گے، جن میں ہلال (نیا چاند) نظر آسکتا ہے، مگر اس پر بھی ان دنوں میں ہلال دیکھ کر روزہ توڑنے کا مطلب تو بن سکتا ہے، مگر ہلال دیکھ کر روزہ رکھنے کا مطلب تو بدرستی ہوش و حواس قیامت تک نہیں بن سکتا، الا یہ کہ کوئی ہمارے محقق کی طرح ہلال کے معنی ستاروں کے سمجھے، یا اس پورے چاند کے سمجھے، جو قمری مہینوں کی آخری راتوں میں نکلا کرتا ہے، مگر ایسا سمجھنا کیا عقل و ہوش اور علم و دانش سے محرومی کا اعلان نہیں ہے؟

پھر اس جہالت کا نام کس طرح کیا جائے، کہ ایسی بے بنیاد اور حد درجہ نادانی اور کم علمی کی باتیں کہی جاتی ہیں، اور ان کا نام تحقیقات بلکہ مرعوب کن لفظ

محدثِ پُر تھیسس" رکھا جاتا ہے، اور اردو کے ایک ایسے پرچہ میں جو علم کی خدمت کا بھی مدعی ہے، شائع ہوتا ہے، اور مذہب کو عقل و دانش کے معیار پر پرکھنے والے نوجوان اس کو پڑھتے ہیں، اور پسند کرتے ہیں، ہم نہیں جانتے کہ اس حادثہ، علمی پر اس "مجنون محقق" کا ماتم کریں، یا اپنے زود فریب نوجوانوں کا، جو ہر فضول گو کو محقق، اور ہر مشکل نویس کو فلسفی اور ہر پریشان نگار کو انشاء پرداز سمجھتے ہیں، اور سر نیاز جھکا دیتے ہیں۔

تواترِ عمل کا انکار حماقت ہے۔

جو بات ہم کو سب سے پہلے کہنی چاہیے تھی، وہ آخر میں کہتے ہیں، آج اسلام کے عملیات کی تحقیق کی جا رہی ہے، کہ وہ کہاں تک اصولِ اسلام سے ثابت ہیں، اور اس تحقیق میں یہ بھلا دیا جاتا ہے، کہ اسلام تخیلی نہیں، بلکہ سرتاپا عملی مذہب ہے، جس دن سے نماز پنجگانہ کا حکم ہوا ہے، اس دن سے لیکر آج تک نماز پنجگانہ اسی طرح اور انہی اوقات میں پڑھی جا رہی ہے، جن میں اس دن پڑھی گئی، جب اس کا حکم پہلے دن نازل ہوا، علیٰ ہذا رمضان کے روزے اسی طرح اور انہی دنوں میں رکھے جاتے ہیں، جس طرح اس سال رکھے گئے، جس سال یہ حکم نازل ہوا، اس وقت سے لے کر، آج تک تیرہ صدیاں اس حکم پر اس طرح گذریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی عہد حیات سے لے کر خلفائے راشدین کے زمانہ خلافت تک اور پھر تابعین و تبع تابعین سے لے کر، اس ۱۳۵۰ھ کے رمضان تک، ہر ملک، ہر شہر، ہر قریہ کے مسلمانوں نے اور مسلمانوں کے ہر فرقہ نے

بلا اختلاف رمضان کے پورے ماہ کے روزوں کی فرضیت کو سمجھا؛ اور عمل کیا،
اب آج کسی گوشہ سے ایک گمنام اٹھتا ہے، اور "بڑی تحقیق" کے بعد کہتا ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی غلطی میں مبتلا رہے، خلفا بھی غلط سمجھے؛ عام صحابہؓ
بھی حقیقت سے ناواقف رہے، ائمہ مجتہدین، محدثین، فقہا، علما بھی سارے
کے سارے دھوکے میں رہے، اور تمام مسلمان بھی اب تک اس نادانی میں مبتلا
رہے، اور ہیں، اور تیرہ سو صدیاں اسی نادانی اور جہالت میں گذر گئیں، اور اب
اس حکم کی اصل حقیقت عراق کے جنگی سفر میں، ایک نومسلم عیسائی پادری کی
باہمی ملاقاتوں میں مجھ پر منکشف ہوئی، تو ایسے گمراہ کو صرف گمراہ کہنے پر قناعت کرنا
لغت کی بے بسی کا اظہار ہے،

سیرۃ نبوی ؐ کی تدلیس | مضمون نگار نے ہماری سیرۃ نبوی ؐ جلد دوم کے حوالہ سے
لکھا ہے، کہ مولانا شبلی مرحوم نے بھی لکھا ہے کہ "اصل میں تین ہی روزے فرض تھے"
مگر مدعی کے فریب کا حال اسی سیرت کی اصل عبارت سے معلوم ہو سکتا
ہے۔

"اہل عرب روزہ کے بہت کم خوگر تھے، اول اول روزہ ان پر شاق ہوا، اس لیے
نہایت تدریج کے ساتھ روزہ کی تکمیل کی گئی، اول اول آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے، تو سال میں تین روزے رکھنے کا حکم دیا، پھر
روزے کی فرضیت نازل ہوئی، تو یہ اختیار رہا کہ جو شخص چاہے، روزہ رکھے،

اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلادے، رفتہ رفتہ جب لوگ روزے کے خوگر ہو چلے، تو یہ آیت اتری،

فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ (بقرہ) — جو رمضان کا مہینہ پائے وہ ضرور اس کو روزہ رکھے۔

اب بالتعیین روزہ فرض ہوگیا، اور فدیہ کی اجازت جاتی رہی، ہر شخص سمجھ سکتا ہے، کہ سال میں تین روزوں کے رکھنے کا حکم رمضان کے روزوں سے قبل کا بیان ہے، رمضان کے روزوں سے اس تعداد کا کوئی تعلق نہیں،

ع جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت سے خدا سمجھے

(معارف جنوری ۱۹۳۲ء)

لفظ صلوٰۃ قرآن شریف میں

ہم نے اگست کے شذرات میں "غیر مذہبی عربی تعلیم" کے فتنہ سے مسلمانوں کو ہشیار کیا تھا، آج اس کی متعدد پیش نظر مثالوں میں سے ایک مثال آپ کے سامنے ہے، مولوی نعیم الرحمن صاحب ایم، اے لکچرار عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی، عربی کے لائق گریجویٹ ہیں، عربی سے بعض تاریخی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں، اب حال میں آپ نے مسئلہ "صلوٰۃ" کے متعلق داد تحقیق دی ہے، نماز کا بعض لوگوں پر سخت ہونا، خود قرآن شریف کی شہادت ہے اب اس کی سختی کو کم کرنے کے لیے مختلف تجویزیں سوچی جارہی ہیں، بعض اصحاب تو نماز کے اوقات کو کم کرنا چاہتے ہیں بعض رکعات کی تخفیف کے خواستگار ہیں، بعض ارکان کی تقلیل کے خواہش مند ہیں، اور ان سب کا استدلال قرآن پاک سے ہے،

یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا۔

مولانا نعیم الرحمن صاحب ایم، اے کی رائے ہے کہ نماز کی مخصوص صورت صرف مسجدوں میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کے لیے ہے، علیحدہ اور منفرد اشخاص کے لیے یہ مخصوص صورت واجب نہیں، بلکہ محض دل سے "یاد خدا کر لینا" کافی ہے، کاش یہ بھی ہوتا،

سو نچنے کی بات یہ ہے کہ یہ گمراہیاں اور غلطیاں کیوں پیش آرہی ہیں، اس لیے آرہی ہیں، کہ کتاب کے ساتھ "سنت"، کو نہیں لیا جاتا، یہی غلطی گذشتہ معتزلہ نے بھی کی، اور اب موجودہ معتزلہ بھی کر رہے ہیں، تاہم گذشتہ معتزلہ اس قدر دلیر نہ تھے، کہ وہ سنتِ متواترہ اور عمل متواتر کی تغلیط یا تکذیب کریں، مگر اب دنیا اس دقیانوسی زمانہ سے علم وفہم میں بہت کچھ ترقی کرچکی ہے،

سوال یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف الفاظِ قرآنی القا ہوئے، یا ان کے معانی بھی القا ہوئے، اگر پہلی صورت ہے، تو نعوذ باللہ اس عہد کے اصحابِ علم خود حاملِ وحیؐ سے زیادہ عالم بلکہ پیغمبر بننے کے مستحق ہیں، اور اگر دوسری صورت ہے، تو حاملِ وحیؐ نے ان معانی کی تعلیم اپنے پیرووں کو دی ہے یا نہیں، اگر نہیں دی تو،

بلّغ ما انزل الیک — جو تجھ پر اتارا گیا، اس کو دوسروں تک پہونچاؤ۔

کا فریضہ کیوں کر ادا ہوا، اور

یعلمھم الکتاب — وہ قرآن ان امیوں کو سکھاتے ہیں،

کس کی شان میں ہوگا، اور

لتبینہ — تاکہ تم لوگوں کے لیے اس کی تشریح کردو،

کا کس کو حکم ہوگا،

اور اگر آپ نے اس کے معانی ومطالب اور تشریحات اپنے پیرووں کو بتائے،

تو وہ کیا ہوئے، اور کہاں ہیں، اور کیونکر مٹ گئے، اور کب مٹ گئے، اور وانا لہ لحافظون [illegible] ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے کا وعدہ کیا ہوا، یہ حفاظت لفظی، معنوی، اور تشریحی ہر حیثیت سے تھی، اب اس تسلیم سے چارہ نہیں، کہ وہ عملی حیثیت سے بتواتر عمل اہلِ اسلام اور علمی حیثیت سے صحائفِ سنت اور کتبِ حدیث میں موجود ہیں، ان صحائف وکتبِ احادیث ودرایات پر اصولاً بحث کرنے کی گنجائش ہر وقت حاصل ہے، مگر ان سے قطع نظر کرنا کسی طرح ممکن نہیں، بنا بریں قرآن پاک کی کسی آیتِ کریمہ کی تفسیر وتشریح کرتے وقت الفاظ اگر کئی معنی کو محتمل ہوں تو عمل تواتر اور روایت صحیح یہی دو چیزیں ہیں، جو ان کے اصلی معنی کی تعیین کریں گی، اگر یہ سررشتہ ہاتھ میں نہ ہو، تو پھر صحت وخطا کا معیار کیا رہ جائے گا،

اس مختصر تمہید کے بعد عرض ہے کہ قرآن پاک میں "اقامتِ صلوٰۃ" (نماز کھڑی کرنے کا) جو صحیح مفہوم ہے، اس کو ہمارے دوست مولوی زبید احمد صاحب نے نہایت خوبی سے لکھا ہے، اور بیان کیا ہے، لیکن وہی ایک آیت اُن کے استقصاء سے رہ گئی ہے، جو میری تحقیق میں اقامت صلوٰۃ کے مفہوم کو بالکل روشن کر دیتی ہے، اور کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں چھوڑتی ہے، ہمارے مکرم پروفیسر نعیم الرحمن صاحب سے بخلوص عرض ہے کہ وہ بھی اس پر غور فرمائیں،

اقامتِ "صلوٰۃ" سے مطلق نماز کے معنی مقصود ہیں، خواہ وہ مسجد میں ہو،

یا غیر مسجد میں، یا ضرور ہے کہ اس کے معنی "مسجد میں نماز باجماعت" کے ہوں، یہ اگر دوسرے معنی مراد ہیں، تو چاہیے کہ غیر مسجد میں نماز باجماعت نہ ہو سکے، جس طرح غیر گرجا میں عیسائیوں کی نماز اور غیر بت خانہ میں بت پرستوں کی پوجا اور غیر آتشکدہ میں پارسیوں کی عبادت نہیں ہوسکتی؟ کیا ایسا کہنا اصول اسلام کا براہ راست تمسخر نہیں ہے، اور اگر صرف نماز مراد ہے، خواہ وہ کہیں ہو تو پھر "صلوٰۃ" بمعنی مسجد کی مناسبت "اقامت صلوٰۃ" میں کیا رہ جاتی ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کے معنی صرف "نماز باجماعت" کے ہیں، خواہ وہ مسجد میں ہو یا غیر مسجد میں، تو پھر اقامت صلوٰۃ کے معنی "اقامت مسجد" کے نہیں، بلکہ "اقامت جماعت" کے لینے ہوں گے اور صلوٰۃ بمعنی مسجد نہیں، بلکہ بمعنی جماعت ہوگا، کیا آرامی یا عبرانی زبان میں "صلوٰۃ" جماعت کے معنی میں کہیں آیا ہے، جس آیت کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، وہ حسب ذیل ہے:

واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ	اور جب اے رسول! تو ان (مسلمان مجاہدین)
فلتقم طائفۃ منھم معک	میں ہو، اور ان کے لیے نماز کو کھڑی کرے، تو
ولیاخذوا اسلحتھم، فاذا سجدوا	ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو، اور اپنے ہتھیار
فلیکونوا من ورائکم ولتات	کو لیے رہے، اور جب وہ سجدہ کرے، تو تم لوگوں
طائفۃ اخری لم یصلوا فلیصلوا	کے پیچھے ہو جائے اور دوسرا گروہ جس نے نماز
معک۔	نہیں پڑھی وہ آئے اور تیرے ساتھ نماز پڑھے،
فاذا قضیتم الصلوٰۃ فاذکروا اللہ	پھر جب تم نماز ختم کر چکو تو اللہ کو کھڑے

قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبکم فاذا اطمانَنتم فاقیموا الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً۔ (نساء)

بیٹھے سوتے یاد کرو، اور جب تم کو اطمینان ہو جائے، تو نماز کھڑی کرو، بے شک نماز مسلمانوں پر مقررہ وقتوں پر فرض ہے،

آیت کے ابتدائی حصہ میں "اقامت صلوٰۃ" کا حکم ہے، یہ میدان جنگ کا واقعہ ہے، دشمن باقاعدہ نماز کا موقع نہیں دے رہا ہے، اب بتایئے کیا یہاں اس میدان جنگ میں نماز چھوڑ کر مسجد کی تعمیر کا حکم ہے، یا میدان جنگ چھوڑ کر مسجد میں جاکر پہلے دوڑ کر نماز پڑھ آنے کا حکم ہے یا محض نماز باجماعت کا حکم ہے، آگے چلیے، ایک ایک رکعت نماز پڑھ لینے کے بعد دوسری رکعت کے متعلق حکم ہے، کہ پھر علیحدہ علیحدہ اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جس طرح موقع ملے یاد الٰہی کر لو، پھر جب اطمینان ہو تو نماز کھڑی کرو، اطمینان کے بعد ہی یعنی اسی سفر میں میدان جنگ کے اندر اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا گیا، اب یہاں مسجد کہاں سے آئی، کیا ہر صحرا اور جنگل اور پہاڑ اور سمندر میں جہاں جہاں مسلمان فوج جائے، ہر منزل میں، دن میں پانچ وقت مسجد بنائی جائے، اور نماز پڑھی جائے،

حافظوا علی الصلوٰات والصلوٰۃ الوسطیٰ۔

سب نمازوں کی نگہداشت کرو، اور خصوصاً بیچ کی نماز کی،

اس آیت پاک کا ترجمہ آپ یہ کرتے ہیں کہ "تمام مسجدوں کی حفاظت کرو اور خصوصاً بیچ کی یعنی مرکزی مسجد (خانہ کعبہ) کی، بہت خوب! لیکن آیت اتنی ہی تو

نہیں ہے، بلکہ پوری آیت یوں ہے،

حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ	سب نمازوں کی نگہداشت کرو، خصوصاً
الوسطٰی وقوموا للہ قانتین	بیچ کی نماز کی (یعنی عصر کی نماز) اور خدا کے
فان خفتم فرجالاً اورکبانا فاذا	سامنے خضوع و خشوع کے ساتھ کھڑے
امنتم فاذکروا اللہ کما علمکم مالم	ہو، پھر اگر کوئی ڈر ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر،
تکونوا تعلمون،	(جس طرح ہو سکے) اور جب ڈر جاتا رہے، تو
	اس طرح خدا کو یاد کرو، جس طرح تم کو اس نے
(بقرہ ۳۲)	بتایا جو تم نہیں جانتے تھے،

اگر آپ کا ترجمہ اختیار کیا جائے، تو معنی یہ ہوں گے،

"سب مسجدوں کی حفاظت کرو، خصوصاً مرکزی مسجد کی، اور خدا کے سامنے خضوع اور خشوع کے ساتھ کھڑے ہوں، اگر ڈر ہو تو پیادہ اور سوار، (جس طرح ہو سکے) اور جب خوف جاتا رہے، تو اس طرح خدا کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا جو نہیں جانتے تھے۔"

اس حالت میں اول آیت (حفاظت مسجد) کا آیت کے بعد کے حصوں سے کیا تعلق رہے گا، یعنی یہ کہ "اول تو کوشش کرو کہ مسجدوں میں جاکر، خصوصاً خانہ کعبہ میں جاکر، نماز باجماعت ادا کرو، اور اگر اس ارادہ کی تکمیل میں جان کا خوف ہو تو خیر پیادہ ہوکر، اور اگر اس میں ڈر ہو تو سوار ہی ہوکر نماز پڑھ لو، اور جب ڈر جاتا رہے،

توپھر اسی طرح پڑھو، جس طرح خدا نے بتایا ہے، یہ سفر اور جنگ کا حکم ہے، جیسا کہ "خوف" اور "امن" کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں، اس کا تعلق مسجد کی نماز باجماعت سے نہیں، بلکہ نماز کی شکل وصورت یعنی ارکان سے ہے، یہ آیت غزوۂ خندق کے موقع کی ہے، جب صحابہؓ کی اور خود حضور سرورکائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عصر کی نماز قضا ہوگئی تھی، اسی لیے اس نماز عصر کا خاص طور سے ذکر ہے، مطلب تو یہ ہے کہ نماز ہر حال میں ادا کی جائے، خواہ صلح ہو یا جنگ، امن ہو یا خوف، اگر حالتِ جنگ ہو یا میدانِ جنگ میں دشمن کے حملہ کا خوف ہو تو پیادہ ہوکر پڑھو، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو سواری پر پڑھو، پھر جب یہ حالت جاتی رہے، تو جس طرح نماز کا طریقہ تم کو بتایا گیا ہے، اس طرح پڑھو۔

اس کے سوا دوسرے معنی ہو نہیں سکتے، جنگ میں پیادہ ہوکر پڑھنے یا سوار ہوکر پڑھنے کی اجازت دینا اور بحالتِ امن اس طرح نماز پڑھنے کا حکم دینا جس طرح اس نے (یعنی خدا نے بتایا)، نماز کی صورت وشکل اور ارکان سے اس کا تعلق ہوگا، "مسجدوں کی نماز باجماعت" سے نہیں، چونکہ ہمارے دوست مولوی زبید احمد صاحب نے بتفصیل اس رائے کی تغلیط کی ہے، اس لیے مجھے زیادہ کہنے کی حاجت نہیں، صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں، جو مطلب قرآن پاک کی آیتوں کا ہمارے مکرم پروفیسر نعیم الرحمٰن لینا چاہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، نے وہی سمجھا کہ نہیں، اگر نہیں سمجھا تو ہی مطلب ہوا کہ حالِ وحی اور

اس کے پیر و خدا کے مراد و مفہوم سے واقف نہ ہوئے اور بالآخر یہ عقدہ کشائی چودہ سو برس کے بعد ایک عجمی نے کی، اور اگر واقف تھے، تو کیا تمام عمر میں ایک دن بھی، ایک دن کے پانچ وقتوں میں سے ایک وقت بھی ہزاروں صحابہ میں سے کسی ایک نے بھی اس پر عمل کیا۔

مولوی زبید احمد صاحب اپنے دلائل کا ترکش خالی کرنے کے لیے گھبرا رہے ہوں گے، اس لیے میں زیادہ ان کو رد کرنا نہیں چاہتا، ناظرین ذرا ان کی تیراندازی کی داد دیں، یہ مولویوں مولویوں کی لڑائی نہیں، گریجویٹ گریجویٹ کی جنگ ہے، اس لیے براہ عنایت "مولوی صاحبان" اپنی تکفیر و تفسیق کے بانسے الگ رکھیں، وہ اس میں دخل نہ دیں۔

(معارف اکتوبر ۱۹۲۷ء)

خلیل اللہ کی بشریت

حضرات انبیائے کرامؑ کے اوصافِ غالبہ

انبیاءؑ کے اوصاف کمالی

"خلیل اللہ" کے لغوی معنی "خدا کے دوست" کے ہیں، اور یہ حضرت ابراہیمؑ کا لقب ہے، لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں، کہ دوسرے انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کے دوست نہ تھے، کیا کوئی پیغمبر ایسا بھی ہوسکتا ہے، جو خدا کا دوست نہ ہو، پھر صرف حضرت ابراہیمؑ ہی خلیل اللہ کیوں ہوں،

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب کلیم اللہ مشہور ہے، جس کے معنی ہیں "خدا سے باتیں کرنے والا" "جس نے خدا سے باتیں کیں" لیکن کیا کوئی پیغمبر ایسا بھی ہے، جس سے خدا نے کسی نہ کسی طرح باتیں نہ کی ہوں، پھر حضرت موسیٰؑ ہی کلیم اللہ کیوں کہلائیں،

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کہتے ہیں، حالانکہ تمام انبیاءؑ اور نہ صرف انبیاءؑ بلکہ ہر انسان کی روح خدا ہی کی روح ہے، پھر حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کیوں کہیے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ تخصیص شاہد و مبشر و نذیر و داعی الی اللہ و سراج منیر کہے تو ایسا کہنا کیونکر درست ہوگا، درانحالیکہ

ہر نبی شہادت دینے والا، نیکو کاروں کو بشارت سنانے والا، گنہگاروں کو تنبیہ کرنے والا، خدا کی طرف پکارنے والا، اور روشنی بخشنے والا، چراغ بن کر آیا،

عام لوگوں کو یہ شبہ اس لیے پیش آتا ہے، کہ وہ زبان کے ایک نکتہ سے پہلو تہی کرتے ہیں، وہ نکتہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے صرف اسی وصف سے ملقّب کیا جاتا ہے، جو وصف اس میں بمرتبۂ کمال ہوتا ہے، باتیں ہر شخص کرتا ہے، اس لیے لغت کے لحاظ سے ہر شخص ابوالکلام ہے، مگر استعمال میں ابوالکلام اسی کو کہیں گے جس میں کلام کی خوبی و برجستگی یا طول بوجہ کمال ہو،

آنکھیں اور ہاتھ کس انسان کے پاس نہیں، اس لیے اولی الایدی والابصار (ہاتھوں اور آنکھوں والے) سبھی ہیں، مگر قرآن پاک نے اس کو خاص طور سے انبیائے کرام کا وصف قرار دیا، اور فرمایا،

واذکر عبادنا ابراھیم واسحاق ویعقوب اولی الایدی والابصار، (ص ۴)	اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو، جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے۔

ہاتھ عمل کے لیے اور بصارت علم کے لیے ہے، اس سے مقصود انسان کی عملی اور علمی قوتوں کا کمال ہے، چونکہ حضرات انبیاءؑ کی عملی اور علمی دونوں قوتیں مرتبۂ کمال پر ہوتی ہیں، اس لیے تمام انسانی طبقوں میں "اولی الایدی والابصار" (ہاتھوں اور آنکھوں والے) کے لقب کے وہی مستحق قرار پائے،

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء علیہم السلام کو مختلف اوصاف

کاملہ سے یاد فرمایا، حضرت ابراہیمؑ کی نسبت فرمایا:

واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً (نساء ۱۸) اور خدا نے ابراہیمؑ کو دوست بنایا،

حضرت موسیٰؑ کی نسبت ارشاد ہوا،

وکلّم اللہ موسیٰ تکلیما (نساء ۲۳) اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے بہت سی باتیں کیں،

حضرت اسماعیلؑ کو فرمایا،

انہ کان صادق الوعد (مریم ۴) اسماعیل وعدہ کے سچے تھے،

حضرت ایوبؑ کے متعلق ارشاد باری ہے،

وانا وجدناہ صابراً (ص) ہم نے اس کو صابر پایا،

غور کیجیے کہ انبیاءؑ میں کون نہیں جس سے خدا نے دوستی نہیں کی، یا خدا نے اس سے باتیں نہ کیں، یا وہ وعدہ کا سچا نہ تھا، یا حق کی راہ میں وہ صابر نہ ٹھہرا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دوستی کے وصف سے صرف حضرت ابراہیمؑ کو ہم کلامی کے وصف سے صرف حضرت موسیٰؑ کو، صدقِ وعدہ کے وصف سے صرف حضرت اسماعیلؑ کو، اور صبر کے وصف سے صرف حضرت ایوبؑ کو ممتاز فرمایا، حالانکہ خود قرآن کہتا ہے کہ

واصبر کما صبر اولوالعزم من الرسل - (احقاف - ۵) (اے رسول) آپ بھی ویسے ہی صبر کیجیے جیسے ہمت والے رسولوں نے کیا ہے۔

مگر اس عموم کے باوجود تمام انبیاءؑ میں سے مخصوص طور پر صرف حضرت ایوبؑ ہی کو

صابر کہہ کر یاد فرمایا گیا، جس کے یہ معنی نہیں، کہ نعوذ باللہ دوسرے انبیاؑ اس صبر کے وصف سے معرا تھے،

بات یہ ہے کہ گو ہر شخص کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کی استعدادیں ملتی ہیں، مگر ان میں سے ایک ہی دو استعدادوں کا کمال نصیب ہوتا ہے، باقی استعدادوں کی فعلیت زمانہ کے اقتضا، حالات کی مناسبت، وقت کی ضرورت اور پیش آمدہ واقعات کے مطالبہ کی بنا پر ہوتی ہے، جہاد کا حکم ہر پیغمبر کو ہوا مگر ہر ایک کی زندگی میں اس کے مناسب حالات پیش نہیں آئے، اس لیے حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگیوں میں جہاد کے جو مناظر پیش آئے، وہ دوسرے پیغمبروں کو پیش نہیں آئے،

غرض کسی شخص میں کسی وصف کا موجود ہونا اور بات ہے، اور اس وصف کے عملی ظہور کے مواقع پیش آنا، اور ان کے مطابق اس وصف کا مرتبۂ کمال ظاہر ہونا اور بات ہے، انبیاؑ کا کسی وصف خاص سے ملقب و ممتاز ہونا پہلے اوصاف کی بنا پر نہیں بلکہ دوسرے اوصاف کی بنا پر ہوتا ہے، اسی لیے حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ حضرت عیسیٰ روح اللہؑ، حضرت اسماعیل صادق الوعد اور حضرت ایوبؑ صابر ٹھہرے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ نے نسلاً بعد نسلٍ دوستی کا جو وعدہ فرمایا اور جس کی علامت کے طور پر ان کی اولاد در اولاد کو نبوت و برکت سے سرفراز فرمایا، یہ دوستی کا کمال کسی اور نبی کو عنایت نہیں ہوا، حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر جس طرح ہم کلامی کا شرف بخشا گیا

وہ کسی اور نبی کے حصہ میں نہیں آیا، حضرت عیسیٰؑ کو روحِ الٰہی کا فیضان جس کمال کے ساتھ ملا، وہ کسی اور نبی کو نہیں دیا گیا، چنانچہ فرمایا،

تلک الرسل فضّلنا بعضھم علیٰ بعض منھم من کلّم اللّٰہ ورفع بعضھم درجات وآتینا عیسی ابن مریم البینٰت وایدناہ بروح القدس، (بقرہ-۳۳)	یہ پیغمبران میں سے بعض کو بعض پر ہم نے برتری دی، ان میں سے کوئی تو ایسے ہیں جن سے خود اللہ تعالیٰ نے کلام کیا، اور بعض کے درجے بلند کیے، اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کی،

اس آیت پاک میں تین پیغمبروں کا وصف امتیاز بیان کیا گیا، پہلے حضرت موسیٰؑ کا کہ ان کو کلیمیت ملی، اور سب سے آخر میں حضرت عیسیٰ کا کہ ان کو معجزات اور روح القدس کی تائید بخشی گئی، اور دونوں کے بیچ میں ایک پیغمبر کا ذکر آتا ہے، جس کو درجوں اور مرتبوں کی بلندی ملی، یہ بیچ کے پیغمبر ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کی شریعت وسطا اور صراطِ مستقیم اور موسویت اور عیسویت کے بیچ میں معتدل ہے، اس لیے آپ کا ذکر بھی ان دونوں کے بیچ میں ہے،

ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درجوں اور مرتبوں کی جو بلندی ملی، اس کی تفصیل اور تشریح جتنی بھی کی جائے، کم ہے، اور قرآن پاک میں جا بجا اس کی تشریح ہے، منجملہ اس کے ایک یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کلیمیت اور حضرت عیسیٰؑ کو تائید بروح القدس کی جو فضیلت عطا ہوئی، وہ شخصی فضیلتیں ہیں، اور ہمارے رسول کو

جن درجوں اور مرتبوں کی فضیلت عطا ہوئی، وہ شخصی کے علاوہ دینی و عمومی ہیں،
آپ کو جو بالذات فضیلت بھی عطا کی گئی، مثلاً خاتمیت، وہ بھی آپ کی کتاب،
آپ کی شریعت اور آپ کی امت کو مشتمل ہے، آپ کے دین کو عموم بخشا گیا،
آپ کو نبی الامم اور نبی الانبیاء دونوں بنایا گیا، آپ کے دین پر دین الٰہی کے
ہر گوشہ کی تکمیل کی گئی، آپ کی کتاب کو خاتم الکتب، اور ناسخ الکتب بتایا گیا،
اور قیامت تک کے لیے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا، اور آپ کی امت
کو آخر الامم کا لقب ملا، ع

ہر چند وصفت می کنم لیکن ازاں بالاتری

باایں ہمہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے
ہم کلامی کا شرف نہیں بخشا یا روح القدس کی تائید عطا نہیں ہوئی، یہ دونوں باتیں
آپ کو بھی ملیں، لیکن یہ باتیں آپ کا وصف امتیازی نہیں بتائی گئیں، بلکہ اور
دوسری دوسری باتوں کو آپ کا وصفِ امتیازی ٹھہرایا گیا، مثلاً فرمایا۔

انا ارسلناک شاھداً ومبشراً ونذیراً۔ (فتح۔۱)	ہم نے تجھکو گواہ اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا،
یا ایھا النبی انا ارسلنٰک شاھداً ومبشراً ونذیراً وداعیاً الی اللّٰہ باذنہ وسراجاً منیراً۔ (احزاب۔۶)	اے پیغمبر! ہم نے تجھکو گواہ اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور خدا کی طرف سے پکارنے والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا

یہ آپ کے منجملہ دیگر امتیازی صفات کے چند امتیازی صفات ہیں، جن کا یہ منشا نہیں، کہ ان صفات سے دیگر انبیاء علیہم السلام خالی تھے، بلکہ یہ ہے کہ ان اوصاف کمالیہ کا یہ اجتماع ان کی ذات میں اس درجۂ کمال میں نہ تھا، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں تھا، چنانچہ پورے قرآن میں کسی خاص پیغمبر کے یہ اوصاف بہ تخصیص نام لے کر سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں قرار دیے گئے، کیونکہ مقام مدح میں وہی اوصاف بیان کیے جاتے ہیں، جو کسی موصوف کے اوصافِ امتیازی اور کمالی ہوتے ہیں، جن کو اوصافِ غالبہ کہتے ہیں،

اسی نکتہ کو مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ تحذیر الناس میں یوں بیان فرماتے ہیں:

مگر کوئی ملقب ہوتا ہے تو اپنے اوصافِ غالبہ کے ساتھ ملقب ہوتا ہے، مرزا جانجاناں صاحب اور شاہ غلام علی صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب، چاروں صاحب جامع بین العلم والفقر تھے، پر مرزا صاحب اور شاہ غلام علی صاحب تو فقیری میں مشہور ہوئے، اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب علم میں، وجہ اس کی یہی ہے کہ ان کے علم پہ انکی فقیری غالب تھی، اور ان کی فقیری پر ان کا علم، اگرچہ ان کے علم سے ان کا علم یا ان کی فقیری سے ان کی فقیری کم نہ ہو، سو انبیاء میں علم عمل سے

غالب ہوتا ہے، اگرچہ ان کا عمل اور ہمت اور قوت اوران کے عمل اور ہمت اور قوت سے غالب ہو، بہرحال علم میں انبیاء اوروں سے ممتاز ہوئے ہیں (ص ۵)

آگے چل کر فرماتے ہیں :-

نبوت کمالات علمی میں سے ہے، اور آپ جامع العلوم ہیں، اور انبیاء باقی جامع نہیں، (ص ۵)

غرض یہ ہے کہ مقام مدح میں خاص خاص انبیاء علیہم السلام کے وہی اوصاف گنائے جاتے ہیں، جن میں ان کو دوسروں پر امتیاز اور فضیلت حاصل ہو، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں جو شاہد و مبشر و نذیر و داعی الی اللہ وسراج منیر کے الفاظ باطلاق آئے ہیں، ان کا یہی مقصد ہے کہ آپ میں یہ اوصاف مجمعہ ایسے مرتبۂ کمال پر تھے جو کسی اور نبی میں نہ تھے،

اوصافِ کمالی کے علم کے طریقے | انبیاء علیہم السلام کے یہ امتیازی اوصاف دو طریقوں سے معلوم ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ بنص صریح ان کا اظہار ہو، جیسے حضرت موسیٰ ع کے لیے کلیمیت، حضرت عیسیٰ ع کے لیے تائید بروح القدس یا حضرت اسمٰعیل کے لیے صدق وعدہ اور حضرت ایوبؑ کے لیے صبر، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لفظوں میں اس وصف کی تصریح نہ ہو، مگر ان کی زندگی کے عملی کارناموں میں وہ وصف علانیہ نظر آتا ہو، جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام میں نذیریت کا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام میں مبشریت کا کمال،

نذیریت کے کمال کے یہ معنی ہیں کہ اس میں خدا کی قہاری و جباری کے اوصاف کا ظہور زیادہ ہو، اور کمال مبشریت کے یہ معنی ہیں، کہ خدا کے فضل و کرم اور رحمتِ عام کا رنگ زیادہ نمایاں ہو، جیسا کہ خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "مبشر" وغیرہ کہہ کر فرمایا تو وہیں اس کی تصریح فرمائی،

وبشر المومنین بان لهم من الله فضلاً کبیراً۔ (احزاب - ۶)	اور ایمان والوں کو خوش خبری سنا دیجئے کہ ان کے لیے خدا کی طرف سے بڑی مہربانی (فضل) ہے،

(۱) کمال نذیریت میں اللہ تعالیٰ کے قہر و عذاب کا پہلو، اس کے فضل و کرم سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے، جیسے نوح علیہ السلام اپنی ہزار سالہ تبلیغ کی ناکامی سے جب مایوس ہوئے، تو ان کا نمایاں پہلو یہ ہے، کہ خدا کی بارگاہ میں کفار کی پوری نسل کی بربادی و ہلاکت کی دعا مانگی، عرض کی،

رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیاراً، انک ان تذرهم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجراً کفاراً، رب اغفر لی ولوالدی ولمن دخل بیتی مومناً وللمومنین و للمومنات ولا تزد الظلمین	اے میرے پروردگار! تو زمین پر کافروں میں سے کوئی گھر بسانے والا مت چھوڑ، بیشک اگر تو ان کو چھوڑے گا، تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے، اور ان کی اولاد جو ہوگی وہ بھی بدکار اور سخت کافر، اے میرے رب! مجھے اور میرے والدین کو اور جو میرے گھر میں باایمان

الا تبارًا۔	آئے، اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کو
	بخش دے، اور ظالموں کو نہ بڑھا، مگر تباہی
(نوح۔ ۲)	میں۔

اس آیت میں نذیریت اور تبشیریت دونوں کے جلوے ہیں، اگر غور کیجیے کہ نذیریت کا غلبہ تبشیریت سے کتنا زیادہ ہے، اہل ایمان کے لیے صرف مغفرت کی دعاء کے ساتھ ساتھ پورے روئے زمین کے کافروں اور ان کی پوری نسل کی ہلاکت کی دعاء کی ہے، اور پھر انہی کی کامل تباہی و بربادی کی خواہش پر دعاء کا خاتمہ ہے، اور آخر ساری قوم تباہ و برباد ہو گئی،

حضرت موسیٰؑ اہل فرعون کے حق میں یہ دعاء مانگ کر اپنی نذیریت کی شان کا کمال ظاہر فرماتے ہیں،

ربنا انک اتیت فرعون وملاہ	ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے
زینۃ واموالا فی الحیوۃ الدنیا	درباریوں کو شان و شوکت اور دولت دنیا
ربنا لیضلوا عن سبیلک ربنا	میں دی ہے، اے ہمارے پروردگار! تاکہ تیرے
اطمس علیٰ اموالھم واشدد علی	راستے سے بہکا دیں، اے ہمارے پروردگار!
قلوبھم فلا یومنوا حتی یروا العذاب	ان کی دولت کو مٹا دے، اور ان کے دلوں کو
الالیم۔	سخت کر دے، تو وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ
(یونس ۱۰)	دردناک عذاب دیکھ لیں،

اس کے بالمقابل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفتِ تبشیر کا کمال ملاحظہ ہو، کہ اللہ تعالیٰ ان سے ان لوگوں کی نسبت جب دریافت کرے گا جو ان کے بعد شرک میں مبتلا ہوئے تو موقع پا کر عرض کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت سے اپیل کرتے ہیں،

ما قلت لهم الا ما امرتني به ان	میں نے ان سے وہی کہا جو تو نے حکم دیا،
اعبدوا الله ربي وربكم وكنت	کہ میرے اور اپنے رب کو پوجو، اور جب تک
عليهم شهيدا ما دمت فيهم	میں ان کے درمیان تھا، ان کو دیکھتا
فلما توفيتني كنت انت الرقيب	بھالتا تھا، اور جب تو نے مجھے وفات دی
عليهم وانت على كل شئ شهيد	تو ہی ان کا نگہبان تھا، اور تو ہر چیز کی خبر
ان تعذبهم فانهم عبادك	رکھتا ہے، اگر تو ان کو عذاب دے، تو یہ
وان تغفر لهم فانك انت	تیرے بندے ہیں، اگر تو ان کو معاف کر دے
العزيز الحكيم - (مائدہ - ۱۶)	تو تو قدرت اور حکمت والا ہے،

اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی کی یہ تحریک ان کے حق میں ہے، جن کی نسبت حضرت عیسیٰؑ خود ہی نذیری فرما چکے ہیں،

انه من يشرك بالله فقد حرم	بے شک جو کسی کو خدا کا شریک بنائے گا
الله عليه الجنة وماواه النار -	تو اللہ تعالیٰ نے جنت اس پر حرام کر دی ہے
(مائدہ ۱۰)	اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے،

مگر بایں ہمہ ان کی بخشش کے لیے بھی رحمت الٰہی کی سلسلہ جنبانی فرماتے ہیں، ظہور محمدی کی بشارت کا پیغام لے کر بھی وہ آئے اور کہا،

مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد، — اس رسول کی بشارت لے کر آیا ہوں، جو میرے بعد آئے گا، اور جس کا نام احمد ہے،

حضرت ابراہیمؑ کی بشیریت | اس سے زیادہ جمال بشارت حضرت ابراہیمؑ کے روئے اقدس میں ہے، وہ مجسم خیر و برکت بن کر آئے، نبیوں اور رسولوں کے مورث قرار پائے، اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ کے خاندانوں کی برکتیں انہی کے ذریعہ اتریں اور آدم کے سارے گھرانوں کو ان کے ذریعہ ہدایت کی روشنی ملی، نبی المرسلین رحمۃ للعٰلمین علیہ السلام کے ظہور کی دعا انھوں نے کی،

دعائے خلیل و نوید مسیحا

اور دونوں مبشر!

نمرود کی آگ حضرت ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور ندا آتی ہے، کہ سلامتی ہو ابراہیمؑ کی، سلاماً علیٰ ابراہیم، بت پرست باپ کو سمجھاتے ہیں نہیں مانتا اور کفر پر اڑا رہتا ہے، تو اس کو خدا کا ڈر ہلکے لفظوں میں سناتے ہیں،

یاابت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمٰن فتکون للشیطٰن ولیا۔ — اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمت والے خدا کی طرف سے کوئی عذاب نہ چھوئے،

تو تو شیطان کا ساتھی بنے، (مریم - ۳)

باپ نے یہ سن کر بیٹے کو سنگسار کی دھمکی دی، اور گھر سے نکل جانے کا حکم دیا، بیٹا اب بھی باپ کی خیر خواہی میں مصروف ہے، سلام کرتا ہے، اور اپنے خدا سے اس کے گناہوں کی معافی کے لیے دعا کا وعدہ کرتا ہے،

قال سلام علیك سأستغفر لك ربی انه کان بی حفیا واعتزلکم وما تدعون من دون الله وادعوا ربی عسی ان لا اکون بدعاء ربی شقیا۔

ابراہیم نے کہا تم پر سلامتی ہو، میں تمہارے لیے اپنے رب سے دعا مانگوں گا، کہ تمہارے گناہ معاف فرمائے، وہ مجھ پر مہربان ہے، اور میں تم سے اور تمہارے معبودوں سے الگ ہوتا ہوں اور اپنے رب سے دعا کرتا ہوں اور امید ہے کہ میں اس دعا میں بے نصیب نہ رہوں گا، (مریم - ۳)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی،

ربنا اغفر لی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب

اے ہمارے پروردگار! مجھے اور میرے ماں باپ اور ایمان والوں کو اس دن بخش دے، جب حساب کتاب قائم ہو، (ابراہیم - ۶)

یہ بشارت کی پے در پے التجا کافر باپ کے حق میں ہے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو مشرکوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت آئی، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس فعل کی توجیہ فرمائی،

وما کان استغفار ابراهیم لابیه	اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کی مغفرت کی دعا
الا عن موعدة وعدھا ایاہ	مانگنا نہ تھا، مگر وعدہ کے سبب سے جو اس نے
فلما تبین لہ انہ عدو اللہ تبرأ	اس سے کیا تھا، پھر جب ابراہیمؑ پر ثابت ہوگیا
منہ ان ابراھیم لاواہ حلیم۔	کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، تو وہ اس سے الگ
(توبہ۔ ۱۴)	ہوگیا، بیشک ابراہیم بڑا نرم دل اور بردبار تھا،

اس آیتِ پاک سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا اس توقع میں تھی، کہ ان کا باپ مسلمان ہو کر رحمتِ الٰہی کا مستحق ٹھہرے، لیکن ان کی یہ توقع درست نہیں نکلی، دوسری بات یہ کہ حضرت ابراہیمؑ چونکہ کمال بشیریت سے ممتاز تھے۔ اس لیے خدا نے ان کی نرم دلی اور بردباری کی تعریف فرمائی،

اس طرح حضرت لوطؑ کی قوم کی تباہی کی خبر جب مہمان فرشتوں نے ان کو سنائی تو ان کو بڑا صدمہ ہوا، اور بارگاہِ الٰہی میں اس کی طرف سے عرض معروض کرنے لگے، تو خدا نے پھر ان کی نرم دلی اور بردباری اور حق ظاہر ہونے کے بعد ان کے رجوعِ حق کی مدح فرمائی،

فلما ذھب عن ابراھیم الروع و	تو جب ابراہیمؑ سے خوف جاتا رہا، اس کو،
جائتہ البشری یجادلنا فی قوم	(اولاد کی) بشارت مل چکی، ہم سے لوط کی قوم
لوط ان ابراھیم لحلیم اواہ منیب	کے بارے میں جھگڑنے لگا، بے شک ابراہیم
یا ابراھیم اعرض عن ھذا انہ	بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والا تھا،

قد جاء امر ربك وانهم آتيهم عذاب غير مردود۔ (هود – ۷)

(خدا نے فرمایا) اے ابراہیم! اس خیال کو چھوڑ دے، تیرے رب کا حکم آچکا اور لوطؑ کی قوم کو وہ عذاب آنے ہی والا ہے، جو واپس نہ ہوگا

حضرت ابراہیمؑ قوم لوطؑ کی طرف سے کیونکر جناب باری سے جھگڑنے لگے، ایک دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ حضرت لوطؑ کو پیش کر کے رحمتِ الٰہی کے خواستگار ہوئے:

ولما جاءت رسلنا ابراهيم بالبشرىٰ قالوا انا مهلكوا اهل هذه القرية ان اهلها كانوا ظالمين قال ان فيها لوطاً قالوا نحن اعلم بمن فيها لننجينه واهله الا امرأته كانت من الغابرين۔ (عنکبوت – ۴)

جب ہمارے فرستادے ابراہیمؑ کے پاس (اولاد کی) بشارت لے کر آئے، انھوں نے بیان کیا کہ ہم اس آبادی کے رہنے والوں کو ہلاک کرنے آئے ہیں، بے شک وہ ظالم ہیں، ابراہیمؑ نے کہا اس گانوں میں لوطؑ ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم کو خوب معلوم ہے جو اس میں ہیں، ہم ان کو اور ان کے گھر والوں کو بچا لیں گے، لیکن ان کی بیوی وہ تو رہ جانے والوں میں سے ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے اسی عرض معروض کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت بارگاہِ الٰہی سے ان کو یہ خوش خبری سنائی گئی اور ہمیشہ کے لیے یہ قانونِ الٰہی قرار

پایا، کہ ایک کی بُرائی کا بوجھ دوسرے پر لادا نہ جائے۔

ام لم ینبأ بما فی صحف موسیٰ وابراھیم	کیا نہیں بتایا نہیں گیا، جو موسیٰ کے اور اس
الذی وفّی الا تزر وازرۃ وزر	ابراہیم کے صحیفوں میں ہے، جس نے پورا حق ادا
اخری وان لیس للانسان الا	کیا، کہ کوئی شخص دوسرے شخص کا بوجھ نہیں
ماسعیٰ،	اٹھائے گا، اور یہ کہ انسان کے لیے نہیں ہے
(نجم - ۳)	بلکہ وہی جو کہ اس نے کوشش کی،

سورۂ انعام کے آخر میں حضرت ابراہیمؑ کے تعلق سے یہ آیت پھر آتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوتا ہے، کہ کہدے کہ ہم تو ابراہیمؑ کے دین کے پیرو ہیں، جس کا مسلک یہ تھا،

قل اننی ھدانی ربی الی صراط	کہدے کہ مجھے میرے رب نے سیدھا راستہ
مستقیم دینا قیما ملت ابراھیم حنیفا	دکھا دیا ہے، سیدھا دین ابراہیم کا دین جو
وما کان من المشرکین قل ان	موحد تھا، اور مشرکوں میں سے نہ تھا، کہدے
صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ	کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا
رب العالمین لا شریک لہ و	عالم کے پروردگار اللہ کے لیے ہے، اس کا کوئی
بذالک امرت وانا اول المسلمین۔	شریک نہیں، اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے، اور
قل اغیر اللہ ابغی ربا وھو رب	میں مسلمانوں کا پہلا ہوں، کہدے کہ کیا خدا
کل شئی ولا تکسب کل نفس الا	کے سوا کسی اور کو پروردگار چاہوں، حالانکہ

علیها ولا تزر وازرۃ وزر اخری ۔ [illegible] (الانعام - ۲۰)

وہی تو ہر شے کا رب ہے، اور ہر جان کی کمائی اسی پر ہے، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھائے گا،

یہ سب وہی باتیں ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے میں تھیں، اور ان کا اعادہ پھر صحیفۂ محمدیؐ میں کیا جارہا ہے،

میرا خیال ہے کہ تورات کا صحیفۂ پیدائش ہی حضرت ابراہیمؑ کے اس عرض معروض کی پوری تفصیل ہے، جو انھوں نے حضرت لوطؑ کی قوم کے بارہ میں بارگاہِ الٰہی میں پیش کی۔

ابراہام ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا، تب ابراہام نزدیک جاکے بولا، کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا، شاید پچاس صادق اس شہر میں ہوں، کیا تو اسے ہلاک کرے گا، اور ان پچاس صادقوں کی خاطر جو اس کے درمیان ہیں، اس مقام کو نہ چھوڑے گا، ایسا کرنا تجھے بعید ہے، کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا، اور خداوند نے کہا کہ اگر میں سدوم (قوم لوط کا شہر) میں شہر کے درمیان پچاس صادق پاؤں تو میں ... ان کے واسطہ تمام مکان کو چھوڑوں گا تب ابراہام نے جواب دیا، اور کہا اب دیکھ میں نے خداوند سے بولنے میں جرأت کی، اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں، شاید پچاس صادق سے پانچ کم ہوں، کیا ان پانچ کے واسطے تو تمام شہر کو نیست کرے گا، اس نے کہا اگر میں وہاں پینتالیس پاؤں تو نیست نہ کروں گا، پھر اس نے اس سے کہا، کہ شاید وہاں چالیس پائے جائیں، تب اس نے

کہا کہ میں ان چالیس[۲] کے واسطے نہ کروں گا، پھر اس نے کہا، میں منت کرتا ہوں کہ اگر خداوند خفا نہ ہوں تو میں پھر کہوں شاید وہاں تیس[۳] پائے جائیں، وہ بولا اگر میں وہاں تیس[۳] پاؤں تو میں یہ نہ کروں گا، دیکھ میں نے خداوند سے بات کرنے میں جرأت کی، شاید وہاں بیس[۲] پائے جائیں، وہ بولا میں بیس[۲] کے واسطے بھی اسے نیست نہ کروں گا، تب اس نے کہا میں منت کرتا ہوں کہ خداوند خفا نہ ہوں، تب میں فقط اب کی بار پھر کہوں شاید وہاں دس[۱] پائے جائیں، وہ بولا میں دس[۱] کے واسطے بھی اسے نیست نہ کروں گا، جب خداوند ابراہام سے باتیں کر چکا، تو چلا گیا اور ابراہام اپنے مقام کو پھرا"۔

(باب ۱۸۔ ۲۳ سے ۳۲ تک)

تورات کے اس بیان سے اس جدال کی پوری تفصیل معلوم ہوتی ہے، جو وہ بار بار سدوم کے گنہگاروں کو بچانے کے لیے بارگاہ الٰہی میں پیش کرتے تھے۔ اور اس نرم دلی، بردباری اور رجوعِ حق کی تصدیق ہوتی ہے، جس سے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کو متصف کیا ہے، اور ان آیاتِ الٰہی کی تصدیق ہوتی ہے، جن کو قرآن نے صحیفۂ ابراہیمی کے حوالہ سے پیش کیا ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کی اس شانِ بشریت کا اظہار ہوتا ہے، جو جمال الٰہی کا پرتو تھی۔

حضرت ابراہیمؑ جب کعبہ کی تعمیر سے فراغت پاتے ہیں، اور اپنی اولاد کو اس کی پاسبانی کے لیے بارگاہ الٰہی میں پیش کرتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں، کہ اس

بے آب ودانہ بنجر زمین میں خداوندا اس کو تیرے گھر کی پاسبانی اور تیرے دین کی حفاظت کی خاطر بساتا ہوں، خداوندا! ان کو روزی دینا، ان میں اپنا رسول بھیجنا، ان کو بتوں کی پوجا سے بچانا،

واذ قال ابراهيم رب اجعل هذا البلد آمنا واجنبني وبني ان نعبد الاصنام رب انهن اضللن كثيرا من الناس فمن تبعني فانه مني ومن عصاني فانك غفور رحيم۔ (ابراہیم ۔ ۶)	اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن والا بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو تو اس سے بچا، کہ وہ بتوں کو پوجیں، خداوندا! ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا، تو جو میری پیروی کرے وہی مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو بیشک تو بخشنے والا رحمت والا ہے،

یہ خدا کی بخشش رحمت کی تحریک کن کے لیے ہو رہی ہے، ان کے لیے جو بت پرست ہو کر ان کی نافرمانی کریں۔

یہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی بشیری شان،

صحابہؓ میں ان کے جلوے اوپر کی سطروں میں انبیاء علیہم السلام کی نذیریت اور بشیریت کی جو تشریح کی گئی ہے، وہ میری نہیں بلکہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حق ترجمان سے ادا ہوئی ہے، غزوۂ بدر میں جب کفار قریش گرفتار ہو کر آئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ طلب کیا، حضرت عبداللہ بن رضؓ

رواحہ نے کہا کہ ان کو آگ میں جلا دیا جائے، اور حضرت عمرؓ نے کہا ان کو قتل کر دیا جائے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کے خاندان اور قوم کے ہیں، ان پر رحم فرمائیے، آپ نے ان دونوں فریق کے مشورہ کو سن کر فرمایا کہ ایک فریق اپنے پہلے بھائیوں نوحؑ اور موسیٰؑ کی طرح ہے، نوحؑ نے کہا "پروردگار! زمین پر کافروں میں سے کسی گھر بسانے والے کو مت چھوڑ"، اور موسیٰؑ نے کہا، ہمارے پروردگار ان کی دولت میٹ دے، اور ان کے دلوں کو سخت کر دے" اور دوسرا فریق ابراہیم کی طرح ہے: ابراہیمؑ نے کہا "جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے، اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا اور رحم والا ہے" اور عیسیٰؑ کی طرح ہے کہ عیسیٰؑ نے کہا کہ اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو ان کو معاف کر دے، تو تو قدرت والا اور حکمت والا ہے (مستدرک حاکم ۳ ص ۲۱ و ۲۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت عمرؓ کو، حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی نذیری شان اور حضرت ابوبکرؓ کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی بشیری شان کی مثال ظاہر فرمایا، اس تفصیل سے معلوم ہوگیا، کہ بشیریت اور نذیریت کے کمال سے کیا منشا ہے۔

عام طور سے ہر نبی نذیر اور بشیر ہے اس بیان سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اس مضمون کا منشا نعوذ باللہ یہ ہے کہ کوئی نبی صرف مبشر یا کوئی نذیر صرف اس معنی میں ہوتا ہے، کہ ایک صرف بشارت سناتا ہے، اور دوسرا صرف انذار کرتا ہے، بلکہ یہ منشا ہے کہ کسی نبی

میں عام وصف انذار کے ساتھ مبشریت کا کمال ہوتا ہے، اور کسی میں مبشریت کے عام وصف کے ساتھ نذیریت کا کمال ہوتا ہے، ورنہ خود اللہ تعالیٰ نے بلا استثنا تمام پیغمبروں کو بشیر و نذیر ایک ساتھ فرمایا ہے، لیکن اس بشیریت و نذیریت کے معنی واضح بھی فرما دیئے ہیں، جو عام وصف بشیر و نذیر کی حقیقت ہیں، فرمایا،

وما نرسل المرسلین الا مبشرین ومنذرین،	اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو لیکن بشارت سنانے والے اور ڈر سنانے والے بنا کر،

یہ بشارت کیا ہوتی ہے، اور یہ ڈر سنانا (انذار) کیسے ہوتا ہے، آیت بالا کے ساتھ ہی اس بشارت اور انذار کی یہ تشریح ہے،

فمن آمن واصلح فلا خوف علیہم ولا ہم یحزنون والذین کذبوا بآیٰتنا یمسہم العذاب بما کانوا یفسقون۔	تو جو ایمان لایا اور اچھے کام کیے، تو ان کو نہ ڈر ہوگا اور نہ غم اور جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کو ان کی نافرمانی کے سبب سے عذاب چھوئے گا،

لیکن بشیریت یا نذیریت کے اوصافِ غالبہ جن پیغمبروں کو ملتے ہیں، ان کی بشیریت اور نذیریت کی شان اس سے بہت بلند ہوتی ہے، جس کی مثالیں ایک طرف حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ میں، دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ میں نظر آتی ہیں، اور دونوں کا مجموعہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں صلوٰت اللہ علیہم اجمعین!

یہ جمال اور جلال کے پرتو ہیں کسی نبی میں شانِ نذیری کا غلبہ اور کسی نبی میں شانِ بشیری کا کمال باہم ایک دوسرے پر ترجیح کا سبب نہیں، انبیاء علیہم السلام کے یہ دونوں اوصاف اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان جلال وجمال کے مظہر ہیں، کسی میں جلالی شان کی چمک زیادہ ہوتی ہے، اور کسی میں جمالی شان کی، جب اور جس زمانہ میں حکمتِ الٰہی کا اقتضا جلال یا جمال میں سے جس شان کمال کا اظہار ہوتا ہے، وہ اس وقت کے پیغمبروں میں ظاہر فرماتا ہے، دونوں اس کی شانیں ہیں، اور دونوں اس کے اسمائے حسنیٰ:

الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون۔

(معارف اپریل ومئی ۱۹۳۷ء)

ذبح عظیم

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے جس اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا خدا کی طرف سے خواب میں حکم ہوا تھا، یہود کہتے ہیں، کہ وہ حضرت اسحاقؑ تھے، لیکن مسلمانوں کے نزدیک حضرت اسماعیلؑ تھے، اور اسی لیے ذبیح اللہ مسلمانوں میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا لقب مشہور ہے، اس کے لغوی معنی ہیں خدا کا ذبح کیا ہوا، یا خدا کی راہ میں ذبح کیا ہوا۔ اس لقب کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت ہے،

یا بنی انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری (صافات - ۳)	(حضرت ابراہیمؑ نے کہا) میرے پیارے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، تیری رائے کیا ہے؟

حضرت اسماعیلؑ نے جواب میں کہا،

یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین۔ (ایضاً)	اے میرے باپ! جو تجھے کہا جاتا ہے وہ کر گذر، خدا نے چاہا تو مجھے تو ثابت قدم رہنے والوں میں پائے گا،

مقدس باپ نے اپنے بیٹے کے اس صبر و ثبات کو دیکھا، تو ان کو لے کر قربان گاہ

کو روانہ ہوگئے، جو اُن کی جائے قیام سے کئی دن کی مسافت پر تھی، وہاں پہنچ کر بیٹے کو لیکر اور آگے بڑھے اور بیٹے کو پیشانی کے بل گراکر چھری ان کی گردن پر رکھدی، آواز آئی، اے ابراہیم!

قد صدقت الرویا انا کذٰلک نجزی المحسنین۔ (صافات۔۳) تونے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزائے خیر دیتے ہیں،

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل ۔ سر زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

ابھی یہ منظر آنکھوں سے دور نہیں ہونے پایا تھا، کہ ندا آئی،

وفدیناہ بذبح عظیم ۔ (ایضاً) اور ہم نے اس کو (اسمٰعیل کو) ایک بڑی قربانی دے کر چھڑایا۔

اس آیت میں یہ ذکر ہے، کہ خدا فرماتا ہے، کہ میں نے ایک دوسری بڑی قربانی کا فدیہ دیکر اسماعیل کو ان کی اس قربانی سے نجات بخشی، اب سوال یہ ہے، کہ وہ بڑی قربانی کیا تھی، جس کو حضرت اسمٰعیلؑ کی اس قربانی اور فدیہ اور بدلہ قرار دیا گیا، مفسرین کی عام روایتیں یہ ہیں، کہ جنت کا ایک مینڈھا لاکر حضرت ابراہیمؑ کے سامنے کر دیا گیا، کہ وہ حضرت اسماعیلؑ کی جگہ قربانی کیا جائے، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا، اور اس مینڈھے کو حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ قربانی کیا، مگر یہ روایتیں اسرائیلیات سے زیادہ نہیں، اور ان سب کا ماخذ تورات ہے،

"تب ابراہام نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا

دیکھا، جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے ہیں، تب ابراہام نے جاکر اس مینڈھے کو لیا، اور اس کو اپنے بیٹے کے بدلہ میں سوختنی قربانی کے لیے چڑھایا۔" (پیدائش ۲۲-۱۳)

لیکن قرآن پاک میں اس مینڈھے کا ذکر نہیں، بلکہ اس کے بجائے "ایک بڑی قربانی" کہا گیا ہے، اگر یہ بڑی قربانی مینڈھے یا بکرے ہی کی صورت میں ہوتی، تو قرآن اس کو "ایک بڑی قربانی" کیوں کہتا،

ہمارے مفسرین نے اس کے یہ جوابات دیے ہیں

۱۔ چونکہ یہ قربانی کا مینڈھا جنت سے لایا گیا تھا اس لیے اس کو بڑی قربانی کا لقب ملا،

۲۔ یہ وہی مینڈھا تھا جس کو ہابیل نے قربان کیا تھا، اور جس کو خدا نے قبول فرمایا تھا، تو چونکہ خدا اس کو قبول کر چکا تھا، اس لیے اس کو بڑی قربانی فرمایا

۳۔ ان روایات میں سب سے بہتر جواب حسن بصریؒ کا ہے، فرمایا کہ اس بڑی قربانی سے مقصود وہ خاص جانور نہیں، جو حضرت ابراہیمؑ کے سامنے قربانی کے لیے پیش ہوا، بلکہ وہ مطلق قربانی ہے، جو اس کے بدلہ میں پوری ملت کے لیے قیامت تک حضرت ابراہیمؑ کی یادگار سنت قرار پائی،

جسمانی یادگار کی حیثیت سے اس میں شک نہیں، کہ ابراہیمی ملت میں عید قربان یا عید اضحیٰ کا سالانہ جشن اور اس میں غریبوں اور مسکینوں کے کھلانے اور دوستوں

ضیافت اور خوشی کے اظہار کے لیے کسی جانور کی قربانی اس واقعہ کی یادگار ہے، اسلام میں دو ہی تہوار ہیں، عید اور بقر عید، بقر عید ملتِ ابراہیمی کا جشن ہے، یعنی اس واقعہ کی یادگار ہے، جس کی بنا پر ملت ابراہیمی کی تاسیس اور مکہ میں خانۂ الٰہی کی تعمیر ہوئی، اور وہ تعمیر ملتِ ابراہیم کا قبلہ قرار پائی، اور عید ملتِ محمدی کا جشن ہے، یعنی نزولِ قرآن کی یادگار جس سے پردۂ عالم میں ملت محمدی کا ظہور ہوا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تھا، شریعت میں خواب کی دو قسمیں ہیں، ایک کا نام رویائے تمثیلی اور اور دوسرے کا نام رویائے حقیقی ہے، رویائے حقیقی میں اصل حقیقت بے پردہ نظر آتی ہے، اور وہی مقصود ہوتی ہے، جیسے کسی نے خواب میں دیکھا، کہ فلاں شخص مرگیا ہے، اور وہ واقعی مرگیا تھا، یہ رویائے حقیقی ہے، رویائے تمثیلی یہ ہے کہ مقصود اس واقعہ سے ملتی جلتی کوئی مشابہ چیز ہو، جیسے حضرت یوسفؑ نے قحط کو سوکھی بالوں اور دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا، امام خطابی معالم السنن میں کہتے ہیں،

وبعض الرویا، مثل یضرب	بعض خواب تمثیلی ہوتے ہیں، جس کو اس مثالی
لیتاول علی الوجه الذی یجب	صورت میں اس لیے بیان کیا جاتا ہے، کہ
ان یصرف الیه معنی التعبیر فی	اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے، جس طریقہ
مثله وبعض الرویاء لا یحتاج	پر ایسے خواب کی تعبیر پھیری جاتی ہے، اور
الی ذالك بل یاتی کالمشاهدة،	بعض خواب اس کے محتاج نہیں ہوتے

(فتح الباری جلد ۱۲ ص ۴۰۲) بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں،

اس بنا پر ہم کو غور کرنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو اپنے بیٹے کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا، تو یہ خواب تمثیلی تھا، یا حقیقی تھا، اس گرہ کے کھلنے سے "وفدیناہ بذبح عظیم" کے معنی بھی کھل جائیں گے،

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو جو خواب میں دکھایا تھا وہ تمثیلی تھا، یعنی یہ کہ وہ اپنے بیٹے کو قربانی کر رہے ہیں، اس کے معنی یہ تھے کہ وہ اس کو ہمیشہ کے لیے خدا کی راہ میں خانۂ کعبہ کی خدمت گذاری اور دین حنیف کی تبلیغ کے لیے خدا کی راہ میں قربان کر دیں، حضرت ابراہیمؑ نے فداکاری کے سچے جوش میں اس خواب کو حقیقی سمجھا اور چلے اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کی راہ میں واقعی جسمانی طور سے قربانی کرنے، مکہ کے پاس پہنچ کر بیٹے کو قربان گاہ پر چڑھا کر چاہا ہی تھا کہ اس کے گلے پر چھری پھیر دیں کہ بارگاہ قدس سے ندا آئی قد صدقت الرؤیا "اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا"، اور اب خداوند حق نے حضرت ابراہیمؑ کو وحی سے مطلع فرمایا کہ یہ خواب حقیقی نہیں بلکہ تمثیلی تھا، اور حضرت اسماعیلؑ کی جسمانی قربانی نہیں، بلکہ روحانی قربانی مقصود ہے، اور یہ جانور کی جسمانی قربانی اس روحانی قربانی کی تمثیل ہے، اب غور کیجیے تو معلوم ہوگا، کہ وہ "ذبح عظیم" جس کو دیکر حضرت اسماعیلؑ جسمانی قربانی سے بچ جاتے ہیں، وہ اُن کی روحانی قربانی ہے،

روحانی قربانی جسمانی قربانی کے مقابلہ میں یقیناً ذبح عظیم ہے، جسمانی قربانی کی تکلیف تو ایک لمحہ کی بات ہے، مگر روحانی قربانی تو کسی امر حق کی خاطر ساری زندگی کی جیتے جی کی قربانی ہے، جس میں مرکر نہیں، بلکہ جی کر حق کی راہ میں ہر تکلیف اور مصیبت کو انگیز کرنا اور ہر وقت موت کے لیے آمادہ رہنا ہے،

حضرت اسماعیلؑ نے اس کی خاطر ملک شام کے سبزہ زار کو چھوڑا، وہاں کے عیش و آرام کو خیرباد کہا، عزیز و اقارب کو ترک کیا، اور ایک لق و دق صحرا میں تن تنہا رہنا گوارا کیا، وہاں خدا کے نام کا ایک گھر بنایا، اور اس کو آنے جانے والے مسافروں اور سوداگری کے قافلوں کے لیے مرکزی گذرگاہ ٹھہرایا، اور اس طرح دینِ حق کی تبلیغ، اور خانۂ خدا کی پاسبانی کے لیے نہ صرف اپنی زندگی تک بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور تک جو ربنا وابعث فیھم کی ابراہیمی دعا کی قبولیت کا زمانہ تھا، اپنی پوری نسل کو ایسے صحراے بے آب و دانہ میں گذار دینے کا حکم دیا، یہ تھی وہ عظیم الشان قربانی جو حضرت اسماعیلؑ کی جسمانی قربانی کی تمثیل میں حضرت ابراہیمؑ کو دکھائی گئی، اور آج کے دن تک یہ روحانی قربانی ملتِ ابراہیمی کی حقیقت اور نسل اسماعیلی کی شریعت ہے، اور جانور کی جسمانی قربانی اس حقیقت کا مجاز ہے، اور اسلام میں جہاد اس مجاز کی حقیقت ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا، کہ وہ ذبحِ عظیم کا ذریہ جس کے بدلہ میں حضرت اسماعیلؑ کی جسمانی قربانی معاف کی گئی، ان کی وہ روحانی قربانی ہے، جو نسلاً بعد نسلٍ

ان پر فرض ہوئی، اور اس کی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہوئی، اور اسی لیے یہ ہر سال کجشن قربانی ہیں حضرت اسماعیلؑ کے جسمانی اور روحانی فرزندوں پر واجب ہے،

جہاد اور شہادت جن کی فضیلتوں میں اسلام کا سارا دفتر لبریز ہے، وہ اسی "ذبح عظیم" کی تفسیریں ہیں، جو مسلمان اس ذبح عظیم کا منظر پیش کرتا ہے، بارگاہِ قدس سے وہ بقائے دوام حیات جاوید اور "بل ھم احیاء" کے سرخ خلعت سے سرفراز ہوتا ہے، جنت کے دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں، اور خداوند تعالیٰ اپنے پاس کی روزی سے اس کو سیر فرماتا ہے،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(معارف مارچ ۱۹۳۷ء)

قربانی کا اقتصادی پہلو

عید اضحیٰ جس کے معنی جشن قربانی کے ہیں، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے تاریخی واقعہ کی یادگار ہے، اس وقت کے جو سامی بادشاہ عراق، شام اور مصر پر حکمران تھے، وہ اپنے نمرودی و فرعونی کبر و نخوت میں مبتلا تھے، ہر جگہ آسمان کے ستاروں اور زمین کے بادشاہوں کی پوجا ہو رہی تھی، ضرورت تھی کہ ان نمرودوں اور فرعونوں کی جابر و ظالم سلطنتوں کے حدود سے آزاد کسی سرزمین میں اس پیام حق کے لیے جو حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ دنیا میں آیا تھا، کوئی مرکز قائم کیا جائے، جو ہر قسم کی دنیاوی سرسبزی و شادابی سے پاک ہو تاکہ سلاطین کی حرص و آز کے ہاتھوں سے وہ ہمیشہ محفوظ رہے۔

انتخاب کی نظر عرب کی اس شور اور بنجر زمین پر پڑی، جس کا نام حجاز ہے، جو بحر احمر کے کنارے شام اور یمن کے دو زرخیز علاقوں کے بیچ میں آمد و رفت کا راستہ اور تجارت کے قافلوں کا گذرگاہ تھا، تاہم چونکہ وہ ہر قسم کی روئیدگی اور سیرابی سے مبرا تھا، اس لیے اس میں کوئی مستقل آبادی نہ تھی، لیکن سوداگروں کی آمد و رفت سے وہ تبلیغ کا اہم مرکز ہو سکتا تھا، اس لیے زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی قسمت

ہیں ازل سے جو عزت مقدر ہو چکی تھی، حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں اس کے ظہور کا وقت آیا،

حجاز دعوتِ حق کا مرکز قرار پایا، اور خانۂ کعبہ کی تعمیر اور تطہیر کا حکم آیا، اور اس کی پاسبانی کے لیے حضرت ابراہیمؑ کو اپنی سب سے پیاری اور اکلوتی اولاد حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا منظر خواب میں دکھایا گیا، اس جسمانی قربانی کے خواب کی تعبیر روحانی قربانی تھی، حضرت ابراہیمؑ نے مروہ پہنچکر اپنے خواب کی جسمانی تکمیل کرنی چاہی تو ندا آئی اے ابراہیم! تم اپنے خواب کو پورا کر چکے! اور اب اس خواب کی تعبیر وہ "ذبح عظیم" یعنی عظیم الشان قربانی ہے، جو اپنی جان کو راہِ حق میں دیکر اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں لٹا کر ادا کر سکتے ہو، اس رمز کی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی ہے، جو ہر حاجی پر ہر سال فرض ہے، ہر مسلمان پر جس میں استطاعت ہو، واجب ہے،

اس خواب کی حقیقی تعبیر کی تکمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو شام کے مرغزار سے لاکر حجاز کے بے آب ودانہ اور شور زمین میں خانۂ خدا کے پاس آباد کیا، تاکہ حق کا پیغام اور توحید کی دعوت سلاطینِ زمانہ کی جابرانہ تعدی سے محفوظ رہ کر آخری پیغام الٰہی کے ظہور کے لیے تیار رہے،

اس بے آب وگیاہ، بنجر اور شور زمین میں کسی انسانی آبادی کی بقا، کسی مادّی اقتصادی انتظام کے بغیر ناممکن تھی، اور ہے، اور اس کے لیے قدرتِ الٰہی نے دو

انتظام کیے، حج اور قربانی، حج کو علاوہ اپنے روحانی فیوض و برکات کے اقوام عالم کی تجارتی نمائش گاہ یا عالمگیر تجارتی میلہ ٹھہرایا، اشہرِ حرم کے مامون زمانہ میں عرب کے سارے گوشوں سے تاجر اور سوداگر آتے اور مکہ کے میدان میں قیام کرکے سال بھر کی روزی پیدا کرتے۔۔

اسی نکتہ کو سامنے رکھ کر حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کے معنی سمجھیے،

واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا بلدا آمنا وارزق اھلہ من الثمرات۔ (بقرہ۔ ۱۵)	اور جب ابراہیمؑ نے کہا اے میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بنا اور یہاں کے رہنے والوں کو کچھ پھلوں میں سے روزی کر،
ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون۔ (ابراہیم۔ ۶)	اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد بن کھیتی کے میدان میں تیرے عزت والے گھر کے پاس اس لیے بسائی ہے، کہ نماز کو قائم کریں، تو انسانوں کے کچھ دلوں کو ان کی طرف مائل کر، اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے تاکہ وہ شکر گذار ہوں،

حج کی تجارتی گرم بازاری اور حاجیوں کی آمد و رفت سب اسی لیے ہے، تاکہ اس کے ذریعہ اس ویرانہ کی روحانی و جسمانی و مالی آبادی ہو، اسلام آیا تو لوگوں نے سمجھا کہ روحانی مقصد سے حج کے مالی مفاد دور کر دیئے گئے مگر خدا نے تصریح

کی، کہ ایسا نہیں ہے، فرمایا۔

لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم — تمہارے لیے یہ گناہ نہیں کہ (حج میں) خدا کی روزی کو تلاش کرو،

اسی لیے خدا کی روزی تلاش کرنے والے حاجیوں کے لیے راستوں کے امن کا حکم دیا گیا، فرمایا۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تحلوا شعائر اللہ ولا الشھر الحرام ولا الھدی ولا القلائد ولا آمین البیت الحرام یبتغون فضلاً من ربھم ورضواناً۔ — اے ایمان والو! اللہ کے شعائر کی بے توقیری نہ کرو، اور نہ حرمت والے (حج) مہینے کی اور نہ حج کی قربانی کی اور نہ قربانی کے جانوروں کے پٹوں کی اور نہ ان کی جو عزت والے گھر (کعبہ) کے قصد سے نکلے ہوں، اپنے پروردگار کے فضل (تجارت) اور اس کی رضامندی کی تلاش میں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج کے اغراض میں ایک اہم غرض اس کا تجارتی اور اقتصادی پہلو ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے، کہ حضرت ابراہیمؑ کو اس اعلان کا حکم ہوا تھا،

واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلی کل ضامر یاتین من — اور لوگوں میں حج کو پکار دے، وہ پیادہ اور ہر دبلی پتلی سواریوں پر ہر دور دراز راستہ

کل فج عمیق لیشھدوا منافع لھم — سے تیرے پاس آئیں گے، تاکہ اپنے (دینی و
ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومٰت — دنیاوی) منافع کے مقاموں پر حاضر ہوں،
علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام — اور چند مقررہ دنوں میں اللہ کا نام جانوروں
فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر۔ — پر لیں، جو ہم نے ان کو روزی کیے، تو ان جانوروں
(حج - ۴) — کے گوشت میں سے کچھ کھاؤ اور بدحال فقیروں
کو کھلاؤ۔

ان آیتوں میں اس کی تصریح ہے، کہ حج کے مقاصد میں سے ایک خاص مقصد یہ ہے کہ لوگ تجارتی و مالی منافع کے مقاموں پر اکٹھے ہوں، اور باہم مبادلہ اور خرید و فروخت سے اقتصادی فائدے اٹھائیں، اسی لیے متعدد مفسروں نے آیت میں منافع سے مراد تجارت لی ہے، اور کسی نے مغفرت، مگر اکثروں نے ان دونوں کو شامل کیا ہے،

آیت میں اس بات کی بھی تصریح ہے، کہ قربانی سے مقصود یہ ہے کہ جانوروں کی جو نعمت انسانوں کو ملی ہے، اس کا شکریہ ادا کریں، اور اس مسرت اور جشن کے موقع پر خود اس کا گوشت کھائیں، اور فقیروں اور مسکینوں کو کھلائیں، کہ وہ بھی اس خوشی میں شریک ہوسکیں، قربانی کا یہ مقصد نہیں، کہ نفس جانور کی خون ریزی خدا کو محبوب ہے، یا اس کا گوشت اس کو پسند ہے، فرمایا،

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا — اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت

ولکن ینالہ التقویٰ منکم ۔۔ ۔ اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارے (دل کی) پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج میں قربانی کی غرض ایک تو یہ ہے کہ اس جشن میں دعوت کا سامان ہو، دوسری غرض یہ ہے کہ بدحال فقیروں کو کھلایا جائے، اس لیے قربانی کے اتنے حصے کے علاوہ جو ذاتی صرف میں آئے، بقیہ کل گوشت پوست سب فقیروں کو ہدیہ ہے۔

دولت کا سرچشمہ تین چیزیں ہیں، زراعت، صنعت، اور مویشی کی پرورش، عربوں کے پاس نہ زراعت تھی اور نہ صنعت، اس لیے دوسری قوموں کے تجارتی سامانوں کی دلالی کے بعد جو چیز ان کی دولت کا سرمایہ ہے، وہ جانوروں کی پرورش ہے، اور یہی ان کی سب سے بڑی دولت ہے۔

بے مایہ عربوں کو بیت حرام کی پاسبانی کی اُجرت اور ان کی اقتصادی امداد کا ذریعہ یا تو خیرات ہوسکتی تھی، جو حد درجہ ان کی دنائت اور پست حالی کو ہر حال میں بڑھاتی، جس طرح وہ آج کل خلافِ شریعت خیرات لے لے کر تمام دنیا کی نگاہوں میں عربوں کی عزت کو بٹہ لگا رہے ہیں، یا کوئی دوسری صورت ہوتی۔

اسلام نے دوسری صورت نکالی، اور وہ ان کی پرورش کے لیے تجارت حاجیوں کا کرایہ مکان، حاجیوں کی خدمت کی مزدوری، حاجیوں کی سواری کی اُجرت اور دوسرے ذریعے مقرر کیے ہیں، انہی میں سے ایک قربانی بھی ہے۔

پہلے زمانہ میں پانچ لاکھ حاجیوں کا تخمینہ ہوتا تھا، اور اب ایک لاکھ ہے، [1]
ہر حاجی کم از کم ایک دنبہ یا بکرا قربانی کرتا ہے، بعض اونٹ کرتے ہیں، جس کی گو
قیمت زیادہ ہوتی ہے، مگر اس میں شرکت بھی ہوتی ہے، بہرحال اوسط ایک
لاکھ دنبہ رکھ لیجئے، ایک دنبہ کی قیمت اوسطاً چار روپیے ہوتی ہے، تو اس طرح
اہل بادیہ عرب کو ہر سال حج میں کم از کم چار لاکھ روپیے تقسیم ہوتے ہیں۔

غیر حاجی مسلمان ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی جو قربانی کرتے
ہیں، اس کا روپیہ بھی ہر ملک کے دیہاتی مسلمانوں کو پہنچتا ہے، ہندوستان میں گو اکثر
قربانی کے جانور قصائیوں کے ذریعہ خریدے جاتے ہیں، مگر شاید مسلمانوں سے زیادہ
ہندو مویشی کی پرورش کرتے ہیں، اور وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر یہ قصور کس کا ہے؟

جانور کا گوشت، پوست، ہڈی سب کی قیمت بازار میں ہے، اور ان سب کا
نفع زکوٰۃ کی طرح مستحقین کے لیے مخصوص ہے، اگر عرب یا حجاز کی حکومت اس کا
مناسب انتظام نہیں کرتی، اور اس کا نفع حاصل کر کے غریبوں کو نہیں دیتی، تو یہ قصور
اسلام کا نہیں مسلمانوں کا ہے، اس کے لیے اسلام میں اصلاح کی ضرورت نہیں،

---

[1] یہ مضمون ۱۹۳۷ء کا لکھا ہوا ہے جبکہ کسی وجہ سے حاجیوں کی تعداد پہلے سے کم ہوگئی تھی
اب ۱۹۸۲ء میں حاجیوں کی تعداد بارہ تیرہ لاکھ تک پہنچ گئی ہے اسی کے ساتھ مویشی کی قیمت اتنی بڑھ
گئی ہے کہ مجموعی قربانیوں کی قیمت ایک کروڑ تک پہنچ جاتی ہوگی۔

مسلمانوں میں اصلاح کی ضرورت ہے

ممالک عرب یعنی باہر دوسرے اسلامی ملکوں کا حال ہم کو نہیں معلوم مگر ان کو ہندوستان پر قیاس کیا جا سکتا ہے، ہندوستان میں آٹھ کروڑ مسلمان ہیں، ۸ لاکھ قربانیاں ہوتی ہوں گی، اور آٹھ لاکھ قربانیوں کی قیمت اگر آٹھ ہی لاکھ کم و بیش رکھی جائے[۱]، تو یہ آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ عربی مدرسوں، مکتبوں، قومی اداروں، اور شہروں و دیہاتوں کے غریبوں میں بانٹے جاتے ہیں، اگر ہر سال ان آٹھ لاکھ روپیوں کے جمع و خرچ کا ٹھیک انتظام نہیں کیا جاتا ہے، تو یہ مسلمانوں کا قصور ہے، پھر بھی یہ معلوم ہے، کہ ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے کئی مہینوں کے اخراجات اسی قربانی کی مدات سے پورے ہوتے ہیں۔

البتہ جشن قربانی کے اظہار کے لیے کوئی ایسا طریقہ جس میں جشن کا اظہار ہو، باہم دوستوں کی سادہ دعوت اور ہدیہ کا انتظام ہو، اور پھر غریبوں اور مسکینوں اور قومی ضرورتوں کا فنڈ بھی اس سے قائم ہو، اور فدینا لا بذبح عظیم کا مصداق بھی ہو، قربانی کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

آج کل کی مہذب سلطنتوں میں ٹیکس کے دو طریقے ہیں، ایک براہ راست

---

[۱] اب پاکستان کے قیام کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے چھ کروڑ تک ہے، لیکن مویشیوں کی قیمت اب اس تخمینہ سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے،

ٹیکس جیسے انکم ٹیکس، دوسرا بواسطہ ٹیکس، جس طرح ہم اس سلطنت میں ہر چیز پر ہر وقت ٹیکس ادا کر رہے ہیں، مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ براہ راست ٹیکس ہمیشہ گراں گذرتا ہے، اور بواسطہ ٹیکس کبھی معلوم بھی نہیں ہوتا، یہی سبب ہے کہ جتنے لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اس سے زیادہ لوگ قربانی دیتے ہیں، اسلام نے ان دونوں ٹیکسوں سے کام لیا ہے، زکوٰۃ براہ راست انکم ٹیکس ہے، اور قربانی بواسطہ ٹیکس ہے، اور اس کی ادائی کا راز اسی قربانی کے پُر پیچ رمز میں ہے، اگر کوئی اس دینی راز کے نفسیاتی فلسفہ کو کھو کر اس کو نقد روپیے سے بدلنا چاہے تو وہ دیکھے گا، کہ چند ہی سال میں یہ منتر بے اثر اور عید اضحیٰ کا فلسفہ باطل ہو جائے گا، اور وہ روز جشن نہیں بلکہ تحصیل وصول کا ناگوار دن بن جائے گا۔

الغرض قربانی بہت سے نفسیاتی، روحانی اور مادی، اقتصادی فوائد پر مبنی ہے، اور اس میں جو کمی نظر آتی ہے، وہ مسلمانوں کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان خود اپنی اصلاح کریں، اسلام کی اصلاح نہیں، کہ وہ ہر اصلاح سے ہمیشہ کے لیے پاک، بلند ہے۔

(معارف مارچ ۱۹۳۰ء)

سود
اور
صحفِ انبیاءؑ

سود جس کو انگریزی میں انٹرسٹ کہتے ہیں، عرب اس کو رِبا کہتے ہیں، عربی میں ربا کے معنی زیادتی اور اضافہ کے ہیں، اسی مناسبت سے قرض کے اصل راس المال سے جو زیادہ وصول کیا جائے، اس کو ربا کہتے ہیں، جوازِ سود کی کوشش میں اسلام کے ایک نادان دوست کی مضحکہ خیز تحقیق یہ ہے کہ قرن اول میں چونکہ قرآن مجید پر اعراب نہ تھا، اس لیے مسلمانوں نے بجائے رُبا کے رِبا پڑھا ورنہ اصلی لفظ رُبا تھا، جو فارسی مصدر ربودن سے مشتق ہے، جس کے معنی چھیننے اور جھپٹنے کے ہیں، اس بنا پر اصل قرآن مجید نے سود کو حرام نہیں کیا ہے، جیسا کہ عام مسلمان سمجھتے ہیں، بلکہ اس مال کو حرام کیا ہے، جو چھین جھپٹ کر حاصل کیا جائے۔

ہم اس تحقیق کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں،

صیاد نہ تو نخچیر کمن چیزے کہ نہ خواندۂ تو تفسیر مکن

ایک دوسرے مضمون نگار کا جوازِ سود پر بڑا استدلال یہ ہے،

"ہمارا سب سے بڑا استدلال یہ ہے کہ سود بہت پہلے زمانہ سے تمام قوموں میں رائج ہے، برابر قومیں یکے بعد دیگرے سود لیتی رہیں، اور اس

زمانے میں ان کے لیے بہت سے انبیاءؑ اور رسول مبعوث ہوئے، مگر
کسی نے سود کو ناجائز قرار نہیں دیا، یہی وجہ ہے، کہ مسلمانوں کے سوا
اور قومیں جیسے یہود و نصاریٰ سود علانیہ لیتی ہیں ...."
اور چونکہ ان کے مذہب نے ہر قسم کے نفع اٹھانے کی اجازت دی
ہے، اس لیے وہ کوشش کرتے ہیں۔" (اودھ اخبار، جولائی ۱۹۰۹ء)

اس بنا پر سوال یہ ہے کہ کیا درحقیقت گذشتہ قوموں میں جو انبیاء اور رسول مبعوث ہوئے، اُن میں سے کسی نے سود کو ناجائز قرار نہیں دیا۔؟ حالانکہ بلاشک یہودی اور عیسائی قوموں کی موجودہ سودخواری کو دیکھ کر، ایک کوتاہ نظر شخص یہی نتیجہ نکالے گا کہ گذشتہ انبیاءؑ نے سود کو ناجائز نہیں قرار دیا، لیکن جب اس مقدمہ پر نظر کی جائے کہ کسی قوم کے اعمال و افعال سے اُس کے مذہبی احکام کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، تو یقیناً ہم کو صحفِ انبیاءؑ کی طرف توجہ کرنی پڑے گی، گو مسلمان موجودہ صحفِ انبیاءؑ کو تحریف و مسخ سے بہت کم محفوظ مانتے ہیں، تاہم اگر یہ ثابت ہو جائے، کہ حرمتِ سود پر تمام کتبِ سماوی بالاجماع متفق ہیں، اور اکثر انبیاءؑ نے سود کو ناجائز قرار دیا ہے، تو یہ بالکل واضح ہو جائے، کہ قرآن مجید صحفِ ماسبق کی تصدیق کرتا ہے، جیسا کہ اس نے بار بار اس کا دعویٰ کیا ہے، سود کا رواج دنیا میں اور ہزاروں برائیوں کی طرح نہایت ابتدا سے ہے، اہلِ مصر، کلدانی اور فنیشین کے بعد سب سے قدیم متمدن یونانی قوم ہے، یونان میں سود کا رواج تھا، لیکن اس سے جو اخلاقی نقصانات

پیدا ہوتے ہیں، اُن سے ہم لوگ واقف ہیں، یونان کا ارسطو گو نبی نہ تھا، لیکن قوم کا فلاسفر اور مصلح تھا، اُس نے ایک عام اصول قائم کر دیا:

روپیہ، روپیہ کو نہیں پیدا کرتا ہے [1]

یونان کے بعد روم کا درجہ ہے، روم میں سود کا نہایت عام رواج تھا، اور ہم کو نہیں معلوم کہ روم میں کسی حکیم یا مصلح قوم نے اس ناجائز منافع کے مٹانے کی کوشش کی، یا نہ کی، لیکن ہم اس سے واقف ہیں، کہ اس ظالمانہ طریق معاش سے مہاجنوں کے سوا اور تمام لوگ نالاں تھے، گو مفتوحہ اقوام سے چھین چھین کر خاص رومیہ میں دولت کا بہت کچھ حصہ جمع ہو گیا تھا، لیکن دار الحکومت کے علاوہ تمام صوبہ مفلس تھا، رومیہ میں یہ ممکن تھا، کہ چار یا پانچ فی صدی روپیہ مل جائے، لیکن اور صوبوں میں بارہ فی صدی سے کم پر روپیہ نہیں مل سکتا تھا، اس لیے مہاجن رومیہ سے ادنیٰ شرح سود پر روپیے لیتے تھے اور صوبوں میں گرانقدر منافع پر لوگوں کو دیتے تھے، اگر قرض دار میعاد پر اصل مع سود ادا نہ کر دیتا، تو مہاجن نہایت برے طرح روپیہ وصول کرتے تھے [2]

ایشیا کے بعض شہروں نے کسی جنگ کے موقع پر ۸۴ء میں ایک بڑی رقم

---

[1] دا کرس پولیٹیکل اکانمی بیان "یوژری لاز" [2] ترجمہ عربی ہسٹری آف دی سویلزیشن مؤلفہ مسیو شاؤل سینابوس ص ۲۵۴، و ۲۵۵۔

قرض لی، چودہ سال کے بعد ۱۸۴۰ء میں سود اصل سے چھ گنا زیادہ ہوگیا، مہاجنوں نے اس سختی سے روپیہ کی وصولی شروع کی، کہ قرضداروں کو مجبوراً اپنی عزیز اولاد کو بیچ کر قرض ادا کرنا پڑا، اس واقعہ کے چند ہی سال بعد بروٹس نے جو ایک مشہور رواقی حکیم اسٹوئیشین تھا، اس نے قرض میں شہر سلامینہ کے لیے ۴۸ روپیہ فی صدی سود پر ایک رقم قرض لی، کچھ مدت کے بعد جب اصل رقم مع سود کا تقاضا کیا گیا، تو شہر سلامینہ اتنی بڑی کثیر رقم ادا نہ کرسکا، آخر قرض خواہوں نے فوجی طاقت سے سلامینہ کے پارلیمنٹ ہاؤس کا محاصرہ کرلیا، اور یہ محاصرہ اتنا طویل ہوگیا، کہ پارلیمنٹ کے پانچ ممبر بھوک سے مرگئے،[1]

توراۃ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانے میں جو قرضدار وقت پر اصل مع سود کے ادا نہیں کرسکتے تھے، قرض خواہ ان کی تمام جائداد و املاک پر قبضہ کرلیتے تھے، اور ان کو غلام بنالیتے تھے انگلینڈ میں بھی لوگ سودی کاروبار کرتے تھے، لیکن حکومت کی طرف سے اس کی اجازت نہ تھی، گورنمنٹ نے ۱۵۴۶ء میں یہ قاعدہ جاری کیا، کہ دس فی صدی تک سود لیا جاسکتا ہے۔ ایڈورڈ ششم کے عہد میں یہ حکم پھر منسوخ ہوگیا، بلکہ الزبتھ نے اپنے عہد میں سودی معاملہ کو جائز کردیا، اور رفتہ رفتہ پانچ فی صدی شرح سود قائم ہوگئی،[2]

---

[1] ترجمہ عربی ہسٹری آف دی سویلیزیشن مؤلفہ مسیو شاڈل سینا بوکرص ۲۵۴، ۲۵۵ [2] دائرۃ المعارف لاروس

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ موجودہ ایشائی سلطنتیں، یورپ کے پنجوں میں صرف اس لیے گرفتار ہیں، کہ ان کو یورپین بنکوں کے سود سے کبھی نجات نہیں مل سکتی، اس لیے یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے، کہ یورپ کے بنک بعض ایشیا کے سود پر جیتے ہیں، ہندوستان کے اکثر اہل وجاہت صرف اس لیے برباد ہو رہے کہ وہ قرضوں کا سود نہیں ادا کر سکتے،

ان تمام مذکورۂ بالا واقعات واسباب کی بنا پر ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ سود سے حسب ذیل خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، جن سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں،

(۱) پولیٹکل اکانمی کے رو سے بجائے اس کے کہ روپیہ ملک میں پھیل کر عام سرسبزی اور خوش حالی پیدا کرے، صرف چند اشخاص تک محدود ہو جاتا ہے،

(۲) اس سے قوم میں کاہلی اور سستی کا مادہ پیدا ہوتا ہے، کیونکہ بجائے اس کے کہ وہ خود کسب معاش کے لیے کوشش اور محنت کرے صرف انکا روپیہ جو اس نے قرض دیا ہے ہر جگہ کام کر رہا ہے،

(۳) سود سے اخلاقی حالت کو نہایت سخت نقصان پہنچتا ہے، مہر و محبت اور رحم و شفقت کی روح معدوم ہو جاتی ہے، انسان سنگ دل اور بے رحم ہو جاتا ہے،

(۴) انسان بلا استحقاق روپیہ حاصل کرتا ہے، جو درحقیقت ظلم ہے، اسی لیے قرآن مجید میں جہاں خدائے پاک نے سود کی ممانعت کی یہ فرمایا ہے،

لا تظلمون ولا تظلمون، نہ تم کسی دوسرے پر ظلم کرو، نہ تم پر کوئی دوسرا ظلم کرے،

اِن تمام وجوہ کی بنا پر یہ کیونکر ہو سکتا تھا، کہ جس چیز سے اخلاقی روح کو اس قدر صدمہ پہنچے، انبیاء (علیہم السلام) اپنے پیرودں کو اس سے باز رہنے کا حکم نہ فرمانے، چنانچہ ہم تورات، زبور، اور انجیل کے حوالوں سے یہ ثابت کر دیں گے، کہ تمام دیگرانبیا علیہم السلام نے بھی سود کی سخت ممانعت کی ہے،

تورات | سب سے پہلے اولیں کتب آسمانی تورات میں حضرت موسیٰؑ کی معرفت یہ کہا گیا،

اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے، کچھ قرض دیوے تو اس پر بہت تقاضا مت کر، اور اس سے سود مت لے، اور اگر تو اپنے ہمسایہ کے کپڑے گرو لیوے، تو چاہیے کہ تو سورج ڈوبتے ہوئے اسے پہنچا دے[1]۔

اور احبار میں حسب ذیل حکم دیا گیا،

اور اگر تمہارا بھائی تمہارے بیچ میں محتاج اور تہی دست ہو جائے، تو اُس کی دست گیری کرو، خواہ وہ اجنبی ہو، خواہ مہمان، تاکہ وہ تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے، تو اس سے سود اور نفع مت لے، اور اپنے خدا سے ڈر تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے، تو اسے سودی روپیہ قرض مت دے، نہ اسے نفع کے لیے کھانا کھلا، میں

---

[1] خروج باب، درس۔ ۲۵-۲۶ ۔

خداوند تمہارا خدا ہوں، جو تم کو زمین مصر سے نکال لایا، تاکہ تمہیں
کنعان کی زمین دوں، اور تمہارا خدا ہوں[1]۔

استثنا میں ان الفاظ میں یہ حکم دہرایا گیا،

اور تو اپنے بھائی کو سودی روپیے اور سودی طعام یا اور کوئی چیز سودی
عاریت اور قرض مت دیجیو، تو مسافر کو سودی قرض دے سکتا ہے،
پر اپنے بھائی کو سودی قرض مت دیجیو، تاکہ خداوند تیرا خدا اس
سرزمین میں جس کا تو وارث ہونے جا رہا ہے، جس کام میں تو دست
انداز ہو تجھے برکت دیوے[2]۔

مذکورۂ بالا عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ شریعت موسوی میں خود بنی اسرائیل سے سود لینا یقینی ناجائز تھا، مگر غیر قوم (مسافر) سے بنی اسرائیل سود لے سکتے تھے، مگر احبار کے جو درس ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، (خواہ اجنبی ہو یا مہمان) ان سے ہر قسم کے سود لینے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، لیکن یہودیوں نے ان احکام پر بہت کم عمل کیا، وہ عام طریقہ سے سود لیتے تھے، اور نہایت سختی سے وصول کرتے تھے، اگر وقت پر قرضدار سود مع اصل نہ ادا کر دیتا، تو اس کی تمام جائداد ضبط کر لیتے تھے، اور اس کے تمام خاندان کو نہایت ذلت سے غلام بنا لیتے تھے، چنانچہ ان واقعات

---

[1] احبار باب ۲۵ درس ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸۔ [2] استثنا باب ۲۳ درس ۱۹، ۲۰۔

کو دیکھ کر نحمیا نبی نے ان کو حسب ذیل عبارت میں سود لینے سے روکا:

اور کتنے کہتے تھے، کہ ہم نے اپنے کھیتوں اور انگورستانوں کو گرو رکھ کر روپیہ قرض لیا ہے، کہ بادشاہ کے لیے مالگذاری ادا کریں، اور ہمارے جسم تو ہمارے بھائیوں کے جسم ہیں، اور ہمارے بال بچے ان کے بال بچوں کے مانند ہیں، اور دیکھیے ضرور ہے کہ ہم اپنے بیٹے اور بیٹیاں غلامی میں بیچیں، اور ہماری بیٹیوں میں سے کتنی لونڈیاں ہوئیں، اور ہم لاچار اور زیر دست ہیں، کیونکہ ہمارے کھیت اور انگورستان اور لوگوں کے ہیں، جب میں نے ان کی فریاد اور یہ باتیں سنیں، تو میں بہت رنجیدہ ہوا، اور میں نے اپنے من میں بچارا اور رئیسوں اور شحنوں سے جھگڑا کیا، اور انہیں کہا تم سود خور ہو کے ہر ایک اپنے اپنے بھائی پر ظلم کرتے ہو، اور میں نے ایک بڑی جماعت کو ان کے برخلاف پیدا کیا، ..... میں بھی اور بھائی میرے اور جوان میرے ان کو نقدی اور اناج قرض دے چکے ہیں، سو آؤ سب کے سب ہم یہ قرض بخشیں گے، ان کے کھیت اور ان کے باغ انگور کے اور زیتون اور ان کے مکان اور سواں حصہ نقدی کا اور اناج اور دیں، اور تیل کا، جو تم نے ان سے سود خوری کر کے لیا ہے، انہیں آج پھیر دیجیے۔[1]

---

[1] کتاب نحمیا باب ۵ عدد ۴ تا ۱۳

اس کے بعد یہودیوں میں پھر سود رائج ہوا، جس نے حزقیال نبی نے ذیل کے فقرات میں یہودیوں کو ردکا،

بلکہ اگر کوئی آدمی ٹھیک ہوگا، اور وہ کرتا ہے، جو شریعت میں ہے، اور ٹھیک ہے، ..... اور اس نے سود پر نہیں دیا، اور نہ نفع لیا، اور اپنا ہاتھ ناانصافی سے اٹھایا، اور انسانوں کے درمیان عدل جاری کیا، اور میری شریعتوں پر چلا، .... وہ یقیناً جیے گا، میرا خدا کہتا ہے[1]

(ترجمہ انگریزی ازیکیل)

اس ناجائز معاملہ کے متعلق پھر آگے چل کر مرقوم ہے،

اور وہ جو ان فرائض میں سے کوئی انجام نہیں دیتا .... اور سود پر دیا، اور نفع لیا، کیا وہ زندہ رہیگا، وہ نہیں زندہ رہے گا، اس نے تمام ناپاکیاں کی ہیں، وہ یقیناً مرجائے گا، اس کا خون اس کی گردن پر ہوگا۔ (ترجمہ انگریزی حزقیال، باب ۱۸ اعداد ۱۱ تا ۱۳)

پھر اسی اصحاح میں چند فقروں کے بعد ہے،

جس نے فقیر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا، اور جس نے نہ سود لیا، اور نہ نفع لیا، بلکہ میری شریعت جاری کی، اور میرے احکام پر چلا، وہ اپنے باپ کے گناہ سے نہ مرے گا، وہ یقینی زندہ رہے گا" (عدد ۱۷)

---

[1] حزقیال باب ۱۸ اعداد ۷، ۸، ۹

ان منقولہ فقروں سے بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے، کہ یہودیوں کے تمام انبیاء نے سود کو ناجائز قرار دیا، اور اپنے صحیفوں میں بطور حکم واجب کے اس کی ممانعت لکھ دی،

زبور | سود کے متعلق زبور میں حضرت داؤدؑ کی معرفت کہا گیا۔

"اے خدا! تیرے خیمے میں کون رہے گا، تیرے کوہ مقدس پر کون سکونت کرے گا، وہ جو سیدھی چال چلتا ہے، اور صداقت کے کام کرتا ہے، اور اپنے دل سے سچ بولتا ہے، وہ جو اپنی زبان سے چغلی نہیں کھاتا، اور اپنے ہمسایہ سے بدی نہیں کرتا، اور اپنے پڑوسی پر عیب نہیں لگاتا، وہ جس کی نظر میں نکما آدمی خوار ہے، پر وہ انہیں جو خداوند سے ڈرتے ہیں، عزت دیتا ہے، وہ جو اپنے ضرر پر قسم کھاتا ہے، اور بدلتا نہیں، وہ جو سود کے لیے قرض نہیں دیتا، اور بے گناہوں کے ستانے کے لیے رشوت نہیں لیتا، وہ جو یہ کرتا ہے، کبھی نہیں ٹلے گا۔"[۱]

انجیل | موجودہ انجیل میں چونکہ چند نصائح کے سوا احکام گویا بالکل نہیں ہیں، اس لیے سود کی حرمت کے متعلق اس میں کوئی فقرہ درج نہیں ہے، بلکہ حضرت عیسیٰؑ کی ایک تمثیل سے جس میں سود کا بیان آگیا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں بھی سود رائج ہو گیا تھا،

"... اس کے خاوند نے جواب دے کے اس سے کہا اے شریر اور

---

[۱] زبور سام ۱۵،

۔ سست نوکر تو نے جانا کہ میں کاٹتا ہوں، جو نہیں بویا، اور جمع کرتا ہوں، جو نہیں چھینٹا بس تجھے مناسب تھا، کہ میرا نقد صرافوں کو دیتا، کہ میں اسے سود سمیت پاتا۔ (متی باب ۲۵ درس ۲۶-۲۷)

لیکن پولوس (پال) کے خطوط سے جو عیسائیوں کے نزدیک تقریباً انجیل کا درجہ رکھتے ہیں، سود کی حرمت ثابت ہوتی ہے، پولوس نے تمطاؤس (ٹیموتھی) کے نام جو پہلا خط لکھا ہے، اُس میں حسب ذیل نقرہ ہے،

"اسی طرح مددگار بھی معتبر ہوئے، نہ کہ دو زبان یا شرابی یا ناروا نفع لینے والے"

تورات و زبور اور پال کے اس حکم کی بنا پر عیسائی بھی سود کو ناجائز سمجھتے ہیں، عیسائیوں کے لاہوت ادبی (فقہ) نے سود کی حلت و حرمت کی حسب ذیل تشریح کی ہے،

فقراء سے سود لینا یا اس قسم کے مال پر سود لینا جو بعینہٖ استعمال کیا جاتا ہے، اور وہ پہلے ہی استعمال سے صرف ہو جاتا ہے، (مثلاً آٹا) قطعاً حرام ہے، نیز ارباب ثروت سے اگر حد انصاف سے زیادہ سود لیا جائے، تو وہ بھی حرام ہے۔ لیکن مندرجۂ ذیل پانچ صورتیں، حرمتِ ربا سے مستثنیٰ ہیں، گو ان مستثنیٰ صورتوں کا بیان علمائے لاہوت کے اجتہاد کے سوا کتبِ مقدس میں کہیں مذکور نہیں،

(۱) قرض دینے سے قرض خواہ پر کسی خطرہ کا خوف ہو،

(۲) قرض میں جو مال دیا گیا ہو، وہ اس قسم کا ہو، کہ قرض خواہ اس کو اپنے پاس رکھ کر کسی فائدہ میں لگا سکتا ہو۔

(۳) اصل راس المال (قرض) کے ڈوب جانے کا خوف ہو،

(۴) وقت معین پر قرضدار روپیہ نہ ادا کرے،

(۵) ملکی قانون کی بنا پر سود کی کوئی ایسی مقدار مقرر کر دی جائے جو حد انصاف سے خارج نہ ہو،

تین پہلی صورتوں پر تمام علمائے لاہوت کا اتفاق ہے، لیکن چوتھی اور پانچویں صورتوں میں بعض علمائے لاہوت نے اختلاف کیا۔ لیکن فتوی اکثر رائے پر ہوا،[1]

قرآن مجید | عرب میں یہودی قومیں کثرت سے آباد تھیں، اور وہ عام طریقہ سے نہایت سختی کے ساتھ سود لیتی تھیں جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے،

فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبٰت احلت لھم وبصدھم عن سبیل اللہ کثیراً واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ ۔	جو لوگ یہودی ہیں، ان پر بوجہ اس کے کہ وہ ظلم کرتے ہیں اور خدا کے راستے سے لوگوں کو بہت روکتے ہیں، اور سود لیتے ہیں، ہم نے ان کے لیے وہ پاک چیزیں جو ان کے لیے حلال تھیں، حرام کر دیں، حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے،
(نساء-۲۲)	

[1] دائرۃ المعارف ج ۸ ص ۵۱۰،

یہودیوں کے اثر سے عرب میں بھی سود کا رواج پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ حضرت عباسؓ بن عبد المطلب اس قسم کا کاروبار کیا کرتے تھے[1]، جب یہ لوگ ایمان لائے، تو ان آیتوں میں خدا نے اس ناجائز منافع سے روکا،

الذین یاکلون الربوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطن من المس ذالک بانھم قالوا انما البیع مثل الربوا واحل اللہ البیع وحرم الربوا فمن جاءہ موعظۃ من ربہ فانتھی فلہ ما سلف

جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ (قیامت میں) اس شخص کی طرح اٹھیں گے، جس کو شیطان نے جنون سے مخبوط کر دیا ہے، اور یہ اس لیے کیا کہ انھوں نے کہا کہ بیع بھی ربا ہی کے مثل ہے اور خدا نے بیع کو جائز کیا، اور سود کو حرام کیا، تو جس کو خدا کی نصیحت پہنچی، اور وہ سود سے رک گیا، اس کو صرف راس المال لینا چاہیے

(بقرہ ۳۸)

سورۂ بقرہ میں پھر دوسری جگہ ارشاد ہوا،

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ وان تبتم فلکم

مسلمانو! لوگوں کے ذمہ تمہارا جو سود باقی رہ گیا ہے، اگر تم ایمان والے ہو تو چھوڑ دو، اور اگر ایسا نہ کرو، تو خدا اور رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، اور اگر تم باز آؤ، تو صرف

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری ج ۳ ص ۶۳ و ۶۵

رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون۔ (بقرہ۔ ۳۸)

راس المال تمہارا ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ تم پر کوئی ظلم کرے،

جو لوگ اصل راس المال سے دوگنا اور چوگنا سود وصول کرتے تھے، اُن کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ (آل عمران۔ ۱۴)

مسلمانو! دوگنا نہ چوگنا سود نہ کھاؤ، اور خدا سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو،

اکثر لوگ اس خیال سے سود لیتے ہیں کہ ان کی دولت و ثروت میں اضافہ ہو، لیکن خدا کے نزدیک بحیثیت طہارت اور روحانیت کے اس میں کچھ ترقی نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ اس آیت پاک کا مفہوم ہے،

وما آتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ۔ (روم۔ ۴)

اور جو تم نے سود دیا کہ وہ لوگوں کے مال میں بڑھتا رہے تو وہ خدا کے نزدیک نہیں بڑھتا۔

تصریحات بالا سے اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہودی، عیسائی، مسلمان، اور بعض دیگر فرقوں میں متفقاً سود حرام ہے۔ اور تمام انبیاء نے بالاجماع ایسی ناجائز کسب معاش سے لوگوں کو روکا ہے، کیا ایسی متفق علیہا ناجائز شے کے حلال کرنے کی جرأت کی جا سکتی ہے،

(الندوہ جون ۱۹۰۹ء)

قیامت

مسلمانوں کا عقیدہ ہے، کہ دنیا کی موجودہ حرکت ایک دن فنا ہو جائے گی، ہر قسم کی زندگی وحیات معدوم ہو جائے گی، نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا، آفتاب ماہتاب، زمین، پہاڑ، ہر چیز منتشر اور پراگندہ ہو جائے گی، اور ایک متنفس بھی روئے زمین پر باقی نہ رہے گا، اس کے بعد دنیا کا ایک دوسرا دور آئے گا، تمام مخلوق زندہ ہوگی، اور اپنے اعمال کی سزا و جزا پائے گی،

قیامت سے ہماری مراد دورِ اول ہے، دورِ ثانی حشر و نشر ہے،

قرآن مجید میں قیامت کا بار بار ذکر آیا ہے، اور خدا نے ہر جگہ اس کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے، چنانچہ استقصا سے قرآن مجید میں قیامت کے حسبِ ذیل نام آئے ہیں،

(۱) یوم القیامہ — اٹھنے کا دن

(۲) الساعۃ — گھڑی

(۳) القارعہ — کھڑکھڑانے والی، متنبہ کرنے والی،

(۴) الغاشیہ — ڈھانکنے والی، چھا جانے والی،

(۵) الطّامۃ الکبریٰ — مصیبتِ عظیم

(۶) النبأ العظیم — بڑی خبر

(۷) الیوم الحق — روزِ حق

(۸) الحاقّہ — ضرور آنے والی ساعۃ

(۹) الوعد — وعدہ

(۱۰) الواقعۃ — واقع ہونے والی،

(۱۱) امر اللہ — خدا کا حکم

(۱۲) یوم الآزفۃ — قریب کا دن

(۱۳) یوم معلوم — روزِ معین

(۱۴) الصّاخۃ — بہرا کرنے والی

(۱۵) الوقت المعلوم — وقتِ مقرر

(۱۶) الیوم الآخر — آخر دن

لیکن یہ تمام نام جیسا کہ ترجمہ سے معلوم ہو سکتا ہے، درحقیقت قیامت کے اصلی اور موضوع لہ نام نہیں ہیں، بلکہ قیامت کے مختلف صفات کے لحاظ سے خدا نے اس کو مختلف اوصاف سے بیان کیا ہے۔

عقائد کے اکثر مسائل ایسے ہیں، جن کے ثبوت اور طرزِ ثبوت میں اسلام کے مختلف فرقے مختلف الرائے ہیں، لیکن ابن حزم نے ملل میں لکھا ہے کہ "قیامت کے

اعتقاد پر کل فرقہائے اسلامیہ کا اتفاق ہے، لیکن یورپ، یونان، اور ہندوستان کے اکثر حکمار کو قیامت وفنائے عالم سے انکار ہے، آریوں میں پرلے اور عیسائیوں کے ہاں بادشاہت کے دن کا اعتقاد مسلمانوں کی قیامت کے مرادف ہے،

فلاسفۂ ہندوستان کا مدار انکار صرف مسئلہ تناسخ پر ہے، جس میں نفوس وارواح کا ابد تک کے لیے جسمانی ہیکل میں مقید ہونا تسلیم کیا گیا ہے، مسئلہ تناسخ کے اثبات پر جتنے دلائل پیش کیے گئے ہیں، وہ اس قدر کمزور اور بے بنیاد ہیں کہ جن کے ابطال کے لیے کسی مزید کوشش کی ضرورت نہیں، ابطالِ تناسخ پر جو دلائل اسلام میں موجود ہیں، اُن کو چھوڑ کر یہ دلائل یہ ہے،

(۱) گائے، بیل، بکری، اونٹ، خچر، گھوڑا، ان تمام انواع کا وجود نوعِ انسانی کی طرح براسہ اور مستقل ہے، یا یہ تمام انواع مجرم و بدکردار انسانوں کی متغیر صورتیں ہیں، صورت اول دعوائے تناسخ کے منافی ہے، اور دوسری صورت میں لازم آتا ہے، کہ انسان پر ایک ایسا دور بھی گذرا ہے جب وہ دنیا کا تنہا باشندہ تھا، اور اس وقت اس کی صورت، معاش و طرز زندگی، اس موجودہ صورت معاش و طرز زندگی کے خلاف ہوگی، جس میں ہم بالکل مختلف انواع کے وجود کے محتاج ہیں، اور اس نتیجہ کو کوئی عاقل تسلیم نہ کرے گا، نیز انسان کا وجود حیوان سے پہلے ہونا، فلسفۂ حال کے خلاف ہے،

(۲) مدعیانِ تناسخ کا بیان ہے کہ جب ایک مجرم انسان، انسانی قالب میں

گنہ گار ہوتا ہے، تو اس کو اس کے گناہ کے مناسب، جانور کی صورت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، تاکہ بعد تحصیل کمال اس کو ترقی دی جائے، لیکن اس کو کون تسلیم کرے گا، کہ جب ایک انسان، انسانی قالب میں کمالاتِ انسانی حاصل نہ کر سکا، تو حیوانی قالب میں جو انسانی قالب سے ناقص تر ہے، وہ کیونکر ترقی کر سکتا ہے،

(۳) تمام اہلِ مذاہب کا اتفاق ہے، کہ نفسانی کمالات کا تمامتر دار و مدار عقائد و اخلاق پر ہے، اس بنا پر تناسخ کے رُد سے لازم آتا ہے، کہ حیوانات سے بھی جو مجرم انسان کی ترقی کے حیوانی قالب ہیں، عقائد و اخلاق کا صدور ہو، لیکن عقائد و اخلاق جو خالق اور مخلوق کے درجات و حقوق کی رعایت کا نام ہے، تجربہ نے حیوانات سے اُن کا صدور اب تک ثابت نہیں کیا،

(۴) مدعیانِ تناسخ دنیا کے موجودہ نظام کے قدم کے قائل ہیں، اور ہر مذہب کی کوشش یہ ہے، کہ تمام انسان نیک کردار، متقی اور روحانی ہو جائیں، اس بنا پر اگر یہ فرض کر لیا جائے، کہ تمام نفوسِ انسانی متقی اور نیک کردار ہو جائیں، تو دنیا کا یہ تنوع جو انسان کے مدارجِ ترقی ہیں اور جس پر نظامِ عالم قائم ہے، فوراً درہم برہم ہو جائے۔

(۵) حامیانِ تناسخ کا بیان ہے، کہ انسان جب بدکار ہوتا ہے، اور بداخلاقیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، تو جس قسم کی بداخلاقی اس میں پائی جائے گی، اسی قسم کے حیوان کی صورت میں وہ دوسرا جنم لے گا، مثلاً ایک انسان خوشامدی ہے، اس کو کتے یا بلی کا

جنم ملے گا، دوسرا چور ہے وہ چوہے کی صورت میں پیدا ہوگا، تیسرا ظالم اور ستمگر ہے، وہ بھیڑیے کی شکل میں نمودار ہوگا، اس بنا پر اس وقت یہ بڑی مشکل ہوگی، کہ اگر ایک انسان بیک وقت ہر قسم کی بداخلاقیوں کا جامع ہو، یعنی وہ چور بھی ہو، خوشامدی بھی ہو، ظالم اور ستمگر بھی ہو، اور بہت سے دوسرے متضاد اوصاف سے متصف ہو، تو پھر اس کی دوسری پیدائش کے لیے اسی قسم کا متضاد الاخلاق اور جامع الاوصاف عجیب الخلقت جانور پیدا کرنا ہوگا،

(۶) ایک انسان خوشامدی ہے، اس کو بلی کا جنم ملا، تاکہ وہ کمال روحانی حاصل کرے، یہ کتنا عجیب مضحکہ خیز امر ہے، کہ انسان ہو کر تو وہ خوشامدی رہا، کیا وہ بلی بن کر آزاد رائے، آزاد خیال اور حامئی حق ہوگا،

ان وجوہ کی بنا پر یہ بالکل ظاہر ہے، کہ تناسخ کے پیچ در پیچ سلسلوں کے اعتماد پر فنائے عالم اور قیامت کے اعتقاد کا انکار نہیں کیا جا سکتا، یونان کا حکیم انکار قیامت پر اس طرح دلیل قائم کرتا ہے، ہیولیٰ صورت جسمیہ سے الگ نہیں ہو سکتا، ہیولیٰ قدیم ہے، اس لیے صورت بھی قدیم ہے، جب صورت اور ہیولیٰ دونوں قدیم ہیں، تو جسم جو ان دونوں کی ترکیب سے پیدا ہوا ہے، وہ بھی قدیم ہوگا، جسم ایک حقیقت ہے، اور ہر حقیقت کے لیے جنس ضروری شے ہے، اور جنس کا وجود بغیر نوع کے نہیں ہو سکتا، اور نوع کا وجود افراد کے وجود سے الگ نہیں ہوتا، اس لیے تمام اجناس و انواع بالذات اور ان کے افراد علی سبیل البدلیت قدیم اور ناقابل فنا ہیں،

یہ دلیل کس قدر کمزور ہے، اولاً ان مسلسل غلط لوازم کو کون تسلیم کرے گا، ثانیاً اس دلیل سے صرف اسقدر ثابت ہوتا ہے، کہ دنیا میں کوئی حقیقت ہمیشہ رہے گی، اور حقیقت کے لیے کوئی جنس اور جنس کے لیے کوئی نوع اور نوع کے لیے کچھ افراد ضروری الوجود اور قدیم ہیں، اور یہ ایک ایسا نتیجہ ہے، جو ہمارے دعویٰ کے منافی نہیں (جیسا کہ ہم آگے چل کر ثابت کریں گے) ممکن ہے کہ قیامت میں عالم غیر زندہ یا دہ کا توٹ ہو، جس کے ضمن میں حقیقت جنس نوع، افراد کا وجود متحقق ہو گا، بہرحال یونانیوں کی اس دلیل سے تمام انواعِ موجودہ کی قدامت نہیں ثابت ہوتی ہے، جو اعتقاد قیامت کے خلاف ہو،

یورپ کے ملحدین و مادہ پرست بھی قیامت کے منکر ہیں، لیکن ان کا یہ انکار درحقیقت اس خیال کا نتیجہ ہے، کہ مادہ قدیم ہے، اور تورات عالم کو فنا نہیں، لیکن یہ سمجھنے کا مقام ہے، اول تو عدم فنائے مادہ کی بحث خود محتاج دلیل ہے، ثانیاً قیامت کا اعتقاد اس بات کا مستلزم نہیں، کہ فنائے مادہ تسلیم کر لیا جائے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا،

علامہ تفتازانی نے شرح مقاصد میں لکھا ہے، کہ قیامت کے متعلق متکلمین اسلام میں تین فرقے ہیں،

(۱) ایک فرقہ کا خیال ہے، کہ قیامت میں تمام اجسام فنا ہو جائیں گے، اور مادہ کا ایک ذرہ بھی موجود نہ رہے گا،

(۲) دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ قیامت میں صرف اجسام کی زندگی اور حیات معدوم ہو جائے گی، اور اجزا منتشر و متفرق ہو جائیں گے، ذرات مادہ کا غیر منتظم حالت میں عالم میں وجود باقی رہے گا،

(۳) امام الحرمین اور اُن کے پیرو، اس مسئلہ میں ساکت ہیں،

پہلا فرقہ اپنے دعویٰ پر حسب ذیل آیتوں سے استدلال پیش کرتا ہے،

الف، ھوالاول والآخر وہی اول اور وہی آخر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ خدا ہی کا وجود اول اور آخر ہے،

ب، کل شیٔ ھالک الا وجھہ، خدا کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے،

ج، کما بدانا اول خلق نعیدہ، جس طرح میں نے پہلی پیدائش شروع کی، اسی طرح میں پھر دوبارہ بناؤں گا،

خدا نے اول پیدائش کی، پیدائش ثانی کے ساتھ جو قیامت کے بعد ہوگی، تشبیہ دی، پہلی پیدائش عدم محض سے ہوئی، اس لیے اس تشبیہ سے لازم آتا ہے، کہ دوسری پیدائش بھی عدم محض سے ہوگی، جس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت ہونے پر ہر چیز معدوم محض ہو جائے گی۔

وکل من علیھا فان زمین پر جو چیز ہے، وہ سب فنا ہو جائے گی،

لیکن یہ نہایت کمزور استدلالات ہیں، امام رازی نے محصل میں ان تمام دلائل

کی دھجیاں اُڑا دی ہیں، خدا کے اول و آخر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا، کہ قیامت میں ایک ایک ذرہ عالم کا فنا ہو جائے گا، بلکہ اس آیت کے صرف معنی یہ ہیں، کہ خدا کا غیر متغیر وجود ازل میں بھی تھا، اور ابد میں بھی رہے گا، دوسری دلیل کہ خدا کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، اس سے بھی فنائے عالم کا ثبوت لازم نہیں ہوتا، ہلاک کے معنی فنائے محض کے نہیں ہیں، بلکہ بطلانِ حیات اور موت کے ہیں، اور یہ صحیح ہے، کہ خدا کے سوا ہر چیز مرنے والی ہے،

تیسری دلیل کی صحت اس بات پر موقوف ہے، کہ یہ تسلیم کر لیا جائے، کہ مشبہ کو مشبہ بہ کے ساتھ ہر حالت میں اشتراک ہوتا ہے، اور یہ بالکل فن بلاغت کے قواعد کے خلاف ہے، ہم بہادر انسان کو شیر سے، قطرۂ شبنم کو موتی سے، چہرہ کو آفتاب سے تشبیہ دیتے ہیں، لیکن وجہ تشبیہ کے سوا، اکثر وجوہ سے مشبہ اور مشبہ بہ کی حالتوں میں اختلاف ہے، اس آیت میں صرف منکرین معاد کے سوال کا جواب دیا گیا ہے، جن کا یہ قول تھا، کہ جب ہماری ہڈیاں سڑ گل جائیں گی، ہمارے جسم کا ایک ایک ذرہ منتشر و پراگندہ ہو جائے گا، تو خدا ہم کو کس طرح زندہ کرے گا، خدا نے ان کا جواب دیا ہے، کہ جس طرح خدا نے تم کو پہلے بنایا، دوبارہ بھی تم کو بنا سکتا ہے،

چوتھی آیت سے استدلال یہ ہے، کہ زمین پر جو چیز ہے، وہ سب فنا ہو جائیگی، لیکن اس آیت سے بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی، کہ وہ تمام چیزیں فنا ہو جائیں گی، مطلق فنا کے معنی صرف عدم حیات کے ہیں، اور یہ بالکل صحیح ہے، کہ انسان، جانور

پرند، درخت، زمین پر جتنی چیزیں ہیں، وہ سب معدوم الحیات ہو جائیں گی، اس کے علاوہ یہ آیت خود زمین کی معدومیت و فنا سے خاموش ہے، بلکہ اس کے بقا کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

امام الحرمین نے اس مسئلہ میں سکوت اختیار کیا ہے، علامہ تفتازانی بھی ان کے ہم زبان ہیں، لیکن اس سکوت پر بغیر کچھ بولے رہا نہیں جاتا، قرآن مجید نے قیامت کے متعلق جہاں ذکر آیا ہے یہ تصریح کر دی ہے، کہ قیامت میں صرف تفرقِ اجزاء اور نظامِ عالم کا فساد ہوگا، مادہ کی غیر منتظم حالت باقی رہے گی، چنانچہ امام رازی نے محصل میں، امام غزالی نے رسائل میں، ابن تیمیہ نے کتاب العقل میں اسکی تصریح کر دی ہے۔

ہم کو اس سے انکار نہیں ہے، کہ قدامتِ عالم اور عدمِ فنائے مادہ معتقداتِ اسلام کے خلاف ہے اور قدامتِ مادہ کا دعویٰ نہایت کمزور و بے بنیاد ہے، لیکن ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں، کہ قیامت کے متعلق قرآن مجید کی تعلیم فنائے محض و عدمِ صرف کی نہیں ہے، بلکہ یہ تعلیم ہے، کہ موجودہ نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا، چاند، ستارے، زمین، پہاڑ، سب منتشر ہو جائیں گے، زندگی معدوم ہو جائے گی، یہ اعتقاد قدامتِ مادہ کے خیال کو مستلزم نہیں ہے، ممکن ہے کہ مادہ ازل میں حادث ہوا ہو، قرآن مجید میں جا بجا اس کی تصریح ہے، کہ قیامت صرف تفرقِ اجزاء اور فسادِ نظام کا نام ہے، چنانچہ قرآن مجید میں جہاں جہاں قیامت کا ذکر ہے، اس کا صاف اشارہ

موجود ہے، ذیل میں اس کے ثبوت میں ہم آیتیں نقل کرتے ہیں،

القارعة ما القارعة وما ادراك	متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے، متنبہ کرنے والی
ما القارعة یوم یکون الناس	اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنیوالی
کالفراش المبثوث وتکون الجبال	یہ وہ دن ہے، جب لوگ پریشان پروانوں
کالعھن المنفوش ۔ (القارعہ)	کی طرح اور پہاڑ، روئی کے گالوں کی طرح ہونگے،
اذا زلزلت الارض زلزالھا، و	جب زمین خوب ہلائی جائے گی، اور زمین
اخرجت الارض اثقالھا وقال	اپنا بوجھ نکالے گی، اور انسان کہے گا، کہ زمین
الانسان مالھا یومئذ تحدث	کو کیا ہوا، اس دن زمین اپنی حالت بیان
اخبارھا ۔ (زلزال)	کرے گی،
اذا السماء انشقت واذنت لربھا	جب آسمان پھٹ جائیں گے، اور وہ اپنے
وحقت واذا الارض مدت	مالک کی فرماں برداری کریں گے، اور وہ
والقت ما فیھا وتخلت	فرماں برداری کے لائق ہیں، جب زمین پھیلائی
	جائے گی، اور جو کچھ اس میں ہے، وہ ڈال دیگی
(انشقاق)	اور وہ خالی ہو جائے گی،
اذا السماء انفطرت واذا الکواکب	جب آسمان پھٹ جائیں گے، جب
انتثرت واذا البحار فجرت واذا	ستارے بکھر جائیں گے، جب دریا چلائے
القبور بعثرت علمت نفس ما	جائینگے قبر کے لوگ زندہ کئے جائیں گے،

قدمت واخرت،	روحوں نے جو پہلے اور پیچھے بھیجا ہے، اُس وقت
(انفطار)	جان لیں گی،
اذا الشمس کورت واذا النجوم انکدرت	جب آفتاب اندھیرا کیا جائے گا، جب ستارے
واذا الجبال سیرت واذا البحار سجرت	تاریک ہو جائیں گے، جب پہاڑ چلائے
(تکویر)	جائیں گے، جب دریا جوش دیا جائے گا،
انما توعدون لواقع فاذا النجوم طمست	جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، وہ یقیناً
واذا السماء فرجت واذا الجبال نسفت	ہونے والا ہے، جب ستارے ماند کر دیے
	جائیں گے، جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے
(مرسلات)	جائیں گے۔
فاذا برق البصر وخسف القمر	جب نگاہ ماند ہو جائے گی، جب ماہتاب
وجمع الشمس والقمر،	بے نور ہو جائے گا، اور آفتاب و ماہتاب
(سورہ قیامہ)	اکٹھا کر دیے جائیں گے۔
یوم تکون السماء کالمھل وتکون	جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح
الجبال کالعھن	ہو جائے گا، جب پہاڑ روئی کے گالوں
(معارج)	کی طرح ہو جائیں گے
فاذا نفخ فی الصور نفخة واحدة	جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی،
وحملت الارض والجبال فدکتا	جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے،

دكة فيومئذ وقعت الواقعة	اور دونوں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے،
وانشقت السماء فهي يومئذ واهية	اس دن ہونے والی بات ہو جائے گی اور
	آسمان پھٹ جائے گا، اور اس دن کمزور
(الحاقہ)	ہو جائے گا،
يوم ترجف الارض والجبال و	جب پہاڑ اور زمین میں لرزہ ہوگا، اور
كانت الجبال كثيبا مهيلا۔ (مزمل-۲)	پہاڑ پھسلا ہوا تا بہ ہو جائے گا،
فكيف تتقون ان كفرتم يوما يجعل	کیونکر متقی ہو سکتے ہو، جب اس دن کا
الولدان شيبا السماء منفطر به	انکار کرتے ہو، جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا
وكان وعد الله مفعولا۔	آسمان اس دن پھٹ جائے گا، اور خدا
(مزمل)	کا وعدہ پورا ہو جائے گا،
يوم تبدل الارض غير الارض	جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی،
واذا انشقت السماء فكانت وردة	جب آسمان پھٹ جائیں گے، اور سرخ
كالدهان۔ (رحمن)	تلچھٹ کی طرح ہو جائیں گے،
اذا وقعت الواقعة ليس لوقعتها	جب ہونے والی بات ہو جائے گی جس کے
كاذبة خافضة رافعة، اذا	ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیر و زبر کر دینے
رجت الارض رجا وبست الجبال	والی، جب زمین خوب ہلائی جائے گی، اور
بسا فكانت هباء منبثا۔ (واقعہ)	پہاڑ پراگندہ کیے جائیں گے اس وقت

[illegible] وفتحت السماء فکانت ابوابا و سیرت الجبال فکانت سرابا (نبا)

وہ پریشان ذرات کی طرح ہوجائیں گے، اور آسمان کھول دیئے جائیں گے، اور وہ دروازے دروازے ہوجائیں گے، اور پہاڑ چلائے جائیں گے، تو وہ سراب ہوجائیں گے،

ان آیات سے قیامت کے معنی بالکل ظاہر ہوگئے، جن کے مطابق قرآن مجید کی تعلیم اور ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ نظام عالم کا ایک آخری دن ہوگا، جس میں دنیا کا موجودہ انتظام باطل ہوجائے گا، باشندگان زمین کی زندگی معدوم ہوجائے گی، نظام عالم کا مرکز آفتاب تاریک ہوجائے گا، ستارے پراگندہ اور منتشر ہوجائیں گے، ان کی روشنی مٹ جائے گی، زمین میں ایک سخت زلزلہ آئے گا، پہاڑ تصادم سے ریزہ ریزہ ہوجائیں گے دریا میں جوش پیدا ہوگا، عالم میں ایک شدید انقلاب ہوجائے گا،

اس سے پہلے ہم قیامت کے متعلق ہندوستان و یونان کے اکثر حکماء کا خیال ظاہر کرچکے ہیں، اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں، کہ قدیم حکمائے یونان اور فلسفۂ جدیدہ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے: راغب پاشا نے سفینہ میں لکھا ہے: کہ سقراط نے بالکل اسلامی اعتقاد کے مطابق قدیم فلسفہ کے موافق قیامت کا سبب یہ بتایا ہے کہ زمین پانی پر ہے، پانی ہوا پر ہے، ہوا آگ پر ہے، آگ کی گرمی روز بروز آس پاس کی ہواہیں اثر کرتی جائے گی، گرم ہوا کی حرارت سے پانی میں گرمی بڑھتی جائے گی،

پانی میں جوش و خروش پیدا ہوگا، جس سے زمین کا غیر معمولی حرارت سے متاثر ہو جانا یقینی ہے، آفتاب کی حرارت زمین کی اس گرمی کو اور زیادہ بڑھادے گی، جو گرم ابخرات زمین سے اٹھ کر اوپر جاتے ہیں، اور اوپر سے پھر نیچے آتے ہیں، وہ زمین کی گرمی میں دو چند سہ چند اضافہ کر دیں گے، ان تمام باتوں کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ ہوگا کہ زندگی برباد ہو جائے گی، پہاڑ پگھل جائیں گے، دریا میں غلیان پیدا ہوگا،

یہ قدیم خیال تھا، لیکن فلسفۂ جدیدہ نے جو نظام شمسی تسلیم کیا ہے، اس میں موجودہ نظامِ عالم کا وجود صرف اس بات پر موقوف رکھا ہے، کہ مادہ کی حرارت ہمیشہ باقی رہے، اگر یہ ثابت ہو جائے، کہ مادہ کی حرارت گھٹتی جاتی ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ فسادِ عالم یا قیامت ہے،

جیالوجی کے قاعدہ سے اس کی تفصیل یہ ہے، کہ ابتدا میں ذرات مادہ میں نہایت شدید حرکت و کشش تھی، حرکت نے حرارت پیدا کی، اور خود فطری حرارت بھی اس میں اس قدر تھی، کہ یہ بالکل پگھلا ہوا مادہ تھا، مدت کے بعد قلت حرارت اور کشش نے باہمی کسر و انکسار کے بعد ترکیب پیدا کی، ترکیب سے ذرات کی حرارت اندر بند ہو گئی، اس پر مزید حرکت و کشش نے التہاب و شعلہ کی حالت پیدا کی، یہ مرکب شے نہایت گرم کرہ کی شکل میں تھی، جو اپنے مرکز پر نہایت جلد جلد دوری حرکت کر رہی تھی، اور یہ قاعدہ ہے، کہ جو شے مرکز پر دوری حرکت کرتی ہے، وہ اپنے مرکز سے بھاگنا چاہتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اس گرم شعلہ نما کرہ سے اور بہت سے کرے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے، جن کا نام

اب چاند، زمین، مریخ، مشتری، نیپچون وغیرہ ہے، باہمی کشش کی بناپر ایک دوسرے کی گرد حرکت کرتے ہیں، لیکن وہ فطری گرم التہابی حالت روز بروز کم ہوتی گئی، زمین جس پر ہم آباد ہیں، یہ بھی موجودہ آفتاب کی طرح نہایت گرم اور مشتعل تھی، رفتہ رفتہ اس کی خارجی حرارت کم ہوتی گئی، اور قابل آبادی بنی، لیکن پھر بھی اب بھی اس میں اتنی حرارت موجود ہے، کہ اگر یہ کچھ زیادہ دور تک کھودی جائے، تو پگھلا ہوا مادہ اور زمین کی ابتدائی گرم حالت کے مشابہ حالت پائی جائے گی، زمین میں آتش فشاں پہاڑ، اور غیر معمولی حرارت کا موجود ہونا اس کی شہادت ہے۔

علمائے علوم جدیدہ کے آخری محقق کی رائے ہے کہ آفتاب میں جو غیر معمولی حرارت ہے، اور جس سے تمام نظام عالم قائم ہے، وہ زمین کی حرارت کی طرح روز بروز کم ہوتی جاتی ہے، اور ایک وقت ایسا آنے والا ہے، جب آفتاب کی یہ حرارت گرمی، روشنی معدوم ہوجائیگی، جس سے تمام نظام عالم برباد ہو جائے گا، اور زندگی معدوم ہو جائے گی، بعض علمائے یورپ نے حساب لگاکر وہ مدت بھی مقرر کر دی ہے، جب یہ موجود طلسم باطل ہوجائیگا اور آفتاب، ماہتاب، ستارے، زمین، پہاڑ، تصادم اور ٹکر کھا کر ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، اس وقت خدا کا یہ کلام سچا ہوگا۔

اذا السماء انفطرت واذا الکواکب انتثرت	جب آسمان پھٹ جائیگا، جب ستارے منتشر و پراگندہ
واذا البحار فجرت واذا القبور بعثرت	ہو جائیں گے، جب دریا بہائے جائیں گے، جب قبروں
علمت نفس ما قدمت واخرت۔	سے لوگ اٹھائے جائیں گے، اس وقت ہر جان نے جو پہلے اور پیچھے
(انفطار)	بھیجا ہے، وہ جان لیگی۔ (الندوہ، ستمبر ۱۹۰۶ء)

تحریمِ شراب

اسلام جن انسانی مصالح کا جامع ہے، اُن کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس نے انسان پر تمام مضرت رساں اشیاء کو حرام کر دیا ہے، جو انسان کے قویٰ اور دل و دماغ کو برباد کر دیتی ہیں، شراب جو انسان کے جسمانی اور دماغی قویٰ کے لیے زہرِ قاتل ہے، اسلام نے اپنے پیروؤں کو ہمیشہ کے لیے اس کے استعمال سے روک دیا ہے۔

شراب کا رواج قبل از اسلام عرب میں نہایت کثرت سے تھا، ہر قوم کا لٹریچر اس کے اخلاق و عادات کا آئینہ ہوتا ہے، شعرائے عرب کے مقدمات مدح کا جزو اعظم شراب ہوتا تھا، شراب پی کر مے خانہ میں مدہوش پڑا رہنا، اپنی ہر قسم کی جائداد اور مال و دولت کو بیچ کر شراب خریدنا، اور پینا اور پلانا ایک عربی شاعر کے لیے مدح کی انتہا ہے، عجم کے متعلق یہ کہنا واقعہ ہے کہ اگر اُن کی شاعری سے شراب کا عنصر الگ کر دیا جائے، تو ان کی شاعری بالکل بدمزہ ہو جائے، حتیٰ کہ عجمی شعرائے تصوف کے کلام میں بھی ساری مستی شراب کی ہے، شراب کا موجد بھی عجم کا شاہنشاہ جمشید تسلیم کیا گیا ہے، ان واقعات کا نتیجہ یہ تھا کہ ان ملکوں میں شراب نہایت کثرت سے پی جاتی تھی، اور از انئذِ دنیا میں شراب سب سے بہتر نعمت

سمجھی جاتی تھی، شاید اس کا سبب یہ ہو، کہ ان ممالک میں اسلام سے پہلے جو مذاہب رائج تھے، اُن میں شراب حرام نہ تھی،

تورات میں شراب کی حرمت کے متعلق کوئی حکم موجود نہیں ہے، بلکہ جا بجا کی عبارتوں سے ثابت ہوتا ہے، کہ اُس زمانے میں شراب حلال تھی، اور عام طور سے لوگ پیتے تھے، چنانچہ تورات پیدائش باب ۹ درس ۲۰ و ۲۱ میں لکھا ہے،

"اور نوح کھیتی باڑی کرنے لگا، اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا، اور وہ شراب پی کر نشہ میں آیا،"

انجیل بھی اور دیگر احکام کی طرح حرمتِ شراب کے حکم سے خالی ہے لیکن لوقا کی انجیل میں جہاں حضرت یحییٰ کی پیدائش کا ذکر ہے، یہ فقرہ بھی موجود ہے:

"اور بہتیرے اس کی پیدائش سے خوش ہوں گے، کیونکہ وہ خداوند کے حضور بزرگ ہوگا، اور شراب اور کوئی نشہ کی چیز نہیں پیئے گا" (باب اول درس ۱۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ شراب کا استعمال نبوت کے عہد اوسط میں خلافِ اتقا سمجھا جاتا تھا، لیکن قرآن مجید جو دنیا میں تکمیلِ مذہب کے لیے آیا ہے، اس نے شراب کے متعلق قطعی فیصلہ کر دیا۔

اسلام نے شراب کو نہ صرف حرام بلکہ خلافِ فطرت قرار دیا ہے، بخاری شریف میں مروی ہے، کہ اثنائے واقعاتِ معراج میں رسول اللہ صلعم کے سامنے شراب اور دودھ کے دو پیالے پیش کیے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پی لیا، اور شراب کا

پیالہ چھوڑ دیا، ناموس اکبر نے کہا جس خدا نے تم کو فطرت کی ہدایت کی، اس کی حمد کرتا ہوں، اگر تم شراب کا پیالہ اٹھاتے تو تمہاری تمام امت گمراہ ہو جاتی،

جس طرح اسلام اور اس کے احکام فطری ہیں، اسی طرح اس کا طریقۂ تعلیم بھی فطری ہے، اس نے اپنے متبعین کو شراب کی حرمت کا مسئلہ بالکل تدریجی طور سے بتایا کہ عرب آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ اپنی اس قدیم اور راسخ عادت کو چھوڑ سکیں، سب سے پہلے صحابہؓ کے سوال پر مکہ میں یہ آیت نازل ہوئی،

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما (بقرہ)

لوگ تم سے شراب اور قمار کی نسبت سوال کرتے ہیں، کہہ دو کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کے لیے ان میں منفعتیں بھی ہیں، لیکن ان کا گناہ ان کی منفعتوں سے بہت بڑھ کر ہے۔

اس آیت میں خدا نے شراب کی حرمت کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا، بلکہ صرف مسلمانوں کو یہ تعلیم فرمائی کہ شراب میں منافع بھی ہیں، اور مضرتیں بھی ہیں لیکن مضرت منفعت سے زیادہ ہے، اس آیت سے تین باتوں کا ثبوت ہوتا ہے،

۱۔ شراب میں بہت سے منافع ہیں،

۲۔ شراب میں بہت سی مضرتیں ہیں،

۳۔ لیکن اس کی مضرت کا حصہ اس کی منفعت سے زیادہ ہے،

یہ تمام وہ امور ہیں جن کا ثبوت آج تحقیقاتِ جدیدہ سے ہو رہا ہے، بے شبہ

شراب سے حرارت غریزی میں ترقی اور قوی میں تازگی پیدا ہوتی ہے لیکن جسمانی اور
دماغی قوی کو اس سے نہایت سخت صدمہ پہنچتا ہے،

چونکہ اس آیت میں شراب کی حلت وحرمت کا کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا گیا، اس بنا پر بعض محتاط صحابہ نے پینا چھوڑ دیا، اور بعض پیتے رہے، اس کے بعد ایک واقعہ یہ پیش آیا، کہ عبد الرحمن بن عوفؓ نے چند آدمیوں کی دعوت کی، سامان ضیافت میں شراب بھی تھی، شراب پی کر جب لوگ نماز کو اٹھے، تو امام نے سورۂ کافرون کی آیت الٹ پلٹ کر پڑھ دی، جس سے اس آیت کے معنی بالکل بدل گئے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی،

ولا تقربوا الصلوٰة وانتم سکاریٰ،	نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب بھی نہ جاؤ۔

اس آیت کا مفہوم یہ تھا کہ اوقات نماز میں شراب کے استعمال سے پرہیز کرو، کچھ دنوں کے بعد عتبان بن مالکؓ نے سعد بن وقاصؓ اور اپنے بعض دیگر احباب کی دعوت کی، شراب پی پی کر جب لوگوں کو نشہ آیا، تو فخاری شروع ہوئی جس کا خاتمہ لڑائی پر ہوا، اس موقع پر اس آیت نے شراب کی حرمت کا قطعی فیصلہ کر دیا۔

یا ایها الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون انما یرید الشیطان ان یوقع	مسلمانو! شراب، قمار، بت، اور حصہ کے تیر ناپاک ہیں، شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ، شیطان چاہتا ہے، کہ تم میں آپس میں شراب وقمار بازی میں

بینکم العداوۃ والبغضآء یعنی بغض و عداوت ڈال دے، اور خدا کی

فی الخمر والمیسر ویصدکم یاد اور نماز سے تم کو روک دے،

عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ تو کیا اب شراب نوشی سے

فهل انتم منتهون باز آؤ گے (مائدہ)

قرآن مجید کو دیگر صحف انبیاء پر جو امتیاز حاصل ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے متبعین اور پیرووں کو صرف تقلیدی ایمان پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس کا ہر ایک حکم فلسفہ، عقل اور مصلحت پر مبنی ہے اسی لیے وہ اپنے ہر ایک حکم کے بعد اس کے مصالح کا بھی ذکر کرتا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور تمام احکام کی مصلحت اور عقلی خوبی خود قرآن مجید نے بتلائی ہے، اسی اصول کی بنا پر جب قرآن مجید نے حرمت شراب کا حکم دیا، تو اس نے تحریم شراب کے مصالح و اسباب کا بھی تفصیلی طور سے ذکر کیا، شراب کو رجس[1] یعنی روحانی و اخلاقی ناپاکی فرمایا، اور اس کی

---

[1] عام فقہا رجس سے نجاست حقیقی مراد لیتے ہیں، لیکن یہ ایک فاش غلطی ہے کیونکہ رجس، خمر، میسر، انصاب، ازلام سب کی خبر واقع ہے، اس بنا پر اگر رجس کے معنی نجس حقیقی کے لیے جائیں گے تو لازم آئیگا کہ میسر، انصاب، ازلام سب نجس حقیقی ہیں اور انکے چھونے سے ہاتھ کا دھونا لازم آئیگا، حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں، اور اگر صرف خمر میں نجس حقیقی اور بقیہ اشیا میں نجس مجازی مراد لیا جائے تو جمع بین الحقیقۃ والمجاز لازم آئے گا؛ اس لیے رجس سے مراد نجس مجازی

(باقی ص ۳۵۶ پر)

روحانی و اخلاقی ناپاکی کی دو وجہیں قرار دیں :

۱۔ شراب آپس میں بغض و عداوت پیدا کرتی ہے،

۲۔ شراب سے غفلت پیدا ہوتی ہے، اور انسان نیکیوں سے غافل ہو جاتا ہے،

(۱) پہلا سبب بالکل صاف اور ظاہر ہے، بزم شراب میں ساقی آتا ہے، ساغر کا دور چلتا ہے، فخر و مباہات کا اظہار ہوتا ہے، ناقابل اظہار اسرار کے چہرے سے نقاب اٹھتی ہے، باہمی رقابت کا تذکرہ ہوتا ہے، مستی چھا جاتی ہے، متکبرانہ اور ظریفانہ فقرے تیر و تبر بن کر منہ سے نکلتے ہیں، اور دوسروں کے دل و سینہ کو زخمی کرتے ہیں، اور بغض و عداوت کا دور شروع ہو جاتا ہے، خودکشی قتل اور دیگر جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے، اسی نتیجہ کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ کیا گیا ہے،

انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضآء فی الخمر والمیسر	شیطان صرف یہ چاہتا ہے، کہ تم میں آپس میں شراب و قمار میں بغض و عداوت ڈال دے،

(۲) دوسرا سبب پہلے سے زیادہ ظاہر ہے، بادۂ ناب کا ایک پیالہ پیا، آنکھوں میں خمار آیا، دل میں نشاط چھایا، دن رات کی ایک گونہ بیخودی طاری ہوئی، عقل و فراست کی شمع خاموش ہوئی، مصالح دنیا سے بے خبری ہوئی، نہ خوف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۵) یعنی روحانی ناپاکی مراد ہے، چنانچہ قرآن مجید میں نو جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ اس سے نجس مجازی مراد لیا گیا ہے۔ علمائے اسلام میں علمائے تشیع، امام ابو داؤد ظاہری، علامہ ابن حزم اس کے قائل ہیں۔ (سلیمان ۔ ۱۲)

خلق رہا، نہ یادِ حق، اس کا نتیجہ واقعی یہ ہوتا ہے، کہ وہ دین و دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے، اس کے دل و دماغ بے کار ہو جاتے ہیں، علمی، اخلاقی ہر قسم کے فوائد و مصالح برباد ہو جاتے ہیں، شیشۂ شراب کے سوا اور کوئی آرزو اس کے دل میں باقی نہیں رہتی، ان اشخاص کی لائف پڑھو، شراب جن کی زندگی کا جزء بن گئی تھی، آخر شراب ان کی ترقی و نمود کے لیے موت ثابت ہوئی، اور اس نے ان کو مذہبی، علمی، قومی اور ملکی فرائض کے ادا کرنے سے تمام عمر کے لیے ان کو روک دیا، قرآن مجید میں اسی معنی کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ کیا گیا ہے،

ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ فھل انتم منتھون۔ (شیطان چاہتا ہے کہ شراب نوشی میں) تم کو یادِ خدا اور نماز سے روک دے، کیا اب تم شراب سے باز آؤ گے؟

(مائدہ ۵-۱۲)

چونکہ نماز اور ذکر خدا تمام نیکیوں کی اصل اور تمام اخلاق کی جان ہے، اور مذہبی تعلیم کا منشا بر اصلی ہے، اس لیے اس موقع پر اسی کا خصوصیت سے تذکرہ کیا، تاکہ اس سے نیچے درجہ کی نیکیاں ضمناً خود بخود اس کے تحت میں داخل ہو جائیں، نیز ان نقصانات روحانی کے علاوہ شراب میں بہت سے جسمانی نقصانات بھی ہیں، لیکن چونکہ مذہب کا خاص رشتہ روح سے متعلق ہے، اس لیے قرآن مجید نے شراب کی جسمانی مضرات سے تعرض نہیں کیا،

بعض لوگ حیلۃً یہ کہتے ہیں، کہ "شراب اگر اتنی مقدار میں پی جائے جس سے

کہ نشہ نہ ہو، تو کیا ہرج ہے، لیکن اسلام کا حکم عام ہے،

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ جس کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے، اسکی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے، (ترمذی ج ۲)

اور یہ بالکل صحیح ہے، جس شے کی زیادہ مقدار مضر ہو اس کی قلیل مقدار بھی یقیناً مضر ہوگی، صرف فرق یہ ہوگا کہ اس کی مقدار کثیر کا نقصان بہت جلد اور کم مقدار کا نقصان ایک مدت میں محسوس ہوگا،

تاکید حرمت کی غرض سے اسلام نے نہ صرف شراب کا استعمال ہی حرام کیا، بلکہ اس کی تجارت بھی ناجائز قرار دی ہے، چنانچہ فقہ کی کتابوں میں کثرت سے اس کے احکام موجود ہیں؛

مندرجۂ بالا امور کا ماحصل یہ ہے،

(۱) شراب خواہ تھوڑی مقدار میں ہو، یا بڑی مقدار میں مطلقاً حرام ہے،

(۲) شراب کا استعمال جسمانی اور اخلاقی ہر قسم کا نقصان پیدا کرتا ہے،

(۳) اسلام نے شراب کی تجارت ممنوع قرار دی ہے،

اب تک حرمتِ شراب کا مسئلہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن یہ امر قابلِ حیرت ہے، کہ ٹھیک اسلامی تعلیمات کے مطابق آج یورپ کے بڑے بڑے کیمسٹ اور فزیالوجسٹ شراب کی حرمت اور امتناعِ تجارت کے متعلق مضامین شائع کر رہے ہیں، چنانچہ ہمارے نوجوان جو تقلید یورپ کے نشہ میں چور

ہیں، اور جن پر مذہب کا افسوں کارگر نہیں ہوتا، تاہم ان کو شراب کے متعلق کچھ یورپ کی زبان سے بھی سنانا چاہتے ہیں۔

یورپ کے مشہور محقق چارلس ڈارون نے لکھا ہے، کہ اپنے آباء و اجداد کے متواتر اور قدیم تجربوں سے مجھکو اب یقین کامل ہوگیا ہے، کہ "انسان کی موت جس قدر مسکرات کے استعمال سے ہوئی کسی دوسرے مرض اور آفت سے نہیں ہوئی"۔ کیمسٹری کی تحقیقات نے شراب کو انسان کی بدترین غذا تسلیم کیا ہے، پروفیسر کریملین جو جرمنی کی میونخ یونیورسٹی میں دماغی امراض کے پروفیسر ہیں، وہ پچیس ۲۵ سال سے تحقیقات کررہے تھے، کہ مسکرات کا دماغ اور دیگر جسمانی قویٰ پر کیا اثر پڑتا ہے، وہ کامل تحقیقات کے بعد جس نتیجہ پر پہونچے، وہ یہ ہے کہ "شراب شائستہ قوموں کو تباہ و برباد کررہی ہے"۔

میسو کلاڈنی ممبر فرنچ اکاڈیمی نے شراب کے نقصانات پر چند نوٹ لکھے ہیں، جن میں موصوف نے باشندگانِ فرانس کو نصیحت کی ہے، کہ وہ شراب کی کثرت کو روکیں، اور خواہش کی ہے، کہ شراب خانوں کی تعداد جہاں تک ممکن ہو کم کی جائے، کیونکہ فرانس میں شراب نوشی کی کثرت جس قدر ہوتی جاتی ہے، بیماری، جنون، ضعفِ قویٰ اور خودکشی کی وبا بھی اسی نسبت سے بڑھتی جاتی ہے، چنانچہ اموات اور بیماریوں کی تفتیش اور شمار سے معلوم ہوتا ہے، کہ امراض، جنون اور خودکشی کے زیادہ تر وہی لوگ شکار ہوتے ہیں، جو شراب کے حد درجہ عادی ہوتے ہیں،

اور اس کا اثر انہی اشخاص تک محدود نہیں رہتا، بلکہ نسلاً بعد نسلٍ اس کا اثر متعدی ہوتا جاتا ہے، اسی بنا پر پارلیمنٹ کے دو ممبروں نے گورنمنٹ سے سرکاری طور پر درخواست کی ہے، کہ جنوری ۱۹۱۰ء سے فرانس میں شراب کے استعمال کی عام طور سے ممانعت کر دی جائے، گورنمنٹ نے شراب کی تجارت کی جو اجازت دی ہے، اس کا مدار محض اس بات پر ہے، کہ گورنمنٹ کے مداخل میں آمدنی کا ایک اور راستہ پیدا ہو، لیکن ایک قلیل آمدنی کے مقابلہ میں رعایا اور ان کی نسل کی عام جسمانی صحت کا خون نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ایک مشہور مضمون نگار نے لکھا ہے "اگر تم شفا خانے بند کرنا چاہتے ہو، تو شراب خانوں کو بند کر دو" درحقیقت اس معجز رقم نے اس مختصر سی عبارت میں ان تمام امراض کی فہرست ظاہر کر دی ہے، جو شراب نوشی کے نتیجہ ہیں، انہی امراض کے باعث عموماً شراب نوشوں کی عمریں نہایت چھوٹی ہوتی ہیں، ان امراض میں موت کے علاوہ شراب نوشوں میں خودکشی کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوتی ہے، اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے، کہ لوگ شراب خانوں میں سرور و نشاط بڑھانے کے لیے نہیں جاتے، بلکہ رنج والم بڑھانے کے لیے جاتے ہیں، اپنی قوت تازہ کرنے نہیں جاتے، بلکہ اپنی قوت کو کھونے جاتے ہیں، تحقیق و مشاہدہ سے ثابت ہوتا ہے، کہ ۱۸۹۳ء میں صرف میخواری کی کثرت سے فرانس میں دیوانوں اور مجنونوں کی تعداد ۵۹ ہزار تھی، خودکشی کی تعداد کا بھی اسی نسبت سے قیاس کر سکتے ہو۔

شراب کے زہر قاتل ہونے پر اس سے زیادہ اور کیا بین ثبوت ہو سکتا ہے، کہ بہت سے مشاہیر اور اہل قلم جو شراب کے عادی تھے، دنیا کو بہت جلد ان کی شہرت اور افادات قلم سے محروم ہونا پڑا، الفرڈ ڈی بیسا جو فرانس کا بہت بڑا شاعر تھا، وہ اسی تلوار کا شہید ہے، اس عزیز ملک کے علاوہ کشتگان شراب کی فہرست میں اور بہت سے نامور ملیں گے، اکثر محققین اطبأ اور ڈاکٹروں نے شراب کے نقصانات نہایت وضاحت سے لکھے ہیں،

کیمسٹری کا مشہور عالم برڈلو کہتا ہے، کہ فزیالوجی اور طب کے محققین کے ساتھ میں بھی اس کی شہادت دیتا ہوں، کہ شراب انسانی زندگی کے لیے زہر قاتل اور صحت و عقل کی دشمن ہے،

ارسونقال کہتا ہے کہ اس قسم کے زہر قاتل کی خرید و فروخت کی اجازت دینا ملک اور انسانیت کا مجرم بننا ہے،

تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہوا ہے، کہ فرانس میں جو عام طور سے کمی آبادی، ضعف قویٰ، کوتاہی قامت اور کمی عمر کی شکایت ہے اس کا سبب اعظم شراب کا عام استعمال ہے،

بہت سے ایسے اشخاص ہیں، جو شراب کے نقصانات کے قائل ہیں، لیکن صرف اس لیے پیتے ہیں، کہ کم مقدار مضر نہیں، یہ صحیح ہے، لیکن جب اسی مقدار میں روزانہ استعمال کی جائے گی، تو ایک مدت کے بعد جسم میں شراب کے سمی اجزا پھیل

جائیں گے، اور نقصان پہنچائیں گے، فرق صرف اتنا ہوگا کہ زیادہ پینے والے بہت جلد اور کم پینے والے دیر میں متاثر ہوں گے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے نوجوان جو بزعمِ خویش نہایت اعتدال سے پیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں، کہ اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، وہ عہد پیری میں نہایت مشکل و لاعلاج امراض میں مبتلا ہوجاتے ہیں، لاغری، دائمی زکام، وجعِ مفاصل، نقرس وغیرہ کی بیماریاں اکثر انکو لاحق ہوجاتی ہیں، جن سے ان کے جسم کا جوڑ جوڑ، بند بند اور ایک ایک ہڈی، اپنی جگہ سے کھسک جاتی ہے، اور بالآخر صحت ہمیشہ کے لیے خراب ہوجاتی ہے"۔

"مسکرات کی خواہ کتنی ہی کم مقدار استعمال کی جائے، اس کا زہر مخفی ہوتا ہے، جس سے استعمال کرنے والے کے تمام قویٰ رفتہ رفتہ زائل ہوجاتے ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں، کہ جو لوگ محنت و مشقت کا کام کرتے ہوں، ان کو تکان کے دفع اور قویٰ کی تازگی کے لیے رات دن میں ایک مرتبہ تھوڑی سی شراب ضرور پینی چاہیے، لیکن اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے، کہ یہ مصنوعی تازگی ان کے اعصاب کو کمزور کردے گی، اور پھر کسی کام کے قابل نہیں رہ جائیں گے"۔

شراب کے استعمال سے معدہ اور جگر عموماً خراب ہوجاتے ہیں، اس کے علاوہ فالج، استسقاء، جنون، باتور، تیفوس، سرخ بادہ، زکام، پھیپھڑے کی سوزش، وغیرہ بیماریاں لاحق ہوجاتی ہیں، یہ امراض شراب خواروں کے علاوہ اور لوگوں کو بھی ہوتے ہیں، لیکن ان کا علاج ممکن ہوتا ہے، لیکن جب شراب خواران امراض

میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو اس کی زندگی خطرہ میں آجاتی ہے، اور پھر وہ اچھا نہیں ہوتا،

شراب سے جو تازگی، اعادۂ قوت اور نشاط پیدا ہوتا ہے، وہ درحقیقت الکحل کا نتیجہ ہے، اور الکحل کی نسبت ایک طبی رسالہ نے لکھا ہے، کہ وہ انسان کی بدترین ایجاد ہے، لوگ سمجھتے ہیں، کہ الکحل جسم کو تقویت بخشتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے، کہ الکحل کا کام یہ ہے کہ محنت ومشقت سے قویٰ میں جو ضعف، تکان، اور عام غفلت اور سستی پیدا ہو جاتی ہے وہ اسے دور کر دیتا ہے، قویٰ کو بیدار کر دیتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لیے ان میں جو تیزی اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے، تو انسان سمجھتا ہے، کہ وہ تازہ دم ہو گیا، اور اس کی قوت اصلی عود کر آئی، حالانکہ درحقیقت قویٰ میں جو غیر فطری بیداری اور مصنوعی حرکت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ان کو اور زیادہ ضعیف، شست اور کمزور بنا دیتی ہے، اور دیر تک کے لیے تھکا دیتی ہے، اس کی صحیح مثال یہ ہے، کہ گھوڑا جب دوڑ کر تھک جاتا ہے، اور اس کی حرکت اور تیزی کم ہو جاتی ہے، تو کوڑا کچھ دیر کے لیے اس کو تیز اور متحرک کر دیتا ہے، اور وہ دوڑنے لگتا ہے، اور بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے، کہ گھوڑا اب پہلے سے زیادہ چاق وچوبند ہے، تو کیا سوار کو واقعی یہ سمجھنا چاہیے، کہ گھوڑے کی پہلی قوت عود کر آئی ہے، اور وہ تازہ دم ہو گیا ہے، اور اگر وہ ایسا سمجھتا ہے، تو وہ مجنون ہے، بلکہ اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا گھوڑا پہلے سے کہیں زیادہ شست، کمزور، اور تھکا ماندہ ہو گیا ہے،

الکحل کی نسبت بعض لوگ سمجھتے ہیں، کہ وہ قوتِ اشتہا کو بڑھاتا ہے، حالانکہ

وہ قوتِ ہضم کو فطری طور پر اپنے صحیح فرائض ادا کرنے سے باز رکھتا ہے، اور معدہ میں ایسے امراض پیدا کر دیتا ہے، جو رشتۂ حیات کو بہت جلد منقطع کر دیتے ہیں، وہ ناگہانی موت کا سبب بن جاتا ہے، صرع اور جنون کا محرک ہوتا ہے، پیری اور بڑھاپے کو دعوت دیتا ہے، نسل نہایت کمزور اور ناتواں پیدا ہوتی ہے، وہ اکثر بیمار، بیوقوف، مجنون، بہری، اور بہت سے اخلاقی عیوب میں مبتلا رہتی ہے، الکحل کا اثر زیادہ تر معدہ، جگر، دماغ، پھیپھڑا، گردہ، اور شرائین پر پڑتا ہے،

ان مضمون نگارانِ یورپ نے اپنے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کو تین عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) شراب انسان کے قویٰ اور اخلاق کے لیے زہر قاتل ہے،

(۲) شراب کی تھوڑی مقدار بھی مضر ہے،

(۳) شراب کی تجارت بند کر دی جائے،

ان مضامین کو غور سے پڑھو، کہ اسلام آج سے تیرہ سو برس پیشتر جس نتیجہ تک پہنچا تھا، یورپ اس نتیجہ تک آج پہنچا ہے،

یہ ہمارے لیے کس قدر حیرت اور افسوس کی بات ہے، کہ غیر مذاہب کے اولوالعزم مصلحوں نے جن کے یہاں شراب مطلقاً ممنوع نہیں، جابجا انسدادِ مسکرات کے لیے کمیٹیاں قائم کی ہیں، اور تا حدِ امکان انھوں نے اس میں کامیابی بھی حاصل کی ہے، لیکن مسلمان جن کے مذہب میں شراب کا ایک قطرہ بھی حرام ہے، اب تک

انھوں نے اس غرض کے لیے کوئی جماعت قائم نہیں کی،

مسلمان نوجوان جو یورپ کی ترقی سے مرعوب، اور اس کے بادۂ تقلید سے مست و سرشار ہیں۔ وہ بیدار ہوں اور اپنی حالت پر غور کریں، یورپ جیسے سرد خطہ میں جب لوگ شراب کے مفاسد سے نالاں ہیں، تو ایشیا جیسے خطہ میں جو نسبۃً گرم ہے، شراب کے استعمال کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں،

اس موقع پر حضرت حسن کا یہ زریں قول کتنا قیمتی اور نصیحت بخش ہے، کہ "مے خوارو! اگر عقل تمہارے نزدیک کوئی گراں قیمت شے ہے، تو شراب کے ایک پیالہ پر اس کو فروخت نہ کرو"۔

(الندوہ، اکتوبر ۱۹۰۹ء)

حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ ان الحکم الا للہ حکم کسی کا نہیں مگر اللہ کا۔
(یوسف)

آیتِ بالا میں ارشادِ خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کا ہے، اس لیے اسلام میں حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، لیکن احکامِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی یعنی وہ احکام جو انبیا علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں، اور دوسرے تکوینی یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقاتِ عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے، اور اسی کا حکم جاری وساری ہے، دنیا میں ایسے بادشاہ گذرے ہیں، جنھوں نے نمرود وفرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا، مگر ان کو بھی تکوینی احکامِ الٰہی کے آگے سرنگوں ہوکر جان دینی پڑی، اور یہ شبہ ان سلاطینِ عالم کو اس لیے پیش آتا ہے، کہ وہ اپنے تشریعی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک وشبہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں، اور نہ تکوینی، زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اسی کی ہے، اور امر

تکوینی ہو یا تشریعی، اس میں اسی کا فیصلہ فیصلہ ہے، اس معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں،

ان الحکم الا للہ (یوسف) حکم نہیں مگر اللہ کا،

الا لہ الحکم وھو اسرع الحاسبین۔ (انعام۔۸) ہاں اسی کے لیے حکم کرنا اور حساب

لہ الحکم والیہ ترجعون (قصص) اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹے جاؤگے،

امر تکوینی و فطری میں تو انسان کی ناچاری و مجبوری ظاہر ہے، کہ وہ زمین و آسمان اور خاک و باد و آب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کر سکتا، نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے، نہ اس کی صفات میں تغیر کر سکتا ہے، اور نہ اس کے قواعد و قوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کر سکتا ہے، ان احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور ناچار ہیں، حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا، تو آپؑ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کر دیا، فرمایا،

فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب فبھت الذی کفر (بقرہ۔۳۴) تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے، تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لاجواب ہو گیا۔

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں،

اللّٰھم مالک الملک توتی الملک ... اے اللہ! سلطنت کے مالک تو جس کو
من تشاء، چاہے سلطنت دے،

اس لیے ان میں راہِ صواب پر وہی ہیں، جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکامِ تکوینی کی طرح اس کے احکامِ تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں، اور جو یہ سمجھتے ہیں، کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لیے دی ہے، کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں رائج اور شائع اور اس کی شریعت کے مطابق احکام کو جاری کریں،

اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے، کہ یہ مانا جاتا ہے کہ احکام کے اجراء اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرما دیئے ہیں، ان کے تتبع سے اہل علم اور مجتہدین نئے نئے احکامِ جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں،

ان احکامِ الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع و ضرر پر مشتمل ہوں، بے شبہ اہل عقل اپنی عقل و فہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے، بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کس بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے، یا یوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عقاب مترتب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اہلِ عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں،

اگر وہ حکم الٰہی کے مطابق نہیں ہے، تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے، اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے، اس لیے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں، جس کو خدائے عالم الغیب نے نازل فرمایا،

ان تمام مذکورۂ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے، عام طور سے فقہاء نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے،

۱- ان الحکم الا للّٰہ (انعام و یوسف)	حکم صرف اللہ کے لیے ہے،
۲- الا لہ الخلق والامر (اعراف)	ہاں اسی اللہ کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا،

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادث عالم سے متعلق ہے، پہلی آیت دو جگہ ہے، سورۂ انعام اور سورۂ یوسف میں، سورۂ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے ہیں، اس کے جواب میں ہے،

ما عندی ما تستعجلون بہ ان الحکم الا للّٰہ یقص الحق وھو خیر الفاصلین (انعام۔ ۷)	جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں، حکم کسی کا نہیں، بجز اللہ تعالیٰ کے، اللہ تعالیٰ واقعی بات تبلادیتا ہے اور وہی سب سے

اچھا فیصلہ کرنے والا ہے،

دوسری جگہ سورۂ یوسف میں اس موقع پر ہے، جب حضرت یعقوبؑ بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہو، تاکہ کسی آفت میں نہ پھنسو، پھر فرماتے ہیں، کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے، مگر ہوگا وہی جو اللہ چاہتا ہے،

وما اغنی عنکم من اللہ من شیٔ ان الحکم الا للہ علیہ توکلت وعلیہ فلیتوکل المتوکلون،	اور خدا کے حکم کو میں تم سے نہیں ٹال سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔
(یوسف - ۸)	

دوسری آیت کا موقع یہ ہے،

ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام ثم استوٰی علی العرش یغشی اللیل النہار یطلبہ حثیثاً والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العٰلمین۔	بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آتی ہے، اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا، ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو

اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور
حاکم ہونا، بڑی خوبیوں کے ساتھ بھرے
ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار
ہیں۔ (اعراف - ۷)

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق و تکوین سے ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ لفظ امر اور حکم، لغوی وسعت، کی بنا پر امور شرعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں، لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر صرف اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے،

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے، اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل خدا کے حکم کی مستقلاً طاعت کی جائے، تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے،

لا تعبد الشیطان (مریم) شیطان کی عبادت نہ کرو،

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے،

ان لا تعبدوا الشیطان۔ (یٰس) یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو،

ظاہر ہے شیطان کی عبادت کوئی نہیں کرتا، لیکن جو شیطان کی باتوں پر عمل کرتا اور اس کے حکموں کو مانتا ہے، وہی شیطان کی عبادت کرتا ہے، اس لیے

حکم الٰہی ہے،

وقضیٰ ربک ان لا تعبدوا الا اللّٰہ (اسرائیل) — اور تیرے پروردگار کا یہ فیصلہ ہو چکا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو،

سورۂ کہف میں ہے،

ولا یشرک فی حکمہ احدا — اور نہ اللہ کسی کو اپنے حکم میں شریک کرتا ہے،

سورہ کے آخر میں ہے،

ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا (کہف - ۱۲) — اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے،

یہ عبادت ہر قسم کی اطاعت کو شامل ہے، قرآن پاک نے دوسرے موقع پر تصریح کی ہے، کہ شرک صرف یہی نہیں ہے، کہ ایک خدا کو خدا کہا جائے، بلکہ یہ بھی ہے کہ خدا کی اطاعت بلا واسطہ میں کسی اور کو شریک ٹھہرایا جائے، سورۂ انعام میں حلال اور حرام کھانے کی تفصیل کے بعد ارشاد ہے کہ

وان الشیٰطین لیوحون الی اولیٰئہم لیجادلوکم وان اطعتموھم انکم لمشرکون۔ (انعام - ۱۴) — اور بے شبہ شیطان اپنے دوستوں کو سکھاتے ہیں کہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم ان کی اطاعت کرلو (ان کی بات مان لو) تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے

اوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال

پیدا ہوگا، تو پھر اسلام میں انبیاء اور ائمہ زمانہ اور خلفاء کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہوسکتا ہے، جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، اور دوسروں کی اطاعت احکام الٰہی کی تبلیغ اور احکام الٰہی کے اجراء اور تنفیذ میں حکم الٰہی کے تحت میں ہے، ارشاد الٰہی ہے،

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و	اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اور
اولی الامر منکم۔	اولی الامر کی اطاعت کرو،

اولوالامر کی اطاعت خواہ اس سے مراد علماء ہوں یا حکام، خدا کے احکام کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجراء میں ہے، اور رسول کی اطاعت بھی احکام الٰہی کی تسلیم اور تنفیذ ہی کی خاطر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے،

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔	اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے
(نساء - ۸)	اللہ کی اطاعت کی،

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے،

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع	اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن
باذن اللہ۔ (نساء - ۹)	اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہود اور نصاریٰ نے احکام الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا، اور ان کا حکم حکم خدا سے ماخوذ و مستنبط سمجھ کر نہیں، بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجا لایا جاتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک

میں ان کو شرک کا ملزم قرار دیا ہے، اور ان سے جزیہ یا قتال کا حکم دیا گیا ہے ارشاد ہے:

قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا	اہل کتاب میں سے ان سے لڑو، جو اللہ اور
بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم	قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ جس کو اللہ
اللہ ورسولہ ولا یدینون دین	اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو حرام مانتے
الحق من الذین اوتوا الکتاب.	ہیں، اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں،

ان آیات میں اہل کتاب پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے، وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند نہیں ہیں، بلکہ یہ مرتبہ انھوں نے خدا کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا	انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور
من دون اللہ والمسیح ابن مریم	راہبوں کو رب بنا رکھا ہے، اور مریم کے بیٹے
وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحدا۔	مسیح کو، حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ
(توبہ - ۵)	ایک ہی معبود حق کی عبادت کریں،

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے، کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے، کیونکہ ان کو یہ دعویٰ تھا، کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور سے اپنے حکموں سے اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے، اسلام نے ان کو دوسری سورہ میں اس شرک سے باز رہنے کی دعوت دی ہے،

یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ - اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو
سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ - ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مانی ہوئی
ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ - ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت
بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ، - نہ کریں، اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک
بنائیں، اور نہ خدا کو چھوڑ کر ہم میں ایک
(آل عمران - ۷) دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے، ترمذی اور مسند احمد میں ہے، کہ جب عدی بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ نے ان کے سامنے سورۂ توبہ والی آیت مذکور پڑھی، تو عدی نے کہا "وہ ان کو معبود نہیں بناتے" فرمایا کیوں نہیں، انھوں نے ان کے احکام کو ماننا یہی ان کو معبود بنانا ہے، الفاظ یہ ہیں، فذالک عبادتہم ایاہم[1] ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے، تو یہ حلال مان لیتے تھے، اور جب حرام کرتے ہیں تو حرام سمجھ لیتے ہیں[2]۔

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام

---

[1] تفسیر ابن کثیر، [2] ترمذی تفسیر آیت توبہ۔

نہیں، بلکہ خدا کا ہے، اور اسی کا نام وضعِ حکم ہے، اس تحلیل اور تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے، اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکمِ خداوندی بالاستقلال کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے عرب، اور یہود و منافقین کو جو قانونِ الٰہی کی سختی سے بچنے کے لیے یا عدمِ ایمان کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی رواجی عدالت میں یا عرب کاہنوں کے پاس لے جاتے تھے، زجر و توبیخ فرمایا اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک قرار دیا، چنانچہ بعض اصولی احکام عدل و انصاف اور طریق اطاعت احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے،

الم تر الی الذین یزعمون انہم آمنوا ... کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا، جو گمان کرتے ہیں بما انزل الیک وما انزل من قبلک ... کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا، اور جو تجھ یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت ... سے پہلے اتارا گیا، ایمان لاچکے ہیں، وہ چاہتے وقد امروا ان یکفروا بہ ... ہیں، کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں، حالانکہ ... (نساء ۹) ... ان کو حکم دیا گیا ہے، کہ وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں، کہ جس کو خدائے تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے، کل معبود من دون اللہ، اور اہلِ تفسیر نے شانِ نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں اور جادوگروں کو اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے، اس لیے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ

دے کر اطاعت کی جائے، اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے، وہ طاغوت ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے، اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے،

قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے، اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الفاسقون۔ (مائدہ) اور اللہ نے جو اتارا ہے، اس کے رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں،

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے، حدود وہ نشانات ہیں، جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے، اور جس سے تل بھر آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے، اور یہ حدود اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اور اتارے ہوئے ہیں، قرآن پاک میں سورۂ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکام الٰہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے،

تلك حدود اللہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں،

تلك حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسه (طلاق) یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں، جو ان حدود سے آگے بڑھے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا،

سورۂ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے،

تلك حدود اللہ ومن یطع اللہ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور اس کے

ورسوله یدخله جنّٰتٍ تجری من	رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو
تحتها الانهار خالدین فیها وذالك	جنت میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں
الفوز العظیم ومن یعص الله و	بہتی ہوں گی، اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور
رسوله ویتعد حدوده یدخله	یہ بڑی کامیابی ہے، اور جو اللہ اور اس کے
نارا خالدا فیها وله عذاب	رسول کی نافرمانی کرے گا، اور اللہ کے حدود
مهین۔	سے آگے بڑھے گا، اس کو دوزخ میں ڈالے گا،
	جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کے لیے
(نساء — ۲)	بڑی ذلت کی سزا ہے،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ و رسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے، اور ان سے انحراف اللہ و رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے، اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالےٰ ہی کی اطاعت ہے،

قانون و شرع کی حقیقت تحلیل و تحریم ہی ہے، اور یہ حق صرف اللہ تعالےٰ کے لیے مخصوص ہے، انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرے اور بلا سند الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کرے، تو اس کا نام "افترا علی اللہ" خدا پر تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا

ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب	اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال و

هذا حلال وهذا حرام لتفتروا ... حرام) بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ
علی اللہ الکذب ان الذین ... یہ حلال ہے، اور یہ حرام تاکہ تم اللہ پر جھوٹ
یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون ... تہمت لگاؤ یہ (دنیا میں) چند روزہ فائدہ
متاع قلیل ولہم عذاب الیم (نحل-۱۵) ... ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال و حرام کی شریعت کو اپنے لیے مخصوص فرمایا، بلکہ یہ بھی پیشینگوئی فرما دی کہ جو لوگ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دنوں کا فائدہ حاصل ہو جائے گا، مگر وہ ان کے لیے عذاب ہی ثابت ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت الٰہی کے مظہر تھے، اور بندوں کو احکام الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے، اور اس حیثیت سے آپ کا ہر حکم، حکم الٰہی ہے، لیکن حکم الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ ایک چیز کو اپنے لیے آپ نے حرام قرار دیا، تو عتاب الٰہی آیا۔
یا ایہا النبی لم تحرم ما احل اللہ ... اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے،
لک۔ (تحریم) ... جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا،"

اس سے یہ معلوم ہوا، کہ یہ استحقاق بالاستقلال نبی کو بھی حاصل نہیں، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے، کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے، مگر جب رسول نے ایسا کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ کو منع فرما دیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے، ایک یہ کہ نبی کا

ہر شرعی فعل جو اس کے لیے مخصوص نہ ہو، امت کے لیے تحت حکم الٰہی شرعی کا حکم رکھتا ہے، اس قاعدہ کی بنا پر آپ کے اس ترک سے امت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی، دوسرے یہ ثابت ہوتا، کہ نبی کو بغیر اذن الٰہی کے بھی حق تشریع ہے، جو صحیح نہ ہوتا، اس لیے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے، کہ وہ شریعتِ الٰہی کا مبلّغ اور قانون ربانی کا شارع اور مظہر ہے، قرآن پاک کی اس آیت میں ہے،

ولا یحرمون ما حرم اللّٰہ ورسولہ۔ ۔ اور یہود و نصاریٰ اسے حرام نہیں کرتے، جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے، (توبہ۔۴)

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے، وہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلّغ تھے، جن کی اطاعت عین اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولی الامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے، کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں،

اسلامی علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے، اصول کا مسئلہ بن گیا ہے، چنانچہ علم عقائد اور اصول فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں،

علم اصول فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے، کہ واضع قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور اسی کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا،

۔ علامہ آمدی المتوفی ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں؛

اعلم انہ لاحاکم سوی اللہ تعالیٰ ولا حکم الا ما حکم بہ ویتفرع علیہ ان العقل لا یحسن ولا یقبح ولا یوجب شکر المنعم وانہ لا حکم قبل ورود الشرع۔	جاننا چاہیے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں، اور حکم وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور اسی اصل پر یہ مسئلہ متفرع ہے کہ عقل نہ کسی کو اچھا کہتی ہے اور نہ برا، اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے، اور یہ کہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں،
(ص ۱۱۳۔ مطبوعہ مصر)	

مقصود یہ ہے کہ احکامِ شریعت اور قانونِ شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے، اور اسی کا قانون قانون ہے، اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے رو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب، یا حرام، ناجائز ومکروہ کی صورت میں جس کے فاعل پر ثواب یا عقاب کا حکم عائد کیا جا سکے، نہیں ہو سکتا، اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے،

علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں،

الحاکم لاخلاف فی انہ رب العلمین۔	اس میں اختلاف نہیں، کہ حکم کا واضع پروردگارِ عالم ہے۔
(ص ۲/۸۹)	

۔ قاضی بیضاوی المتوفی ۶۸۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسنوی واضح کرتے ہیں،

حسن و قبح اور شے کے اچھے یا بُرے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے، یا اس سے نفرت کرتی ہے، جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے، اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا برا ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہیں، کہ ایک کمال کی صفت ہے، اور دوسری نقص کی، جیسے علم اچھا ہے، اور جہل بُرا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا برے ہونے کا عقل کے رو سے فیصلہ کرتے ہیں، اس میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے، کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے، اشاعرہ (اور عام اہلِ سنت) کے نزدیک حسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے صرف شرع پر موقوف ہیں، اور معتزلہ کہتے ہیں، کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے، اور اس فیصلہ کے لیے حکمِ الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے، (ص ۹۰ بر حاشیہ تحریر ابن ہمام)،

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے، وہ یہ کہ شریعت کے فیصلے سے حکم کی

معرفت ہوتی ہے، اور عقل سے اس کی مصلحت قیاس و تجربہ کی بنا پر اہل عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے، اور یہی اہل سنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلکِ حق ہے، مولانا محب اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں کہتے ہیں،

حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت کے موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے، اختلاف اس میں ہے، کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رو سے سمجھا جا سکتا ہے، یا صرف شرع سے، تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا، وہ اچھا ہے، اور جس کو برا فرمایا وہ برا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا برا ہوتا، اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے، کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں، کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، اور ہمارے نزدیک یہ ہے، کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے، کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہو،

لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے، تو کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا۔ (المقالۃ الثانیہ فی الاحکام)

بعض اہلِ اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے، کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بحر العلوم نے شرح مسلّم الثبوت میں اس مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:-

اس مسئلہ پر کہ حکم صرف اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام امت کا اجماع ہے، اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے، کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک واضع قانون وہ حاکم عقل ہے، یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں، کہ عقل بعض احکامِ الٰہی کو جان سکتی ہے، چاہے شرع میں وارد ہو یا نہ ہو، اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے،

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۵۰ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے، کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے،

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے، جب نبی کی بعثت نہ ہو، یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو۔

تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، اور نہ ایمان واجب ہے، اور معتزلہ کے نزدیک اسوقت بھی عقل کے روسے جو حکم ہو، اس کے ساتھ حکمِ الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا۔ (ارشاد الفحول مصر ص ۶)

اب آخر میں ہم حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قولِ فیصل نقل کرتے ہیں، جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں، کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرسکے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا، وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے، عام اس سے کہ وہ لذاتہ حسن ہے، یا اپنے کسی وصف یا کسی متعلق کی بنا پر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ (قبیح) برا ہے، تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ اتصاف امرونہی سے پہلے ہی عالمِ حقیقت میں ہو چکا تھا، اور اسی کی رعایت کرکے اللہ تعالیٰ نے امرونہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حسن و قبح کو معلوم کرلیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں، لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا، تو یہ مذکورۂ بالا حسن و قبح بندوں کے حق میں تمامتر اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے، پس

احکام بندوں کے حق میں صرف شرع الٰہی پر مبنی ہیں"۔ (ص ۱۲)

حضرت مولانا شہیدؒ کا یہ رسالہ اصولِ فقہ درحقیقت اصولِ فقہ کی "تہذیب" ہے، اس فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرمادیا ہے، اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لیے ثابت نہیں ہے، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر اور نہی فرمایا ہے، وہ تمامتر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے، عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پالیتی ہے، تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشا نہیں، کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے، اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی، تاکہ یہ معلوم ہو جائے، کہ ہمارے ماہرینِ قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے، کہ اسلام میں وضعِ قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم آمر اور واضعِ شرع ہے، اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا، کہ یہ قانونِ شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقتِ خاص میں نازل ہوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے، کہ ایک ہیں قانون کے اصول اور کلیات اور دوسرے ہیں اُن کے فروع اور جزئیات، دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی و تجربی ہی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں اُن میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا، تغیر و تبدل اور تجدد یعنی نئی نئی

صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے، جو انہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی بنا ہو، لیکن اس کے اصول و کلیات پرانے اور غیر تبدل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے۔ مثال کے لیے یوں سمجھیے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص اور دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ صورتیں کہ وہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا، اور اب بندوق سے، تپنچہ سے، ریوالور سے، توپ سے، گولہ سے، اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوا کرتا ہے لیکن یہ تغیر مسئلہ کی صورت میں فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے، تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی، اور اب گاڑی، سائیکل، موٹر، ریل وغیرہ کی صورتوں میں یہ حادثے پیش آئیں تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہ یہ پیش آسکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے، تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے حالات کا حکم جو اپنے اجتہاد سے بتاتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں، جو احکام کے اصول و فروع پر پوری نگاہ رکھتے ہیں، اور آیات و احادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل و اسباب اور مصالح و مفاسد کو معلوم کرتے ہیں، اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہیں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا وضع اور مخترع نہیں،

بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے، بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں، کہ مقررہ احکامِ الٰہی کے تحت میں اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہلِ اصول کے اس مسئلہ کے کہ قیاس حکم کا صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے، کہ یہ نیا جزیہ فلاں اصول کلی کے ماتحت ہے، انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہاء نے فتاوی کا پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جاسکتا ہے، اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں، اور اب بھی ہیں!

(معارف نومبر ۱۹۴۶ء)

آیتِ استخلاف

جماعتِ انسانی کا کوئی اہم کام بغیر کسی خاص نظام کے نہیں چل سکتا، وہ نظام جو تمام مسلمانانِ عالم کی جماعت کی تشکیل کرتا ہے، اور باوجود اختلافِ قومیت، اختلافِ زبان، اختلافِ وطن ان کو باہم دگر وابستہ اور مربوط کرتا ہے، وہ خلافت ہے، اسلام جغرافی زمینوں میں، نسلی قومیتوں میں، مصنوعی زبانوں میں، کالی اور گوری رنگتوں میں منقسم نہیں ہے وہ تمام دنیا کے اُن افراد کو جنھوں نے اس کے اصولِ زندگی اور طریقِ عمل کو اختیار کرلیا ہے، اخوت اور برادری کی ایک ہی سطح پر کھڑا کردیتا ہے، اور اسی عالمگیر برادری کا مرکزی نقطہ ہے، جس کو ہم مسلمان خلافت کہتے ہیں، مسئلہ کے صحیح پہلو کو سمجھنے کے لیے مسلمانوں کے اساسِ دین و مذہب یعنی قرآن مجید کی صرف ایک آیت پر غور کرنا کافی ہے، چنانچہ ایک مختصر تمہید کے بعد اسی آیت پاک کی طرف ہم اپنے دوستوں کو متوجہ کرتے ہیں،

خلافت کے لغوی معنی "جانشینی" کے ہیں، مسلمانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ "نوع انسانی" اس سطح خاکی پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے جانشین ہے، وہ تمام خیر و سعادت، وہ تمام کمالات و حسنات جن کی وہ ذاتِ اقدس منبع ہے، نوعِ انسانی کا فرض ہے،

کہ بحیثیت جانشینی کے اپنی محدود وسعت انسانی کے مطابق اپنے اندر اُن کے حصول کی کوشش کرے، تاکہ وہ اس کمال مطلق اور حسن مطلق ہستی کی صحیح جانشین ہو سکے۔

اسلام کی مقدس کتاب کا پہلا حصہ جس اصولی سبق سے شروع ہوتا ہے وہ یہی مسئلہ خلافت انسانی ہے، حضرت آدمؑ کا قصہ یہود و نصاریٰ دونوں میں مسلّم ہے، لیکن اسلام میں اس قصہ کی تشریح ایک اصولی اعتقاد کی حیثیت رکھتی ہے، تخلیق آدم کی غرض و غایت عقائد اسلامی کے مطابق صرف یہ ہے کہ وہ خداوند عالم کا اس سطح خاک پر خلیفہ نامزد ہوا، قرآن مجید کے ابتدائی سورہ کی یہ آیت ہے،

اذ قال ربک للملٰئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ ۔ یاد کرو جب خدا نے فرشتوں سے کہا کہ ہم زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانے والے ہیں۔

بالآخر یہ خلیفہ بنایا گیا، اور آدم اس کا نام ہوا، یہی آدمؑ جو خدا کی طرف سے خلیفہ تھا، اپنے فرزندوں کے لیے پیشوا اور امام ہوا، یعنی وہ خالق کا خلیفہ اور مخلوق کا امام تھا، حضرت آدمؑ کے بعد اپنے عہد اور زمانہ میں بہ ترتیب جو انبیائے عظام (صلی اللہ علیہم وسلم) اس دنیا میں تشریف لاتے گئے، وہ خلفائے الٰہی اور ائمہ انسانی تھے، اور قرآن پاک نے ان کو اسی نام سے بار بار یاد کیا ہے، حضرت ابراہیمؑ جو اسلام میں ایک عظیم الشان پیغمبر تسلیم کیے گئے ہیں، ان کی

نسبت قرآن مجید میں خدائے پاک کہتا ہے،

قال انی جاعلك للناس اماماً۔ (بقرہ) اے ابراہیم! میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں،

حضرت داؤدؑ جن کو مسلمان پیغمبر یقین کرتے ہیں، قرآن ان کو خلیفہ کہہ کر پکارتا ہے،

یا داؤد انا جعلناك خلیفة فی الارض۔ (ص) اے داؤد! میں نے تم کو زمین میں اپنا نائب یعنی خلیفہ بنایا۔

مسلمانوں کے اعتقاد میں آخری خلیفۂ الٰہی اور امام انسانی پیغمبر عرب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، آپؐ کی وفات کے بعد خلافت الٰہی کے بجائے خلافت نبوی کا سلسلہ شروع ہوا، صحیح مسلم جو اسلام میں حدیث کی دوسری مستند ترین کتاب ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کانت بنوا اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلك نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وسیکون خلفاء سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ خلیفۂ رسول اللہ کے خطاب سے مخاطب ہوئے، اس کے بعد یہ سلسلہ اُس وقت سے آج تک بلا انقطاع قائم ہے، قرآن مجید کی وہ آیت پاک جو اس عبارت کی بنیاد ہے، یہ ہے،

وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصلحت خدا نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے، اور عمل

لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف	صالح کیے، (یعنی مسلمانوں) سے یہ وعدہ کیا
الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم	ہے، کہ وہ ان کو زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائیگا،
الذی ارتضٰی لھم ولیبدلنّھم من	جس طرح ان کو بنایا، جو ان سے پہلے تھے،
بعد خوفھم امنا یعبدوننی دلا	اور ان کے اس دین کو جس کو وہ ان کے لیے
یشرکون بی شیئا ومن کفر بعد	پسند کرچکا ہے، قائم و مستحکم کرے گا، اور خوف
ذالک فاولٰئک ھم الفاسقون۔	کے بعد ان کو امن بخشے گا، کہ وہ مجھے پوجیں
	اور میرا کسی کو شریک نہ بنائیں اور جو اس کے
(نور-۷)	بعد بھی کافر ہوں گے تو وہ بے شبہ مجرم ہوں گے،

ان آیاتِ پاک میں نہ صرف مسئلۂ خلافت کا سرسری ذکر ہے، بلکہ اس کی حقیقت اور اس کے تمام شرائط و مصالح بھی بتادیئے گئے ہیں، ان آیاتِ پاک میں پانچ الفاظ ہیں جن کی تشریح ہمارے مقاصد کی گرہ کشائی کردے گی۔

(۱) استخلاف (۲) الارض (۳) تمکینِ دین (۴) تبدیل امن من بعد الخوف (۵) عبادت الٰہی و عدم اشراک۔

استخلاف استخلاف کے معنی عربی زبان میں خلیفہ بنانے اور حکمراں بنانے کے ہیں، یعنی اس ایک لفظ کے لغوی معنی کے اندر مادی و روحانی، دنیاوی دینی دونوں قسم کی سرداری و سیادت کے معنی داخل ہیں، علاوہ لغت کے ہم یہاں بطور نمونہ کے چند مستند مفسرین کی رائیں نقل کرتے ہیں، سب سے قدیم اور مستند مفسر امام ابن جریر طبری

کی تفسیر فرماتے ہیں،

لیورثہم اللہ ارض المشرکین من العرب والعجم فیجعلہم ملوک و ساستہا۔ (ج ۱۸ ص ۱۰۹)	اللہ تعالیٰ عرب و عجم کے غیر مسلم سے ملک لیکر مسلمانوں کو اس کا وارث بنائے گا، کہ وہ اس کے بادشاہ اور اس کے منتظم کار رہوں گے۔

علامہ بغوی کی مشہور تفسیر معالم میں ہے،

لیورثہم ارض الکفار من العرب والعجم فیجعلہم ملوکہا وساستہا وسکانہا۔	خدا مسلمانوں کو کفار کی زمین کا وارث کرے گا، تو ان کو اس کا بادشاہ، منتظم اور باشندہ بنائے گا،

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں۔

لیجعلنہم خلفاء متصرفین فی الارض تصرف الملوک فی ممالکہم۔	خدا مسلمانوں کو خلیفہ بنائے گا۔ جو زمین کا اسی طرح انتظام کریں گے، جس طرح بادشاہ اپنی سلطنت کا کرتے ہیں،

علامہ ابن کثیر جن کی تفسیر تمام تفسیروں میں مستند ترین تفسیر ہے، اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں،

ھذا وعد من اللہ تعالیٰ لرسولہ صلی اللہ علیہ وسلم بانہ سیجعل امتہ خلفاء الارض، ای ائمۃ	خدا کا پیغمبر سے وعدہ ہے، کہ اس کے پیرون کو وہ زمین کا حکمراں، لوگوں کا امام و پیشوا اور اپنے امور کا منتظم و مدبر بنائے گا،

الناس والولاة علیھم وبھم تصلح — اور انہی سے ملکوں کی حالت درست ہوگی،

البلاد وتخضع لھم العباد — اور لوگ ان کی اطاعت کریں گے۔

ان تفسیروں کے علاوہ دیگر کتب تفسیر میں استخلاف کے یہی معنی لکھے ہیں، اس تفسیر سے جس پر تمام مسلمان علماء اور ائمہ کا اتفاق ہے، یہ واضح ہو گیا ہوگا، کہ خلیفہ دینی و دنیادی، مادی و روحانی دونوں قوتوں کا بیک وقت رئیس و سردار ہے، کوئی روحانی خلیفہ و امام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک وہ مادی و دنیاوی طاقت کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا ہو،

الارض | دوسرا لفظ الارض کا ہے، ارض کے لغوی معنی مطلق زمین و ملک کے ہیں، لیکن یہاں ارض پر الف لام کسی خاص چیز کو بتاتا ہے، اور وہ وہ سرزمین ہے جس کو مسلمان روزِ ازل سے مقدس جانتے ہیں، اور جس کو تورات نے "زمین مقدس" کا خطاب دیا ہے، اور جو ابراہیمؑ کی اولاد کو بطور وراثت عطا کی گئی تھی، یہود اس مقدس زمین کو صرف فلسطین میں محدود سمجھتے ہیں، کہ وہ ان کا اصلی وطن تھا، لیکن اسلام اس احاطہ میں اُس تمام سرزمین کو گھرا ہوا تسلیم کرتا ہے، جو اب تک اولاد ابراہیم کی بے شمار تعداد سے آباد ہے، اور جو ہمیشہ سے پیغمبروں کا مسکن رہا ہے، یعنی وہ سرزمین جس کو دجلہ و فرات، بحر شام، بحر احمر، بحر ہند اور خلیج فارس چاروں طرف سے محیط ہے، جس میں عراق و شام و عرب واقع ہیں، چونکہ یہ قطعۂ ارض چاروں طرف سے پانیوں سے گھرا ہوا ہے، اس لیے اس کو پیغمبر اسلام نے جزیرۃ العرب

کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور حکم دیا ہے کہ اس قطعۂ زمین کو ہمیشہ غیر مسلم دست اندازی سے محفوظ رکھا جائے، تاکہ اسلام کی خالص زندگی ہمیشہ قائم رہے،

الغرض ارضِ خلافت کا قلب و دماغ یہی قطعۂ ارضی ہے، اور اس کی وسعت اطرافِ ملک میں حالات کے مطابق گھٹتی اور بڑھتی رہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھی، خلیفۂ اول کے عہد میں شام و عراق کے حدود تک پہنچ گئی: خلیفۂ ثانی نے اس کو ایک طرف مصر اور دوسری طرف ایران کی سرحد سے ملا دیا، خلیفۂ ثالث کے زمانہ میں ارضِ خلافت افریقہ اور ترکستان تک وسعت پذیر ہو گئی، خلیفۂ چہارم کے عہدِ خلافت میں مملکت اسلامی دو حصوں میں منقسم ہو گئی، عرب، عراق اور عجم حضرت علیؓ کے ہاتھ میں رہے، اور شام مصر و افریقہ امیر معاویہؓ کے قبضہ میں چلے گئے، حضرت علیؓ کی وفات کے بعد جب مسلمانوں نے امیر معاویہؓ کو خلیفہ تسلیم کیا، اور اس کے بعد بنو امیہ کے آخری زمانہ تک یعنی ۱۳۲ھ تک ارضِ خلافت اسپین سے سندھ تک، یورپ، ایشیا، افریقہ تین براعظموں میں پھیلی رہی، بنو عباسیہ جب مدعیٔ خلافت ہوئے، تو ان کی حدودِ خلافت دوسری طرف مصر سے آگے افریقہ و یورپ تک نہ پھیل سکیں۔

بغداد میں خلافتِ عباسیہ کی تباہی کے بعد مصر میں جب خلافتِ عباسیہ منتقل ہوئی، تو اس کی وسعت ملکی صرف مصر و شام و عرب تک محدود رہ گئی، ...ھ میں جب خاندانِ عثمانی میں خلافت منتقل ہوئی، تو اس کی وسعت نے پھر یورپ و افریقہ و ایشیا

تینوں براعظموں کو گھیر لیا،

اس تفصیل سے یہ واضح ہوگا کہ ارضِ مقدس ہر زمانہ میں خلافت کا اصلی جزو اور دیگر ممالک خلیفۂ وقت کے جائے وقوع و جائے حکومت اور فوجی طاقت کے مطابق اس میں شامل رہے ہیں، مگر بہرحال از روئے اصول اس کی وسعت ارضی ہر زمانہ میں اس قدر رہنی چاہیے، کہ وہ اس زمانہ کی گرد و پیش کی غیر مسلم سلطنتوں کے مقابلہ میں اپنی بقا و زندگی کی حفاظت کر سکے،

اس تشریح کے بعد لفظ الارض کے متعلق مستند مفسرین کی شہادتوں کو سننا چاہیے،

علامہ ابن کثیر جو از روئے صحت روایت مستند ترین مفسر ہیں ان کا بیان ہے،

هذا وعد من الله تعالى لرسوله صلى الله عليه وسلم بانه سيجعل امته خلفاء الارض...... وقد فعله ...... فانه صلى الله عليه وسلم لم يمت حتى فتح الله عليه مكة و خيبر والبحرين وسائر جزيرة العرب وارض اليمن بكمالها واخذ الجزية من مجوس هجر ومن بعض	خدا نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ایک وعدہ کیا تھا، کہ وہ ان کے پیروؤں کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ خدا نے یہ وعدہ پورا کیا، چنانچہ آپ نے اس وقت تک وفات نہیں پائی جب تک مکہ، خیبر اور تمام عرب اور یمن آپ کی ماتحتی میں نہ آگیا، اور ہجر (بحرین) کے مجوسیوں سے اور شام کے چند مقامات سے جزیہ نہ لے لیا، اور قیصر روم اور مصر

اطراف الشام دھاداہ ھرقل ملک الروم وصاحب واسکندریہ کے سلاطین اور عمان کے امراء مصر واسکندریہ وملوک عمان والنجاشی ملک الحبشۃ۔ اور نجاشی شاہ حبشہ نے آپ کو ہدیہ دیا۔

علامہ زمخشری نے جو ازروئے ادب و زبان بہترین مفسرین تسلیم کیے گئے ہیں، لکھتے ہیں۔

"خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا، اور مسلمانوں کو پہلے جزیرۃ العرب کا مالک بنایا اور اس کے بعد مشرقی و مغربی ممالک کو انھوں نے فتح کیا"

غرائب القرآن میں جو قرآن کا مستند لغت ہے مذکور ہے،

۔ چنانچہ خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا، اور ان کو جزیرۃ العرب کا مالک اور کسریٰ کی مملکت و خزانہ کا وارث بنایا،

ابن الاعرابی کا بیان ہے، کہ

الارض کے معنی ملک عرب اور اس کے سوا اور ممالک بھی مراد ہیں،

الغرض ان تمام تصریحات سے واضح ہوگا، کہ خلافت کی ارض موعودہ کے اندر جزیرۃ العرب تو بمنزلۂ اصل کے ہے، اور اس کے علاوہ دیگر ممالک بھی اس کے اندر داخل ہیں،

تمکین دین | یہ لفظ جس آیت پاک میں واقع ہے، وہ حسب ذیل ہے،

ولیمکنن لہم دینہم الذی ارتضیٰ لہم۔ (اور خلافت دے کر) ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے، قوت واستحکام

دے گا۔

آیاتِ استخلاف کے اس ٹکڑہ سے یہ واضح ہوگا، کہ اس خلافت الٰہی کا مقصد یہ ہے، کہ مسلمانوں کا وہ دین جس کو خدا نے ان کے لیے پسند کیا ہے، یعنی اسلام اس کو دنیا میں قوت و استحکام بخشا جائے، کہ ظالموں اور ستم گروں کی زبردستی کے حملوں سے وہ دین اور اس کے ماننے والے ہمیشہ محفوظ رہیں، اور بخت نصر، نیرو اور چنگیز کے ظہور ثانی کا اسلام کو خطرہ نہ رہے،

مفسرین کی رائیں اس کے متعلق آگے آتی ہیں،

تبدیل امن من بعد الخوف | اسلام جب عرب میں ظہور پذیر ہوا، تو دعوتِ حق کے جواب میں اس کو ہر طرف سے تیغ و خنجر اور تیر و تبر کے زخم کھانے پڑے، ۱۳ برس کی مدت انہی ظلم و ستم کی پر درد داستانوں سے مملو ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خلافت الٰہی کی بنیاد ڈالنے کا حکم عنایت فرمایا، اور اس کا مقصد یہ قرار دیا کہ دنیا میں اسلام کے لیے امن و سلامتی قائم ہو، اس بنا پر اس آیت استخلاف کے ان الفاظ سے

ولیبدلنہم من بعد الخوف امنا — اور (اس خلافت کے ذریعہ سے) مسلمانوں کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

یہ واضح ہوتا ہے، کہ خلافت کے وجود کا دوسرا مقصد یہ ہے، کہ اس کی قوت کے زیرِ سایہ مسلمان امن و سلامتی کے ساتھ رہ سکیں، اس تفسیر کی تائید میں

حسبِ ذیل بیان نقل کرتا ہوں، جو تمام مفسروں کی متحدہ عبارت ہے،

- اس سے یہ مقصود ہے کہ اسلام کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہو، مسلمان مدینہ میں مجبور کیے گئے تھے، کہ وہ ہمیشہ اپنی حفاظت کے لیے مسلح رہیں،
- وہ آخر اس طرز زندگی سے تھک گئے اور پیغمبر سے آکر ملتجی ہوئے
- تو خدا نے وعدہ کیا، کہ وہ ان کو خلافت بخشے گا، جس سے وہ امن و امان میں رہیں گے،

ایشیا و یورپ و افریقہ کی گذشتہ و موجودہ تاریخ گواہ ہے، کہ یہ خطرہ اب بھی دنیا میں اسی طرح قائم ہے جس طرح آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر تھا، اسپین، سسلی، کریٹ، مالٹا، ہرزیگونا، بوسینا، یونان، سرویا، بلگیریا، مقدونیا، سمرنا، ارض روم، آرمینیا، وغیرہ کے واقعات کیا محتاجِ بیان ہیں،

عبادت الٰہی و عدم اشتراک خدا ارشاد فرماتا ہے، کہ اس خلافت کا، اس استحکام دین کا، اس امن و امان کا مقصد کیا ہے، مقصد یہ ہے، کہ

یعبدوننی ولا یشرکون بی شیئاً　　مجھکو پوجیں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے، کہ مسلمان ایک خاص پیغامِ الٰہی لے کر دنیا میں بھیجے گئے ہیں، ان کے خاص عقائد ہیں، ان کے خاص عبادات ہیں، ان کے خاص علوم و فنون ہیں، ان کا ایک خاص تمدن اور ایک خاص اصولِ زندگی ہے، خلافت کی مادی طاقت کا اصول اسی مصلحت پر مبنی ہے، کہ مسلمان اپنی

مخصوص روحانی زندگی اور مخصوص مادی تمدن کو دنیا میں قائم اور باقی رکھ سکیں،
دنیا کی گذشتہ تاریخ جس طرح مظالم اور ستم آرائیوں سے مملو رہی ہے، مستقبل
کی تاریخ کے لیے کون ضمانت کر سکتا ہے، وہ ایسی ہی یا اس سے بدتر نہ ہوگی،
اسی لیے دنیا کی وسیع مملکت میں انسانوں کی ایک خاص جماعت یعنی مسلمان اپنی
بقا اور زندگی کے لیے عقیدۃً مجبور ہے، کہ وہ دیگر برادرانِ انسانی سے اپنے لیے
ایک سایۂ امن کے طلب گار ہوں، اور یہی خلافت ہے، جو آغاز اسلام سے ابتک
دنیائے اسلام میں قائم رہی ہے، اور خدا کا وعدہ ہے، کہ وہ آئندہ بھی قائم رہیگی،
حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں،

فالصحابة رضی اللہ عنهم لما کانوا
اقوم الناس بعد النبی صلی اللہ
علیه وسلم باوامر اللہ عزوجل
واطوعهم للہ وکان نصرهم بحسبهم
واظهروا کلمة اللہ فی المشارق
والمغارب وایدهم تائیداً عظیماً
وحکموا فی سائر العباد والبلاد ولما
قصر الناس بعدهم فی بعض الاوامر
نقص ظهورهم بحسبهم ولکن قد

صحابۂ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
بعد احکامِ الٰہی کے سب سے زیادہ پیرو تھے،
اور نصرتِ الٰہی بقدر اطاعتِ الٰہی ہے، اور
انھوں نے خدا کے کلمہ کو مشرق اور مغرب میں
غالب و نمایاں کیا، اور خدا نے ان کی پوری
تائید کی، انھوں نے قوموں اور ملکوں پر
حکومت کی، پھر جب لوگوں نے صحابہ کے
بعد بعض احکامِ الٰہی میں کمی کی، تو ان کی ترقی
بھی ان کے عدم اطاعت کے بقدر کم ہوگئی،

ثبت فی الصحیحین من غیر وجہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لا تزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق لا یضرہم من خذلہم ولا من خالفہم الی یوم القیامۃ وفی روایۃ حتی یاتی امر اللہ وہم کذلک وفی روایۃ حتی یقاتلون الدجال وفی روایۃ حتی ینزل عیسی بن مریم وہم ظاہرون وکل ہذہ الروایات صحیحۃ ولا تعارض بینہما۔

لیکن صحیحین میں یہ روایت متعدد طریقوں سے ثابت ہے، کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک نہ ایک گروہ قیامت تک حق پر غالب رہے گا، اور اس کو کسی کا ترک نصرت اور مخالفت نقصان نہیں پہنچائے گی، ایک روایت میں ہے، کہ اس وقت تک غالب رہے گا، جب تک خدا کا حکم آجائے (یعنی قیامت) اور اس وقت تک وہ اسی طرح غالب رہے گا، دوسری روایت میں ہے، کہ جب تک دجال سے وہ قتال نہ کرلیں گے، ایک اور روایت میں ہے، کہ جب تک عیسٰی بن مریم نازل ہوں، وہ غالب رہیں گے، یہ تمام روایتیں صحیح ہیں، اور ان میں باہم کوئی تعارض نہیں۔

(معارف اکتوبر ۱۹۲۰ء)

قرآن پاک کا تاریخی اعجاز

دنیا کے ہر پیغمبر نے اپنی امت کے سامنے حیرت انگیز معجزے پیش کیے ہیں، حضرت نوحؑ کی دعا نے عالم کو غرقاب کر دیا، حضرت شعیبؑ اور حضرت لوطؑ کی دعاؤں نے آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں سے آگ برسائی، حضرت موسیٰؑ کے معجزہ نے فرعون کو بحر احمر کا طعمہ بنا دیا، عصائے موسیٰؑ کی کارفرمائی نے چٹانوں کی چھاتی سے پانی کا دودھ بہایا، اور بحر احمر کے دو ٹکڑے کر دیئے، دمِ عیسیٰؑ نے جنم کے اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو چنگا کیا، فرشِ موت کے سونے والوں کو جگایا، اور قبر کے مردوں کو باذن اللہ کہہ کر جلایا،

یہ واقعات دنیا میں پیش آئے، اور ختم ہو گئے، برق کا شرارہ تھا، جو دم کے دم میں چمکا، اور بجھ گیا، لیکن ایک پیغمبر ایسا بھی آیا، جس کے حیرت انگیز معجزہ نے قوموں کو ہلاک کرنے کے بجائے ان کو حیاتِ تازہ بخشی، پتھر دلوں کو موم، عقل کے اندھوں کو بینا، اور بنی آدم کی جمعیت کو غفلت و بے ہوشی کی نیند سے جگا کر ہشیار اور کفر و شرک کی ہلاکت سے بچا کر زندہ کیا، یہ حیرت انگیز واقعہ بجلی کی چمک کی طرح دفعتہً ظاہر ہو کر غائب نہیں ہو گیا، یہ یدِ بیضا، عصائے موسیٰؑ اور دمِ عیسیٰؑ کی طرح

اپنے امکان اور وقوع میں فلسفیانہ موشگافیوں اور عقلی نکتہ سنجیوں کا محتاج نہیں، یہ بروز روشن کی طرح واقعہ کی صورت میں ظاہر ہوا، اور ہزار سال تک مسند و متواتر واقعیت بن کر، دنیا اور اہل دنیا کے سامنے جلوہ گر رہا،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری دین اور آخری صحیفہ لے کر، اور نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ بن کر، اس دنیا میں تشریف لائے، آپؐ کے بعد نہ کوئی نیا دین آنے والا، نہ کوئی نئی کتاب اترنے والی، اور نہ کوئی نئی نبوت مبعوث ہونے والی تھی، اس لیے ضرورت تھی، کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح آپؐ کا خاص معجزہ وقتی اور عارضی نہ ہو، بلکہ جب تک اس دنیا میں آپؐ کی نبوت کا نور چمکتا رہے، اس کی روشنی بھی قائم رہے، چنانچہ وقتی اور عارضی معجزوں کے علاوہ آپؐ کو ایک ایسا خاص معجزہ بخشا گیا، جو قیام قیامت تک قائم اور باقی رہنے والا ہے، قرآن نے تحدی کی، کہ میں اپنے رسول و پیغمبر کی صداقت کی گواہی ہوں، جن و انس مل کر بھی چاہیں تو مجھ جیسی کتاب بلکہ مجھ جیسی کتاب کی ایک سورہ بلکہ ایک آیت بھی بنا کر پیش نہیں کر سکتے، اس اعلان پر پوری چودہ صدیاں گذر چکی ہیں، مگر اب تک فضائے بسیط کے ہر گوشہ میں اس کے جواب میں خاموشی چھائی ہے،

یہاں بھی عقل و فلسفہ کی منطقیانہ نکتہ آرائیوں سے بچ کر، تاریخ کے آئینہ میں واقعیت کا چہرہ دیکھیں، قرآن پاک دنیا کی سب سے تاریک سرزمین میں، سب سے جاہل قوم پر اترا، جو علم و تمدن سے عاری، دولت و ثروت سے خالی، سامان و اسلحہ سے

محروم اور ہر قسم کی دنیاوی اور مادی طاقت سے تہی مایہ تھی، قرآن نے تیرہ[۱۳] برس تک کبھی پہاڑوں کے غاروں سے اور کبھی پہاڑوں کی چٹانوں سے انسانیت کو آوازیں دیں، اس طویل مدت میں اس کی پکار کے جواب میں سب و شتم، سنگریزے اور پتھر، تیر و تبر اور تیغ و خنجر کی بارش ہوتی رہی، لیکن جونہی کہ چودھویں برس کا چاند طلوع ہوا، اس کی روشنی ماہ شب چہاردہم بن کر نمودار ہوئی اور چند سال کے عرصہ میں دیکھا تو عرب کا گوشہ گوشہ بقعۂ نور بن گیا،

قرآن کا سب سے بڑا تاریخی معجزہ یہ ہے کہ ۲۳ برس کی تعلیم میں ایک ان پڑھ اور جاہل قوم کو عالم ترین اور متمدن ترین قوم بنا دیا جس کی عظمت نے دنیائے قدیم کے دونوں بازو قیصر و کسریٰ کو توڑ دیا، چالیس برس کی مدت میں جب خلافت راشدہ کا دور ختم ہوا، قرآن کے ماننے والوں نے جو بحر ہند کے دہانہ سے لے کر بحر اٹلانٹک کے ساحل تک پھیلے ہوئے تھے، دنیا کی کایا پلٹ دی، تاریکی کی جگہ نور، جہالت کے بدلہ علم، شرک و کفر کے بجائے خدا پرستی آئی، دنیا کی سب سے غریب و مفلس قوم سب سے بڑی دولت مند اور سب سے نادان و جاہل و وحشی قوم سب سے بڑی عالم و علم پرور اور متمدن ہوگئی، دنیا کی سب سے ضعیف و کمزور قوم سب سے قوی اور سب پر غالب ہوگئی، وہ قوم جس کو دنیا میں کبھی سیاسی عزت و جاہ و جلال نصیب نہیں ہوا تھا، اس نے دنیا کی شہنشاہی کا تاج اپنے سر پر رکھا،

عرب و عجم، ترک و دیلم، حبش و زنگ، ہند و سندھ جس نے بھی قرآن کو اپنے سینہ

سے لگایا، اس نے فتح و ظفر کا پرچم ہاتھ میں لیا، تخت شاہی اپنے دونوں پانوں کے نیچے بچھایا، اور حکومت کا تاج اپنے فرق شاہی پر رکھا، عربوں کی کیا بساط تھی، دیلم کو کون جانتا تھا، سلجوق سے کون واقف تھا، غور و خلج و تغلق کس شمار میں تھے، کرد کس گنتی میں تھے؛ خوارزمشاہی، اتابکی اور مصر کے بحری ممالیک اور ہندوستان کے ترکی غلاموں کی حیثیت کیا تھی، اور مٹھی بھر آوارہ گرد ترک قبیلہ کا سردار عثمان خاں جس کی اولاد نے یورپ، ایشیا اور افریقہ دنیا کے تین براعظموں پر چھ سو برس تک حکومت کی، اسلام سے پہلے کیا تھا، مگر جب انھوں نے اپنی عقیدت کا سر قرآن کے آگے جھکایا، تو دنیا کی شہنشاہیوں نے ان کے آگے اپنی گردنیں جھکا دیں،

عربوں کا تمدن کیا تھا، افریقہ کے وحشیوں کا رتبہ کیا تھا، بربر کی بربریت کی داستانوں سے کون آگاہ نہ تھا، ترک و تاتار کی درندگی کے واقعات سے کس کے کان آشنا نہ تھے، مگر دیکھو کہ جب قرآن نے ان کے سر پر سایہ ڈالا، تو انہی کے ہاتھوں سے عظیم الشان سلطنتوں کی بنیادیں پڑیں، بڑے بڑے متمدن شہر آباد ہوئے، علوم و فنون کی درسگاہیں کھلیں، اور تمدن و تہذیب کے نقش و نگار اور آثار نمودار ہونے لگے، فلسفہ و عقل کی جلوہ آرائی ہوئی، علم و فن نے ترقی کی، بیسیوں نئے علوم اختراع ہوئے، پچھلے علوم نے رونق تازہ پائی، اور ان کی بری اور بحری تجارتوں نے دنیا کی منڈیوں پر قبضہ کر لیا،

ان سب سے ماوراء اور مادہ و مادیات سے ہٹ کر انسانی اخلاق و آداب نے

اسی قرآن کی تعلیم و ہدایت سے تکمیل کا درجہ پایا، عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کے سبق از بر ہونے، اور اہل جہاں کی آنکھوں کو وہ منظر دکھا دیا جس کو آغاز آفرینش سے آج تک انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، مغرب کی قوموں کو مشرق سے اور مشرق کی بستیوں کو مغرب سے ملا دیا، اور حسب و نسب، قومیت و وطن، پستی و بلندی، اور شاہی و گدائی کے ہر قسم کے نشیب و فراز کو مٹا کر قرآن والوں کو ایک برادری اور واحد قومیت پیدا کر دی، جس کا وطن دنیا کا ہر ملک اور جس کا مسکن دنیا کا ہر گوشہ تھا۔

باطل پرستی کے ہر طلسم کو توڑ دیا، بتوں کے ہیکل مسمار کر دیے، ستارہ پرستی کا چراغ گل کر دیا، انسانی جانوں کی قربانی موقوف کر دی، دختر کشی کی رسم کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا، عورتوں کو عزت، غلاموں کو آزادی اور غریبوں کو بشارت دی، اور نجات کے لیے صرف ایک ایمان اور عمل صالح کو ہر قسم کی ترقیوں اور سعادتوں کا زینہ بنایا، اور بتایا کہ انسانی سعادت کی شاہراہ غاروں، خلوتوں اور پہاڑوں سے ہو کر نہیں گذری ہے، بلکہ شہروں، بازاروں، مجمعوں، اور انسانی بھیڑ بھاڑ کے اندر سے گذری ہے، حق کی نصرت، انسانوں کی بھلائی، یتیموں کی سرپرستی، غریبوں کی امداد، گرتوں کی دستگیری، مظلوموں کی فریاد رسی اور غلاموں کی آزادی ہی نیکیوں کی جڑیں ہیں اور اس راہ میں ہر قسم کی جد و جہد، زحمت کشی و محنت اور ایثار و قربانی اصلی نفس کشی و ریاضت ہے،

اور سب کے آخر میں اور سب سے بڑھ کر اس نے مسلمانوں کو اللہ کے ایک آستانۂ قدس کے سوا دنیاوی قوت کے ہر آستانہ سے بے نیاز کر دیا، خدائے قادر کی قدرت کے سوا، ہر قدرت سے وہ بے نیاز اور ہر قوت سے وہ بے پروا ہو گئے۔ انھوں نے فرعونوں کو دریا میں ڈھکیل دیا، نمرودوں کے تخت الٹ دیئے، باہانیوں کی سلطنتیں چھین لیں، اور شدادیوں کی بہشت پر قبضہ کر لیا، اور یہ سب کچھ اس لیے وہ کر سکے، کہ انھوں نے ان سب جھمیلوں کے ساتھ ہر رشتۂ محبت کو توڑ کر صرف خدا سے اپنا رشتہ جوڑا تھا، ان کے ہر عمل کی غایت اللہ کی خوشنودی اور رضامندی تھی، تو اللہ بھی ان سے خوش ہوا، اور اپنی خوشنودی کا ہر خزانہ ان کے لیے کھول دیا،

قرآن نے اللہ والوں کی جماعت پیدا کی، جو اللہ ہی کے لیے کرتی اور چھوڑتی تھی، اللہ ہی کے لیے دیتی اور لیتی تھی، اور اسی کے لئے جیتی اور مرتی تھی،

مسلمانو! ربانی قوت کا یہ سرمایہ اب بھی تمہارے پاس ہے، اور اللہ کے اس خزانۂ رحمت کی کنجی اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے، ہمت کرو، اور ادب سے اس کے اوراق کو کھولو، اس کے معنوں کو سمجھو، اس کی باتوں پر یقین کرو، اور اس کے حکموں کو مانو اور عمل کرو، پھر دیکھو کہ تم کہاں سے کہاں پہنچتے ہو،

والسلام علی من اتبع الہدی

(معارف فروری ۱۹۲۹ء)

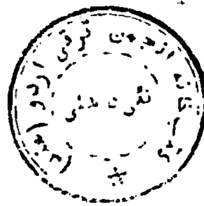
اسلام

دونوں جہان کی بادشاہی

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی، تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی بے خوف و خطر کی جا سکے، اور خدا کی بادشاہی دنیا میں قائم ہو،

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم ولیمکنن لہم دینہم الذی ارتضی لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً۔

خدا نے ان سے جو ایمان لائے، اور اچھے عمل کیے، یہ وعدہ کیا، کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا، جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا، جو ان سے پہلے تھے، اور ان کے لیے ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے، جما دے گا، اور ان کو ان کی اس بے امنی کے بدلہ امن دے گا، میری



(نور۔ ۷) بندگی کریں گے، تیرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے،

اور اس کے لیے خدا کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے، تاکہ سارا حکم اسی ایک کا ہو جائے۔

قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ ۔ (انفال۔ ۵)	اور ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فساد نہ رہے، اور سب اللہ کا حکم ہو جائے،

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے،

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار ۔ (بقرہ۔ ۲۵)	اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے، اور آخرت میں بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے، علم و عبادت، تندرستی، روزی، مال و دولت، فتح و نصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی خدا کے اطلاق کی تحدید ہے، دنیا کی بھلائی دنیا کی ہر وہ بھلائی ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا،

للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنۃ ولدار الآخرۃ خیر ولنعم دار المتقین ۔ (نحل۔ ۴)	اور جنھوں نے نیک کام کیے، ان کے لیے دنیا میں بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے، اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے،

مقصود یہ ہے کہ نکوکاروں کے لیے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے، اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے،

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ہے، ان کو بشارت ہے،

فاتٰهم الله ثواب الدنیا وحسن ثواب الآخرة والله یحب المحسنین (آل عمران - ۱۵)

تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا، اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت، اور حکومت و سلطنت ہے، جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا، اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، خدا نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں۔

والذین ھاجروا فی الله من بعد ما ظلموا لنبوئنھم فی الدنیا حسنة ولاجر الآخرة اکبر۔ (نحل - ۶)

اور جنھوں نے گھر چھوڑا اللہ کے لیے ستائے جانے کے بعد، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے،

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے،

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے، کہ ایمان اور نیکی والوں کو

گو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے، کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائدار ہے۔ اسی لیے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اولین مقصد نہیں، بلکہ ثانوی مقصد ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو، ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تو دنیا تو مل جائے گی، مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی۔

من کان یرید الحیوۃ الدنیا وزینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون اولئک الذین لیس لھم فی الاخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیھا وباطل ما کانوا یعملون (ہود - ۲)	جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہتا ہے، تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں، اور کمی نہیں کی جاتی، یہ وہ ہیں، جن کے لیے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں، اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا، اور ان کی کمائی اکارت گئی۔
من کان یرید حرث الآخرۃ نزد لہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نوتہ منھا ومالہ فی الآخرۃ من نصیب (شوریٰ - ۳)	جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہو، تو ہم اس کی کھیتی بڑھا دیتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو، تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں، اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں،
من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا	جو کوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو تو ہم جلد دیدیتے ہیں، جس کو جو چاہتے ہیں، پھر ہم نے

لہ جہنم یصلٰہا مذموما مدحورا ۔ اس کے لیے دوزخ کو بنایا ہے، وہ اس میں

ومن اراد الآخرۃ وسعیٰ لہا داخل ہوگا، برا ہوکر دھکیلا جاکر، اور

سعیہا وھو مومن فاولٰئک کان جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری

سعیہم مشکورا ۔ کوشش کی اور وہ ایمان والا ہو، تو ہم وہی

(بنی اسرائیل - ۲) ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی،

من کان یرید ثواب الدنیا　　تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے، (اس کو)

فعند اللہ ثواب الدنیا والآخرۃ　　معلوم ہو کہ اللہ کے پاس دنیا اور آخرت

(نساء - ۱۹)　　دونوں کا ثواب ہے۔

پھر وہ کتنا احمق ہے، جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ خدا کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں،

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے، وہ آخرت سے محروم ہے، لیکن جو آخرت کا طلبگار ہے، اس کے لیے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست داری ہے، یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے،

فقد آتینا آل ابراہیم الکتاب　　تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت

والحکمۃ وآتیناھم ملکا عظیما۔　　دی اور بڑی سلطنت بخشی۔

(نساء - ۸)

حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو کہتے ہیں،

یاقوم اذکروا نعمة اللّٰہ علیکم اذجعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکاً، (مائدہ - ۴)	اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو، جب تم میں نبی بنائے، اور تم کو بادشاہ بنایا،

یہ نعمت کسی کے دینے لینے سے نہیں ملتی، اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے،

اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء، (آل عمران - ۳)	اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے چھین لے،

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے، اس کے متعلق اس نے اپنا قاعدہ کلیہ بتادیا ہے،

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔ ان فی ھذا لبلاغاً لقوم عابدین۔ (انبیاء - ۷)	بے شک زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوتے ہیں، اس اعلان میں خدا کے فرماں بردار بندوں کے لیے پیام ہے۔

مسلمانوں کو جب اس نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی، تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے، فرمایا۔

ولینصرن اللّٰہ من ینصرہ ان اللّٰہ ... اور البتہ خدا اس کی مدد کرے گا، جو

لقوی عزیز الذین ان مکنّاھم	اس کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ زبردست
فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و	قوت والا ہے، وہ کہ ہم اگر ان کو زمین میں
اٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف	جمادیں، تو وہ نماز کھڑی کریں، زکوٰۃ
ونھوا عن المنکر وللّٰہ عاقبۃ	دیں، اچھے کاموں کو کرنے کو کہیں، اور
الامور۔	برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا
(حج - ۶)	انجام خدا کے اختیار میں ہے،

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا، اور برے کاموں سے روکے گا وہ پہلے خود اچھا ہوگا، اور برے کاموں سے باز رہتا ہوگا، خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں، کہ خدا کے دین حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں، خدا ان کی مدد فرماتا ہے، ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہیے چنانچہ اسلام میں سارے حدود اور تعزیرات اسی منشا کے مطابق ہیں، زنا کی حد میں فرمایا،

ولا تاخذکم بھما رافۃ فی	اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ
دین اللّٰہ ان کنتم تومنون باللّٰہ	کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آوے
والیوم الاٰخر۔ (نور - ۱)	اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو،

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اس کو اللہ اور رسول سے لڑائی

کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (بقرہ — ۳۸) | تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے خبردار ہو جاؤ،

اسی لیے نجران کے عیسائیوں سے آپ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا، اس کی ایک دفعہ یہ تھی، کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے، تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ (ابوداؤد باب اخذ الجزیہ)

(معارف ستمبر ۱۹۴۱ء)

جبر و قدر

قرآن مجید کے پہلے سیپارہ میں ارشاد خداوندی ہے، ختم اللّٰہ علیٰ قلوبھم الآیہ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کی، اور آنکھوں پر پردہ ہے، ان کے لیے عذاب عظیم ہے" اگر خدا ہی نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگائی ہے، اور اسی وجہ سے وہ گناہ کرتے ہیں تو ان کا کچھ قصور نہیں، یہ قصور خدا ہی کا ہے، ایسی حالت میں ان کو سکھ دکھ یا گناہ ثواب نہیں ہو سکتا ہے پھر خدا ان کو سزا و جزا کیوں دیتا ہے، کیونکہ انھوں نے گناہ یا ثواب خود مختاری سے نہیں کیا، یا اولاد سب کے یہاں ایک ہی طریقہ سے ہوتی ہے، مگر پیدا ہونے کے بعد کوئی گورا ہوتا ہے، کوئی کالا، کوئی امیر، کوئی غریب، کوئی اندھا، کوئی لولا، اس کی کیا وجہ ہے۔ (خان محمد صابر، خانقاہ ڈوگراں، شیخوپورہ، پنجاب)

ا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ارادہ اور نیت کی آزادی بخشی ہے، وہ اپنے اسی اختیار سے خیر یا شر کو اختیار کر کے ثواب یا عذاب کا مستحق ہوتا ہے، قرآن پاک میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر۔ (کہف - ۴) جو چاہے ایمان دار بنے اور جو چاہے کافر بنے

۲۔ انسان جس پہلو کو اپنے اختیار سے پسند کرتا ہے، اور اس کام کو کرتا ہے، تو بار بار کرنے سے وہ کام اس پر آسان ہو جاتا ہے، اور اس کا عادی ہو جاتا ہے، خواہ وہ شر ہو، خواہ خیر ہو، اگر خیر اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے تو اس کو توفیق اور ہدایت کہتے ہیں، اور اگر شر آسان ہو جاتا ہے، تو اس کو اضلال (گمراہی) اور خذلان (عدم توفیق) کہتے ہیں،

۳۔ ان دو باتوں کے سمجھ لینے کے بعد آپ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے مہر لگانے کو جو فرمایا ہے، وہ یہی عدم توفیق ہے، یہ عدم توفیق اور مہر لگانا نتیجہ ہے انسان کے اپنے فعل کا جس کو اس نے پہلے اختیار سے کیا، اس کا نتیجہ دل و دماغ پر مہر ہے، یعنی وہ اب احکام خداوندی اور نصائح سے مستفید ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھا۔

۴۔ اب جس آیت کو آپ نے پیش کیا ہے، اور بھی بہت سی آیتیں اس معنی کی قرآن میں ہیں، مگر ان سب آیتوں میں کفار اور فساق اور ان کے فعل بد اور اختیار شر کا ذکر پہلے ہے اور مہر یا اضلال اور عدم توفیق کا ذکر اس کے نتیجہ کے طور پر ہے، یعنی ان کا معلول اور نتیجہ ہے، لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ مہر خداوندی یہ علت ہے، اور بندہ کا اختیار شر معلول اور نتیجہ ہے،

۵- یہاں غور فرمائیں، اوپر یہ ہے،

ان الذین کفروا سوآءٌ علیھم	جن لوگوں نے کفر کیا، برابر ہے ان کے لیے
ءانذرتھم ام لم تنذرھم	چاہے ان کو تم ہشیار کرو یا نہ ہشیار کرو،
لا یومنون (بقرہ ۔ ۱)	وہ ایمان نہ لائیں گے۔

دیکھیے پہلے انھوں نے اپنے اختیار سے کفر کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق ان سے روک لی، اور پھر ان کے کفر پر اصرار اور بار بار عمل کرنے سے خیر کی توفیق ان سے سلب ہوگئی، اور شر کا کام آسان ہوگیا، یہی اللہ تعالیٰ کی مہر ہے، یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دل و دماغ پر پہلے مہر کردیا، اور اس کے سبب سے وہ کفر پر مجبور ہو گئے، بلکہ پہلے انھوں نے کفر کا کام کیا، اور جیسے وہ کام کرتے گئے، خیر کے راستے بند ہوتے چلے گئے، یہی وہ مہر ہے، اسی سورہ بقرہ میں دو رکوع کے بعد دوسری آیت ہے،

یضل بہ کثیراً و یھدی بہ کثیراً	اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعہ سے بہتوں کو گمراہ بناتا ہے، اور بہتوں کو راہ دکھاتا ہے
اس کے بعد ہی فوراً ہے،	
فما یضل بہ الا الفاسقین	اور اللہ تعالیٰ گمراہ نہیں کرتا، مگر ان کو جو اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں مانتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑتے ہیں،
(بقرہ ۔ ۳)	

یہاں بھی دیکھیے "الا الفاسقین" کا فسق و فجور سبب ہے، اور اللہ تعالیٰ

کی عدم توفیق جس کو گمراہی کہا ہے، اس کے نتیجہ کے طور پر پیچھے ہے،

ایک اور آیت میں ہے،

بل طبع اللّٰہ علیھا بکفرھم ۔　　یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب سے ان
(نساء-۲۲)　　(قلوب) پر مہر کر دی،

دوسری آیت اور ہے،

کذالک یطبع اللّٰہ علی کل قلب　　اسی طرح اللہ ہر مغرور ظالم کے
متکبر جبار (مومن-۴)　　دل پر مہر لگا دیتے ہیں،

یہاں بھی غرور اور ظلم اختیاری سبب ہے، اور مہر اس کا نتیجہ،
امید ہے کہ اب بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی، اور اعتراض رفع ہو کر تسکین پیدا ہو گئی ہوگی،

میں اس وقت بحالت سفر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں، اپنے مقام پر ہوتا تو تفصیل سے لکھتا، مولانا شبلی مرحوم کا ایک مضمون مقالات شبلی مذہبی جلد اول میں مسئلۂ قضا و قدر پر ہے، اس کو ضرور پڑھیں،

والسلام

(معارف ستمبر ۱۹۴۵ء)

سلسلۂ مقالات سلیمان

مقالاتِ سلیمان تاریخی

جلد اول

اس میں ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں سے متعلق حسب ذیل مضامین ہیں :۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی، خلافت اور ہندوستان، ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ۔ بدنصیب کشمیر اور عدل شاہجہانی نقش سنگی، لاہور کا ایک فلکی آلات ساز ۔ لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان ۔ مالسندو کی سیر، تاج محل اور لال قلعہ کے معمار ۔ استاد احمد معمار کے خاندان کی ایک اور یادگار ۔ ملا خیر اللہ مہندس کے چند نئے رسائل ۔ قنوج ۔ خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ ہند از منہ وسطی آل انڈیا ہسٹری کانگریس منعقد و مدراس دسمبر ۱۹۴۴ء وغیرہ

ضخامت :۔ ۴۴۲ صفحے

قیمت :۔ لعگر

مقالاتِ سلیمان علمی

جلد دوم

اس میں سید صاحبؒ کے حسب ذیل علمی و تحقیقی مضامین ہیں :۔

ہندوستان میں علم حدیث ۔ فرنگی محل اور علم حدیث، ہندوستان میں علم حدیث کی تاریخ کے گم شدہ اوراق، ہندوستان میں کتب حدیث کی نایابی کے بعض واقعات، رباعی، محمد بن عمر الواقدی، اور سیرت میں مستشرقین کی ایک نئی غلطی، پھر واقدی ۔ عرب و امریکہ، اسلامی رصد خانے، کتب خانۂ اسکندریہ ۔ مرزا بیدل کیا عظیم آبادی نہ تھے؟ حکیم سنائی کے سنین عمر، حجاز کے کتبخانے، سفر گجرات کی چند یادگاریں، انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ، کتب خانہ حمیدیہ بھوپال وغیرہ

ضخامت :۔ ۴۱۲

قیمت :۔ لعہ